ابتدائی کلام اقبال

بہ ترتیبِ مہ و سال

اِبتدائی کلامِ اقبال

بہ ترتیبِ مہ و سال

ڈاکٹر گیان چند
پروفیسر اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد

اردو ریسرچ سینٹر، حیدرآباد

سلسلۂ مطبوعات ۲ٹ
اُردو ریسرچ سینٹر حیدرآباد، آندھرا پردیش

ڈاکٹر گیان چند

IBTADAI KALAM-E-IQBAL
BA TARTEEB-E-MAH-O-SAL
BY
DR. GIAN CHAND

PRICE Rs 125.00

سالِ اشاعت ——— ۱۹۸۸ء
تعداد ——— ۵۰۰
قیمت ——— ایک سو پچّیس روپے
خوشنویس ——— محمد غالب
سرورق ——— نور الدین آزاد
مطبع ——— فوٹو آفسیٹ پرنٹرس بارہ دری
شیر افگن، بلّی ماران دہلی ۶
پبلشرز ——— اُردو ریسرچ سینٹر
۵-۸-۵۹۱ چادر گھاٹ ہائی اسکول لین،
عابد روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

تقسیم کار

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
گلی عزیز الدین وکیل۔ ڈاکٹر مرزا احمد علی مارگ، لال کنواں دہلی ۶

انتساب

میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس ایل ایل بی - پی - ایچ - ڈی (اُردو) ایڈووکیٹ کسی زمانے میں شاعری کرتے تھے - داغ کے شاگرد بارغ سنبھلی سے مشورہ کرتے تھے۔ ۱۹۳۰-۳۲ء کی بات ہے کہ علامہ اقبال کو اپنی ایک غزل بھیجی اور درخواست کی کہ انھیں شاگردی میں قبول کرلیں - علاّمہ نے غزل دیکھ کر لکھا کہ آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں - افسوس کہ اخیِ مکرم نے علاّمہ کا خط محفوظ نہیں رکھا - میں اس

کتاب کو علاّمہ اقبال کے اسی شاگردِ معنوی کے نام منسوب

کرتا ہوں

فہرست

مصنّف کی دوسری کتابیں

۱۔ اُردو کی نثری داستانیں۔ طبعِ اوّل ۱۹۵۴ء۔ طبعِ دوم ۱۹۶۹ء۔ طبعِ سوم ۱۹۸۷ء

۲۔ تحریریں۔ ۱۹۶۴ء

۳۔ اُردو مثنوی شمالی ہند میں طبع اول ۱۹۶۹ء۔ طبع دوم زیرِ اشاعت

۴۔ تفسیرِ غالب۔ ۱۹۷۲ء

۵۔ لسانی مطالعے۔ طبعِ اول ۱۹۷۳ء طبع دوم ۱۹۷۹ء۔ طبع سوم زیرِ اشاعت

۶۔ تجزیے۔ ۱۹۷۳ء

۷۔ رموزِ غالب ۱۹۷۶ء

۸۔ حقائق ۱۹۷۸ء

۹۔ ذکر و فکر۔ ۱۹۸۱ء

۱۰۔ عام لسانیات۔ ۱۹۸۵ء

زیرِ اشاعت

۱۱۔ ادبی اصناف۔ گجرات اُردو اکیڈمی احمد آباد

۱۲۔ تاریخِ ادب اُردو جلد اوّل ۱۷۰۰ء تک ترقیِ اُردو بیورو نئی دلّی۔ شریک مصنف ڈاکٹر سیّدہ جعفر

م	جہاں تک ہو سکے نیکی کرو		۱۳۸	
م	چاند اور شاعر		۱۳۹	۳۷۶
م	محنت		۱۴۱	
م	بچوں کے لیے چند نصیحتیں		۱۴۲	۳۷۶
	شمع و پروانہ	جنوری ۱۹۰۲ء	۱۴۳	۳۷۶
	خفتگانِ خاک سے استفسار	فروری ۱۹۰۲ء	۱۴۴	۳۷۷
م	خیر مقدم (لاٹ صاحب اور ڈائرکٹر تعلیم کے خیر مقدم کا قصیدہ)	۲۲ فروری ۱۹۰۲ء	۱۴۸	۳۷۸
م	دین و دنیا	۲۲ فروری ۱۹۰۲ء	۱۴۹	۳۷۹
م	اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو	۲۳ فروری ۱۹۰۲ء	۱۵۴	۳۸۱
م	غزل دل کی بستی عجیب بستی ہے	مارچ ۱۹۰۲ء	۱۶۰	۳۸۲
	عقل و دل	مئی ۱۹۰۲ء	۱۶۱	۳۸۳
	آفتابِ صبح	مئی ۱۹۰۲ء	۱۶۴	۳۸۴
م	غزل بلاکشانِ محبت کی یادگار ہوں میں		۱۶۶	۳۸۵
	صدائے درد	جون ۱۹۰۲ء	۱۶۷	۳۸۵
م	غزل ہے کلیجہ فگار ہونے کو	جون ۱۹۰۲ء	۱۷۰	۳۸۷
م	غزل ماتم پسر	جولائی ۱۹۰۲ء	۱۷۱	۳۸۷
	آفتاب (ترجمۂ گایتری)	اگست ۱۹۰۲ء	۱۷۲	۳۸۷
م	شکریۂ انگشتری	۱۹۰۲ء	۱۷۷	۳۸۸
م	غزل۔ عاشق دیدارِ محشر کا تمنائی ہوا	اکتوبر ۱۹۰۲ء	۱۷۹	۳۸۹
م	غزل۔ اس سرزمیں کا یارب ہر ذرہ طور کیوں ہے		۱۸۰	
	شمع	دسمبر ۱۹۰۲ء	۱۸۱	۳۸۹
	ایک آرزو	دسمبر ۱۹۰۲ء	۱۸۳	۳۹۱
	غزل گلزارِ ہست و بود نہ دیوانہ وار دیکھ		۱۸۵	

حرفِ اوّل

میں مفکّرِ اقبال کو اُردو کا سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔ لیکن مجھے اقبال کی تحقیق سے دل چسپی نہ تھی۔ اقبالیات نہ پہلے میرا میدان تھا نہ اب ہے۔ اقبال سے میری دل چسپی حیدر آباد کے کچھ اقبال پرستوں کی وجہ سے ہوی جو مجھ کو عزیز تھے۔ ان میں عبدالصّمد خاں تھے جن کا بے نظیر کتب خانہ اُردو ریسرچ سنٹر نوادر کا مخزن ہے۔ اب وہ کلکتہ چلے گئے ہیں۔ ان کے کتب خانے سے "کلامِ اقبال" نام کی ایک قلمی بیاض مرتّبہ محمّد انور خاں طالب علم جامعہ ملّیہ اسلامیہ علی گڑھ ۱۹۲۴ء ملی۔ اس میں اقبال کا منسوخ کلام بکثرت ہے۔ غیر مطبوعہ نئی نظمیں ہیں۔ اقبال اکیڈیمی حیدر آباد کے روحِ رواں مصلح الدّین سعدی تھے۔ انھوں نے اس پختہ عمری میں ہماری یونیورسٹی میں ایم۔اے اُردو میں داخلہ لے لیا گو مکمل نہ کر سکے۔ ایک اور شاگرد رحمت علی خاں تھے جو اب میرے شعبے میں لیکچرر ہیں۔

میں نے کلامِ اقبال کو دیکھ کر محسوس کیا کہ اقبال کا کلام اس طرح مرتّب کیا جانا چاہیے کہ اس میں متداول اور منسوخ دونوں قسم کی تخلیقات یک جا کر کے تاریخی ترتیب سے دی جائیں۔ نیز اختلافِ نسخ پیش کیے جائیں۔ مصلح الدین سعدی، عبدالصّمد خاں اور رحمت علی خاں نے اصرار کیا کہ میں یہ کام کروں۔ مجھے جن کتابوں کی ضرورت ہوگی انھیں یہ حضرات اقبال اکیڈیمی اور دوسرے کتب خانوں سے لاکر میرے گھر پر پہنچا دیں گے۔ خدا ایسے کرم فرما اور شاگرد سب کو دے۔

صمد خاں صاحب کے ذخیرے میں بیسویں صدی کے اوائل کے متعدد رسالے اور

اخبار تھے جن میں اقبال کا کلام شائع ہوا تھا میں نے کراچی میں مشفق خواجہ کو لکھا کہ میں اقبال کے کلام کو تاریخی ترتیب اور اختلاف متن کے ساتھ مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے لکھا کہ آپ کس پھیر میں پڑ گئے۔ اُردو میں جو شخص کچھ اور نہیں کرسکتا وہ اقبال کو لے بیٹھتا ہے۔ بہر حال آپ نے ابھی تک تدوینِ متن کا کوئی کام نہیں کیا، اس طرح یہ کمی پوری ہوجائے گی۔ انھوں نے مجھے اپنی مرتبہ اقبال از احمد دین اور باقیاتِ اقبال طبع سوم تحفۃً بھیج دیں۔ صمد صاحب نے مولوی عبدالرزاق حیدرآبادی کی مرتبہ نایاب "کلیاتِ اقبال" کی ایک جلد نیز بانگِ درا کا ایک نسخہ عنایت کیا۔

دوستوں کی مدد پر تکیہ کرکے میں نے یہ کام شروع کردیا اور کرتے کرتے جنوری ۱۹۰۷ء تک پہنچ گیا۔ ارادہ تھا کہ ۱۹۲۴ء تک کا کلام مرتب کروں گا لیکن اس بیچ ترقی اُردو بورڈ حکومتِ ہند نے اصرار کیا کہ میں "اُردو ادب کی تاریخ جلد اوّل ۱۷۰۰ تک" لکھ دوں۔ میں نے معذرت کی کہ میں آج کل اقبال کا کام کر رہا ہوں لیکن وہ نہ مانے۔ آخر میں نے اقبال کا کام روک کر ڈاکٹر سیدہ جعفر کی شرکت میں اس تاریخ کی پہلی جلد لکھی۔ بعد میں پھر اقبال کا کام ہاتھ میں لیا۔ اب حوصلہ کم زور پڑ چکا تھا۔ طے کیا کہ اقبال کی یورپ سے واپسی یعنی اگست ۱۹۰۸ء پر کام ختم کردوں۔ یہ بھی ہے کہ اس دور کے بعد اقبال کا منسوخ کلام بہت کم ہے۔

کام ختم کرکے اس کی صاف نقل کرلی تھی کہ جنوری ۱۹۸۶ء میں صمد صاحب نے ایک اور رجسٹر نما قلمی 'بیاضِ اقبال' لا کردی۔ انھوں نے اسے عماد الملک سید حسین بلگرامی کے ذخیرے سے خریدا تھا۔ اس میں منسوخ کلام بکثرت تھا۔ اس کی بنا پر حواشی اور اختلافِ نسخ میں کثرت سے اضافے کرنے پڑے۔ میں نے ان دونوں مخطوطوں کی تفصیل اپنے مضمون "کلامِ اقبال کے دو قلمی مجموعے" میں دی ہے۔ ان مخطوطوں کا تین چوتھائی حصہ بانگِ درا کی اشاعت سے قبل کا مکتوبہ ہے۔ آخری ایک چوتھائی بانگ درا سے منقول معلوم ہوتا ہے دونوں مخطوطے بیش بہا ہیں۔

میں نے ان مخطوطوں کے علاوہ باقیاتِ اقبال کی جملہ کتابیں بشمولِ روزگارِ فقیر حصۂ دوم سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اقبالیات کی کتابیں اور مضامین دیکھے ہیں۔ عبدالصمد خاں

کے ذخیرے میں مخزن، رسالۂ صوفی پنڈی بہاالدّین، ہفتہ وار وطن لاہور، اتّحاد، دلگداز، دکن ریویو وغیرہ کے بعض پرچوں سے استفادہ کیا۔ پھر بھی میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اصل مآخذ کو کم دیکھ پایا ہوں۔ معتبر مرتّبین نے جو مواد بہم پہنچایا ہے اس پر تکیہ کیا ہے۔ دراصل یہ کام لاہور میں بیٹھ کر کرنے کا تھا جہاں حضرت علّامہ کے مسوّدے محفوظ ہوں گے، انجمن حمایتِ الاسلام کی رودادیں نیز ہم عصر رسائل دستیاب ہوں گے، لیکن میرے لیے وہاں جانا ممکن نہ تھا۔

اس مجموعے میں محمّد انور خاں کے کلامِ اقبال سے لے کر دو نظمیں، عورت، اور قطرۂ اشک، نیز دو متفرق اشعار پہلی بار پیش کیے جا رہے ہیں۔ مجھے متعدّد نظموں کی تاریخ اشاعت نہ مل سکی۔ ان کے رنگ کو دیکھ کر تاثراتی طریقے پر ان کے زمانے کا اندازہ کیا ہے۔ علاّمہ کے مسوّدات تک رسائی ہوتی تو صحیح تر فیصلہ کر پاتا۔ اصل ماخذ بقدرِ بایست نہ دیکھنے کے سبب بہت ممکن، بلکہ یقینی ہے کہ اس تدوین میں غلطیاں در آگئی ہوں گی جو حضرات ان کی نشان دہی کریں گے میں ان کا ممنون رہوں گا۔

باقیات کے مجموعوں میں یہ دیکھ کر حیرت، بلکہ جھنجھلاہٹ ہوئی کہ مرتّبین نے اکثر صورتوں میں اپنے ماخذوں کا کوئی اتا پتا نہیں دیا۔ متعدّد صورتوں میں مخزن کے پرچوں، زمانہ یا کسی اور ماخذ کا حوالہ دیا ہے لیکن مرتّب نے وہ تخلیقات ان رسالوں سے نہیں، کسی اور ماخذ سے لی ہیں۔ باقیاتِ اقبال طبعِ سوم میں بعض نظمیں اور غزلیں ایسی ہیں جو اور کہیں نہیں ملتیں۔ نہیں بتایا گیا کہ یہ کہاں سے ملیں۔ ان کا ماخذ معلوم ہوتا تو دیکھ کر ان کی تاریخ کے بارے میں کچھ فیصلہ کیا جا سکتا۔ صفدر مرزا پوری نے نیچرل شاعری میں نہیں بتایا کہ وہ نئی نظمیں کہاں سے لی ہیں۔ اس کی عدم موجودگی میں کیوں کر طے کیا جائے کہ یہ واقعی اقبال ہی کی ہیں۔ بہرحال، مجھے انھیں کتابوں پر بھروسا کرنا پڑا ہے۔

میں نے اس تدوین میں نظم و غزل کو، نیز منسوخ اور متداول کلام کو ملا جلا کر پیش کیا ہے۔ مختلف متون کو اختلافِ نسخ کے جزو میں دیا ہے۔ تدوینِ متن کا قاعدہ ہے کہ حواشی پورا متن درج کرنے کے بعد دیے جاتے ہیں۔ میں نے اس کی خلاف ورزی کی ہے۔ واضح

کر دوں کہ میرا یہ کام عام قارئین سے زیادہ محققین کے لیے ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ہر تخلیق کے فوراً بعد ہی اس سے متعلق حواشی درج کر دیے جائیں تاکہ انھیں پڑھنے میں سہولت ہو بلکہ قاری انھیں پڑھنے پر مجبور ہو۔

مجھے اس کتاب کی اشاعت کے لیے ناشر کی تلاش تھی۔ میرے کرم فرما پروفیسر آلِ احمد سرور نے خواہش کی کہ اسے اقبال انسٹی ٹیوٹ سے شائع کرنے کی سبیل نکالی جائے۔ میں نے درخواست دے دی لیکن یونیورسٹیوں میں مالیہ آسانی سے نہیں مل پاتا۔ کالی داس گپتا رضا صاحب نے حامی بھر لی کہ وہ اسے شائع کر دیں گے لیکن ابھی کچھ سال بعد ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مشورے پر میں نے اس کتاب کا نقشہ اقبال اکادمی پاکستان کو بھیجا لیکن سب سے پہلے ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند، کے مصداق عبدالصمد خاں نے پیش کش کی کہ وہ اپنے صرفے سے اپنے اُردو ریسرچ سنٹر کی جانب سے شائع کر دیں گے۔ میں ان کی عنایت بے غایت کے لیے مشکور ہوں۔ اس کام کی ابتدا بھی انھیں کے کتب خانے سے ہوئی، اس کی تکمیل بھی ان کے ریسرچ سنٹر سے ہو رہی ہے۔ دوسرے حضرات کا شکریہ ذیل میں، نام بہ نام ادا کر رہا ہوں۔

۱۷ر ستمبر ۱۹۸۶ء — گیان چند

اعترافِ ممنونیت

۱۔ عبدالصمد خاں جنھوں نے کتابیں دیں، کتب خانے سے مواد دیا، عکس دیے اور استفسارات کا جواب دیتے رہے۔

۲۔ مشفق خواجہ صاحب جنھوں نے نیکی کر اور دریا میں ڈال کے مصداق احمد دین کی اقبال اور باقیاتِ اقبال طبع سوم خرید کر مجھے بھیجیں۔

۳۔ مصلح الدین سعدی اور رحمت علی خاں جنھوں نے اقبال اکیڈمی حیدرآباد سے مواد لا کر اور مجھے اکیڈمی میں لے جا کر جملہ سہولتیں فراہم کیں۔

۴۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار جو مجھ سے لامتناہی استفسارات کا

جواب فراہم کرتے رہے اور کئی رسالوں کے تراشوں کا عکس فراہم کیا۔
۵۔ ڈاکٹر اکبر حیدری جنھوں نے مجھے مفید معلومات اور بعض چیزوں کی نقل فراہم کی۔
۶۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد جو میرے سوالوں کا جواب دیتے رہے اور اپنی قابلِ قدر کتاب محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات کی دو کاپیاں دان دیں۔ میں نے دوسری کاپی اقبال اکیڈمی کو پیش کر دی۔
۷۔ اقبال اکیڈمی حیدر آباد کے عہدے دار جنھوں نے بڑے خلوص سے لائبریری میں میری مدد کی۔
۸۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی اور جناب کالی داس گپتا رضا جنھوں نے رسالوں سے اور دوسرے مآخذ سے معلومات فراہم کیں اور بعض چیزوں کی نقلیں فراہم کیں۔
۹۔ ڈاکٹر سید سلیمان حسین، لکھنو، جنھوں نے صفدر مرزا پوری کے مجموعے نیچرل شاعری سے ضروری معلومات فراہم کیں۔
۱۰۔ پروفیسر عبد القوی دسنوی جنھوں نے اپنے کالج کے کتب خانے سے سرودِ رفتہ کی جلد بھیجی اور اقبال پر اپنی دو کتابیں عنایت کیں۔
۱۱۔ ڈاکٹر سید حامد حسین، بھوپال جنھوں نے اقبال کی دو نظموں کے انگریزی مآخذ کا متن فراہم کیا۔
۱۲۔ اندرجیت لال، دہلی جنھوں نے سوامی رام تیرتھ سے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔
۱۳۔ میرے ایک اور شاگرد ڈاکٹر محمد انور الدین جنھوں نے کچھ مواد لاکر مجھے دیا۔
۱۴۔ ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر انور الدین جو کتابت کے انتظام میں مدد دے رہے ہیں۔

فہرستِ مخففات

اس کتاب میں مخففات کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ بعض کتابوں کو ان کے مرتبہ کے نام سے یا اسم کتاب کے ایک جزو سے ظاہر کیا ہے بہ تفصیلِ ذیل:

قلمی کلام یا کلام	=	قلمی کلامِ اقبال مرتبہ محمد انور خاں ۔ ۱۹۲۴ء
بیاض	=	بیاضِ اقبال قلمی جو ذخیرۂ عماد الملک سے لی گئی ہے۔
رزاق	=	کلیاتِ اقبال مرتبہ عبد الرزاق حیدر آباد ۱۹۲۴ء
احمد دین	=	اقبال از احمد دین مرتبہ مشفق خواجہ۔ کراچی ۱۹۷۹ء

باقیات	=	باقیاتِ اقبال مرتبۂ سید عبدالواحد معینی و عبداللہ قریشی۔ طبع سوم لاہور ۱۹۶۸ء
رفت	=	رفتِ سفر مرتّبہ محمد انور حارث، کراچی بار دوم نومبر ۱۹۷۷ء
سرود	=	سرودِ رفتہ مرتّبہ غلام رسول مہر و صادق علی دلاوری۔ لاہور ۱۹۵۹ء
تبرّکات	=	تبرّکاتِ اقبال مرتّبۂ محمد بشیر الحق دیسنوی۔ دہلی ۱۹۵۹ء
روزگار	=	روزگارِ فقیر جلد دوم مرتبۂ فقیر سید وحید الدین۔ کراچی بارِ دوم اگست ۱۹۶۵ء
نوادر	=	نوادرِ اقبال مرتّبہ عبدالغفار شکیل۔ علی گڑھ ۱۹۶۲ء
م	=	منسوخ
ص	=	صفحہ
ـــہ	=	نظم کے متن میں یہ نشان اختلافِ نسخ کے لیے حوالہ ہے
ســہ		نثری جملے میں یہ نشان فٹ نوٹ کے لیے حوالہ ہے۔
عــہ	=	نظم کے متن میں یہ نشان متن کے بعد حواشی کے لیے حوالہ ہے۔

حرفِ ثانی

اقبال کا منسوخ کلام، وسط ۱۹۰۸ء تک

ہر تخلیق کار خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنی تخلیقات میں اصلاح و ترمیم کا عمل جاری رکھتا ہے۔ اشاعت سے پہلے یہ مشق عام ہے۔ شاذ اشاعت کے بعد مختلف ایڈیشنوں میں بھی اس کے شواہد نظر آجاتے ہیں۔ اقبال کی شعری تخلیقات بیشتر صورتوں میں پہلے رسالوں میں شائع ہوئیں بعد میں انھیں مجموعوں میں مدوّن کیا گیا۔ رسالوں کی جو نظمیں اور غزلیں اصلاح سے نہیں سنور سکتی تھیں انھیں یک قلم مسترد کر دیا گیا۔ یہ عمل ۱۹۰۸ء تک زیادہ فعّال رہا چنانچہ اس دور تک کی نصف سے زیادہ تخلیقات کو متداول کلام کی بزم سے باہر رکھا گیا۔ اس طرح بانگِ درا اقبال کی تخلیقات کا پہلا حصہ نہیں بلکہ اس کے کلام کا پہلا انتخاب ہے۔ اُردو کے بڑے شعرا میں غالب اور اقبال ہی ایسے ہیں جنھوں نے اپنے کلام پر اس سختی سے نظر ڈالی کہ جتنا باقی رکھا تقریباً اسی قدر منسوخ کر دیا۔ اولادِ معنوی کو سپردِ عدم کرنا دل پر پتھر رکھ کر ہی ممکن ہے۔ اقبال نے کتنی جگرداری کے ساتھ یہ قربانی کی۔

جن تخلیقات کو بانگِ درا میں جگہ دی گئی ان کے نقشِ اوّل میں وسیع تبدیلیاں کیں کہا جاتا ہے کہ بانگِ درا کی اشاعت سے قبل اقبال اپنا کلام کسی بیاض میں یکج نہ رکھتے تھے۔ سیّد عبدالواحد معینی نے باقیاتِ اقبال طبع اول کے پیش لفظ میں یکم جنور ۱۹۵۲ء کو لکھا۔

"مدّتوں علامہ مرحوم کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی نظم لکھتے تو اس کو کسی رسالے می

اشاعت کے لیے بھجوا دیتے یا کسی دوست کو دے دیتے۔ جب علامہ کو اردو کلام کے پہلے کلیات کے شائع کرنے کا خیال آیا تو جو نظمیں دستیاب بآسانی ہو سکیں یا جو اُن کو یاد تھیں صرف وہی نظمیں اس میں شامل کر دی گئیں۔"

گویا منسوخ کلام محض اس وجہ سے حذف ہوا کہ بانگِ درا کی ترتیب کے وقت وہ ان کی نظر اور ذہن سے اوجھل تھا۔ یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ باقیاتِ اقبال کے بعد محذوفات کا دوسرا مجموعہ رختِ سفر ہے۔ اس کے مرتب محمد انور حارث کا دیباچہ ۱۵ر جنوری ۱۹۵۲ء کا ہے۔ انھوں نے حذف کی بہتر تاویل کی ہے۔

انھوں (اقبال) نے محسوس کیا کہ ان کے نظریۂ قومیت و وطنیت، سیاسی اغراض و مقاصد اور زاویہ ہائے فکر و نگاہ میں تجربات کی کشمکش اور حوادث کی آمیزش سے کچھ ایسا تغیر واقع ہوا تھا کہ جس کے پیشِ نظر سابقہ خیالات و احساسات کو تمام و کمال منظرِ عام پر لانا اقتضائے خلوص و نیک نیتی کے منافی تھا۔"[1]

اور اس سلسلے میں انھوں نے اشارہ کیا ہے کہ نیچرل اور قومی نظموں کو چھوڑ کر انھوں نے ملّت کی بیداری کی نظموں کو ترجیح دی۔

مولانا غلام رسول مہر نے سرودِ رفتہ (۱۹۵۹ء) کے مقدمے میں نظموں کے حذف کی اور بہتر تاویل کی ہے۔

۱۔ اقبال نے ان نظموں کو اوّلاً اس وجہ سے اپنے مستند مجموعۂ کلام میں شامل کرنا پسند نہ فرمایا کہ جس زمانے میں بانگِ درا مرتب ہوئی، شعر و سخن کے باب میں ان کا معیار بہت بلند ہو چکا تھا اور یہ نظمیں اس معیار پر پوری نہ اترتی تھیں۔ بندش اور اسلوبِ بیان کے سلسلے میں وہ بڑے ہی سخت تھے۔

۲۔ اقبال صرف انھیں نظموں کو محفوظ رکھنے پر رضامند تھے جو تعلیم و تربیت کے لحاظ سے کائناتِ انسانیت کے لیے مفید ہو سکتی تھیں یعنی جو ان کے خاص پیغام، خاص

---

[1] رختِ سفر طبع دوم نومبر ۱۹۷۷ء کراچی میں نقشِ اوّل کا پیش لفظ ص ت

تعلیم اور حقائقِ حیات کی حامل تھیں جن کے ذریعے سے انسان اپنے حقیقی وظائف و مقاصد بہتر طریق پر بجالانے کے اہل بن سکتے تھے۔ جو نظمیں موضوع، فکر و خیال اور ترتیب و ترکیب کے لحاظ سے اس میزان میں پوری نہ اترتی تھیں، انھیں محفوظ رکھنے کے لیے وہ تیار نہ تھے۔

مہر کی یہ دونوں تاویل درست ہیں۔ اقبال نے نہ صرف وہ نظمیں اور غزلیں حذف کیں جو معیارِ فن پر پوری نہیں اترتی تھیں بلکہ نظموں اور غزلوں کے وہ متفرق اشعار بھی حذف کر دیے جن پر زبان دفن کے اعتراضات کیے گئے تھے۔ دوسری وجہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ متعدد نظمیں اس لیے ترک کر دی گئیں کہ وہ ان کے بعد کے نظریات سے ہم آہنگ نہ تھیں۔

انھوں نے عطیہ فیضی کے نام ایک خط مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۱۱ء میں اپنے کلام کی اشاعت کے سلسلے میں لکھا۔

"میری سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ میں اشاعت کے لیے کون سی نظموں کا انتخاب کروں۔ گذشتہ پانچ چھ سال کے دوران میں نظمیں زیادہ تر پرائیوٹ نوعیت کی رہی ہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ پبلک کو ان کے پڑھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان میں سے بعض کو تو میں نے کلیتہً تلف کر دیا ہے اس ڈر سے کہ کہیں کوئی انھیں چرا کر نہ لے جائے اور شائع نہ کر دے۔"

اقبال کے منسوخ کلام کے مرتبین نے عموماً اور سرود رفتہ کے مرتب مولانا غلام رسول مہر نے خصوصاً یہ اعتذار جواز پیش کیا ہے کہ جس کلام کو شاعر نے قلم زد کر دیا اسے منظرِ عام پر کیوں لایا جائے۔ غالب کے منسوخ کلام کی اشاعت کے بعد کسی قسم کے جواز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہاں ناقدینِ اقبال پر اتنی تحدید لازم آتی ہے کہ وہ منسوخ کلام کی بنا پر شاعر پر کوئی اعتراض نہ کریں، اس سے بازپرس نہ کریں، اس کو سامنے رکھ کر اس کے پیغام کو دھندلا کر نہ دیکھیں۔

اقبال کے محذوف کلام میں نظمیں بھی ہیں، غزلیں بھی ہیں مکمل تخلیقات بھی حذف کی گئیں اور نظموں اور غزلوں کے اجزا بھی، جو ایک دو شعر سے لے کر تخلیق کے بیشتر حصے تک کے ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے دو باتیں صاف ہو جاتی ہیں۔

۱۔ کئی طویل نظمیں منسوخ کی گئیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شعوری انتخاب کی زد میں آئیں۔ ایسا بعض دوسری نظموں اور غزلوں کے ساتھ بھی ہوا ہوگا۔

۲۔ بعض محذوف نظمیں، اور نظموں سے بڑھ کر غزلیں، اتنی اچھی ہیں کہ انھیں حذف کرنے کی واحد وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ بانگِ درا کی تدوین کے وقت وہ شاعر کے ذہن و نظر سے اوجھل تھیں۔

بیشتر نظموں، غزلوں اور متفرق اشعار کے قلم انداز کرنے کی وجہ قیاس کی جا سکتی ہے لیکن متعدد دوسری صورتوں میں کوئی معقول توجیہ نہیں ہو سکتی۔ ذیل میں تنسیخ کے عمل کی وجوہ پر غور کیا جاتا ہے۔ چونکہ مضمون نگار فن کار کے درون میں نہیں جھانک سکتا، اس کے تخلیقی عمل کے ارتقا اور اس کی ترجیحات کا عرفان نہیں رکھتا اس لیے ضروری نہیں کہ اس کی توجیہ شاعر کے واقعی عندیے کو پیش کرتی ہو۔ دوسرے قارئین اور ناقدین ان کے حذف کی کوئی دوسری وجہ قیاس کر سکتے ہیں۔

انجمنِ کشمیری مسلمانانِ لاہور کا پہلا جلسہ فروری ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ اس میں اقبال نے ایک نظم فلاحِ قوم پڑھی جس میں خود کو کشمیری قوم سے وابستہ کیا۔ انھیں دنوں انجمن میں کشمیر سے متعلق دو قطعات پڑھے۔ بعد میں ان سب کو خارج کر دیا کیوں کہ ان سے علاقائیت کی بُو آتی تھی۔

نوجوانی کی دو نظموں میں جنسی رنگ ہے۔ ایک کا عنوان 'عیشِ جوانی' ہے۔ یہ صفدر مرزاپوری کے مجموعے "نیچرل شاعری" میں شامل ہے۔ مجموعے پر سنہ اشاعت نہیں دیا لیکن لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں یہ ۱۹۲۴ء میں خریدا گیا۔ نظم عیشِ جوانی میں وصل کا بیان نواب مرزا شوق کی مثنویات کی طرح عریاں ہے مثلاً:

ضدِ ہم آغوشی شوقِ نیم جامہ کو اِدھر ۔۔۔ اور اُدھر محوِ تغافل نازِ حسن پردہ دار

تامل ہوتا ہے ایسی نظم کو علامہ سے منسوب کرتے ہوئے لیکن در ایام جوانی چنانکہ افتد
دانی۔ یہ نظم ان کی حیات میں ایسے مجموعے میں شائع ہوئی جس میں ان کی چھ نظمیں ہیں
اس نظم کو نوادرِ اقبال اور باقیاتِ اقبال میں شامل کیا گیا۔
دوسری نظم "ہم نچوڑیں گے دامن" کشمیری گزٹ ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع
ہوئی۔ اس میں بھی جوشِ شباب بے قرار ہے۔ اس کا ایک مصرع یہ ہے۔

ع یہ قامت یہ عارض، یہ سینہ یہ جوبن

ظاہر ہے کہ ان نظموں کو تو نظری ہونا ہی تھا۔
متروکات میں نہایت طویل نظمیں وہ ہیں جو انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں
میں پڑھی گئیں اور بہت مقبول ہوئیں وہ یہ ہیں:
نالۂ یتیم، دردِ دل، یتیم کا خطاب ہلال عید سے، اسلامیہ کالج کا خطاب
پنجاب کے مسلمانوں کو۔ ابرِ گہربار یا فریادِ امت، جملہ ۵۰۳ اشعار
اقبال کی شاعرانہ عظمت اور شہرت کا پہلا سنگ میں ان کی نظم نالۂ یتیم ہے۔
کیا وجہ ہے کہ بعد میں وہ اسے آثارِ ماضی کے طور پر برقرار رکھنے کو بھی رضامند نہ ہوئے۔

غلام رسول مہر سرودِ رفتہ کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔
"انجمن حمایت الاسلام کی ابتدا چونکہ یتیم خانے کی بنیاد سے ہوئی تھی اس لیے یہ
موضوع اس کے سالانہ جلسوں میں شاعروں، واعظوں اور خطیبوں کے لیے بطور خاص مستحقِ
توجہ ہوگا۔" ص ۲۵۔

فنی اعتبار سے مجھے نالۂ یتیم میں کوئی سقم نہیں دکھائی دیتا۔ اس میں چستی اور پختگی
ہے۔ اس کے ترک کی وجہ اس کا موضوع ہو سکتا ہے۔ نظم کا منتہا کیا ہے؟ یتیموں کے لیے
چندہ مانگنا وہ بھی پیغمبرِ اسلام کی زبانی۔ آنحضرت کی زبان سے ایسے مصرعے کہلائے ہیں۔

ع۔ مِل کے اک دریا سخاوت کا بہانا چاہیے۔
ع کام بے دولت تہہِ چرخِ کہن چلتا نہیں
ع آبرو میری یتیمی کی تمھارے ہات ہے

غالباً بعد میں اقبال نے اس موضوع کو اپنے شایانِ شان نہ سمجھا اور نظم کو خارج کر دیا۔ یہی وجہ اس موضوع کی دوسری نظم کے حذف کی ہے۔ دردِ دل یا یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے منسوخ نظموں میں سب سے طویل ہے۔ شاعرانہ اعتبار سے یہ نالۂ یتیم سے کہیں بہتر ہے۔ جس طرح بیوہ کے مسئلے پر حالی کی نظم مناجاتِ بیوہ اُردو میں سرِفہرست ہے اسی طرح یتیم کے حالِ زار پر دردِ دل اُردو کی بہترین نظم ہے۔ اس میں صریحاً چندہ طلب نہیں کیا گیا۔ آخری بند میں اشارۃً قوم سے کہا گیا ہے۔

ہاتھ اے قوم! مہرباں ہے ترا ابر ہے کس کے گلستاں کے لیے

اس ترکیب بند کے کئی بند رسالوں میں الگ سے مکمل نظم کے طور پر شائع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ مصنف ہی نے بھیجے ہوں گے۔ وہ بند حسبِ ذیل ہیں:

ہلالِ عید	ع	اے مہِ عید ہے حجاب ہے تو
میں کیا ہوں	ع	ستم کوشِ باغباں ہوں میں
شام کی آمد	ع	مصرِ ہستی میں شام آتی ہے
مفلسی	ع	ہاتھ اے مفلسی صفا ہے ترا
دنیا	ع	بے چمن خار خار ہے دنیا

یہ نظمیں کلامِ اقبال کے کئی مجموعوں میں بھی ہیں۔ پوری نظم میں متعدد اشعار نہایت شاعرانہ ہیں بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ اقبال نے اس نظم کو کیوں عاق کر دیا۔ یتیم کے موضوع پر محجوب ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بھلا ہو محققین کا کہ انھوں نے اس نظم کو ڈھونڈھ نکالا۔

ترکیب بند 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو' میں گیارہ گیارہ اشعار کے نو بند ہیں۔ اس میں بھی چندے کا مطالبہ ہے:

ع میری دیواروں کو چھو جائے جو اکسیرِ عطا

ع ابرِ بن کر تم جو اس گلشن پہ گوہر بار ہو

ع دام تو سونے کا بنوا لے تو آ سکتا ہوں

لیکن یہ اس کا سب سے نمایاں پہلو نہیں۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ پنجاب کے مسلمانو! علم حاصل کر کے غرناطہ و بغداد کا سماں پیدا کر دو۔ شاید اقبال نے اس نظم کے بعض مصرعوں کو اپنے بعد کے مسلک کے خلاف پایا ہو۔

ع تیغ کے بھی دن کبھی تھے، اب قلم کا دور ہے

ع فکرِ دیں کے ساتھ رکھنا فکرِ دنیا بھی ضرور

اس نظم میں بار بار پنجاب کا ذکر آتا ہے۔ شاید اقبال نے خود کو پنجاب کی وکالت تک محدود نہ کرنا چاہا ہو۔ یہ نظم شاعرانہ اعتبار سے دردِ دل سے ہلکی رہتی ہے لیکن اس میں ملی جذبات پہلی دو نظموں سے زیادہ نمایاں ہیں۔

حمایتِ اسلام کے جلسوں میں پڑھی جانے والی آخری اہم محذوف نظم ابرِ گہربار یا فریادِ امت ہے۔ کہا گیا ہے کہ نظم عاشقانہ فریاد کے رنگ میں ہے۔ ایسا کہنا اس امر کا اعتراف ہے کہ اس میں نظم کا دروبست ہے ہی نہیں۔ ترکیب بند کے ۱۲ بندوں میں سے بیشتر غزل کی طرح ہیں جن کا ہر شعر معنوی اعتبار سے آزاد ہے اور جن کا موضوع عشقیہ اور متغزلانہ ہے۔ اس طویل نظم کا ایک بند 'دل' کے عنوان سے بانگِ درا میں محفوظ کر لیا گیا۔ اسے بھی ایک ٹیپ دار غزل سمجھنا چاہیے۔ اس نظم میں ایسے ایسے تغزل ریز اشعار ہیں:

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا — اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
کیا کہوں بے خودیِ شوق میں لذت کیا ہے — تو نے دیکھا نہیں، زاہد! کبھی غافل ہو کر
عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی توبہ — دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہو کر
عشق کی راہ میں اک سیر تھی ہر منزل پر — نجد کا دشت کہیں مصر کا بازار آیا
کوئی دیکھے تو ترے عاشقِ شیدا کا مزاج — حور سے کہتا ہے، چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو

نظم کے عشقیہ انداز کے علاوہ اس کی تنسیخ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں فریادِ امت کے معنی امت کے خلاف فریاد ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس میں واعظوں، دولت مندوں، رہنماؤں اور عام طور سے سبھی ابنائے قوم پر سخت تنقید ہے:

واعظوں میں یہ تکبر کہ الٰہی توبہ — اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں

قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے　　　یہ اگر راہ پہ آجائیں تو پھر کیا کہنا
فرقہ بندی سے کیا راہ نماؤں نے خراب　　　ہائے ان مالیوں نے باغ اجاڑا اپنا

اس نظم میں فرقہ بندی، تعصب اور خانہ جنگی کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے کیا یہ قوم مسلم کی اندرونی فرقہ بندی کا ذکر ہے یا ملک کی مختلف ملتوں کی فرقہ پرستی کا۔ چونکہ اس نظم کے آخری چند بندوں میں سبھی کی شکایت کی گئی ہے۔ شاید اسی لیے علامہ نے اسے خارج کرنا مناسب سمجھا۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ اس میں سے انتخاب کرکے چار پانچ غزلیں تیار کر لیتے۔

ابتدائی دور میں بعض نظمیں خصوصی موقعوں پر فرمائشی انداز میں لکھی گئیں۔ ان میں شعریت نہیں، محض نظم نگاری ہے۔ ان میں سے تین محذوف نظمیں نمایاں ہیں۔

۱۔ خدا حافظ ۔ منشی محبوب عالم کے سفر یورپ پر الوداعی نظم۔ ۲۵ مئی ۱۹۰۰ء
۲۔ پنجۂ فولاد ۱۹۰۱ء میں اس نام کے اخبار کے اجرا پر
۳۔ دین و دنیا ۔ ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء

۵۴ اشعار کی آخر الذکر نظم انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں پڑھی گئی۔ یہ ایسی ہلکی پھلکی غیر سنجیدہ طنزیہ نظم ہے جو اقبال کے شایانِ شان نہیں۔ اقبال کے پورے کلام میں یہی ایک نظم ہے جسے میں قلم زدنی سمجھتا ہوں۔ ایسی نظم کو انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسے میں نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔

انتخاب کی زد میں آنے والا ایک موضوع انگریز پرستی کی نظمیں ہیں۔ وہ یہ ہیں
۱۔ اشکِ خوں۔ ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا۔ دو تین دن کے اندر لاہور میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں اقبال نے ۱۱۰ اشعار کا مرثیہ اشکِ خوں کے نام پڑھا۔ مرثیہ کو مُردوں کی تعریف کہا گیا ہے۔ اس نظم میں بھی وکٹوریہ کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ وکٹوریہ بذات خود نیک خاتون تھیں لیکن برطانیہ کے آئین کے مطابق جو کچھ ان کے نام پر کیا جاتا تھا اس کی ذمے داری حکومت کی ہوتی تھی۔ وکٹوریہ کی حکومت کو سراہنا دراصل برطانوی حکومت کی داد دینا ہے۔ مرثیے میں اس قسم کے شعر ہیں:

اے ہند تیرے سر سے اُٹھا سایۂ خدا | اک غم گسار تیرے مکینوں کی تھی گئی
برطانیہ تو آج گلے مل کے ہم سے رو | سامانِ بحر ریزیِ طوفاں کیے ہوے

یہ اسی برطانیہ کی ملکہ کا عہد ہے جس کے دوران ۱۸۵۷ء کے مظالم ہوئے تھے۔ اس مرثیے کے سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر بجا طور پر لکھتے ہیں ،

"۱۹۰۱ء میں ملک کے سیاسی افکار و تصورات کا جو رنگ، جو انداز اور جو اسلوب تھا، اسے جانچنے کے لیے دس پندرہ سال بعد کا یا آج کا پیمانہ استعمال کرنا...... غیر مناسب ہوگا.......... اس زمانے میں ملک کی عام جماعتوں اور قوموں کا طریقِ فکر و نظر وہ نہ تھا جو بعد میں اختیار کر لیا گیا۔" (سرودِ رفتہ ص ۱۸۱)

۲ - خیر مقدم - انجمن حمایتِ اسلام کے ۱۹۰۲ء کے جلسے میں گورنر پنجاب اور انگریز ڈائرکٹر تعلیمات آئے تو اُن کی شان میں ایک مختصر قصیدہ پڑھا۔

وہ کون زیب دہِ تختِ صوبۂ پنجاب | کہ جس کے ہاتھ نے کی قصرِ عدل کی تعمیر
مگر حضور نے ہم پر کیا ہے وہ احسان | ....

دراصل اقبال کی اس عہد کی حکومت پرستی کی چند نظمیں وقت کا تقاضا تھیں۔ کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو وہ بھی لکھنے میں تامل نہ کرتا۔ اقبال نے لکھیں تو وہ موردِ الزام نہیں۔ انھوں نے انھیں مجموعے میں نہیں لیا، درست کیا۔ ہم نے باقیات میں ان کا احیا کیا - ہم نے بھی درست کیا۔

اقبال نے بعض نظموں یا متفرق شعروں میں اہلِ اقتدار کی مدح کی ہے۔ مذکورہ بالا نظمیں اسی نوعیت کی تھیں۔ نواب محمد بہاول خاں والیِ بہاولپور کی تخت نشینی پر ۱۹۰۳ء میں ایک قصیدہ لکھا۔ اس میں ۴۹ شعر ہیں۔ نواب کو یادگارِ عمِ پیغمبر کہا۔ وہ قومِ مسلم کی امّید گاہ تھے۔

آستانہ جس کا ہے اس قوم کی اُمّید گاہ | تھی کبھی جس قوم کے آگے جبیں گستر زمیں

لیکن اپنی تمام قوم نوازی کے باوجود نواب صاحب بانگِ درا میں جگہ نہ پا سکے۔

جون ۱۹۰۸ء میں انھوں نے عطیہ فیضی کی بہن بیگم آف جنجیرہ کے البم میں چار مدحیہ اشعار لکھے ہیں ع اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
عطیہ بیگم سے اُنسِ قلبی کے باوجود ان کی بہن کی توصیف کے اشعار ستر دکر دیے گئے۔
۱۹۰۵ء میں انھوں نے یورپ جاتے ہوئے ایک غزل لکھی جو دکن ریویو ستمبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوی اس میں ایک شعر تھا:

نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیوں کر پسند ان کو وزیرِ نظام کرتے ہیں

نومبر ۱۹۰۵ء میں یہی غزل ایک خط کے ساتھ اخبار "وطن" لاہور کے ایڈیٹر کو بھیجی تو اس میں سے یہ شعر حذف کر دیا۔ بانگِ درا میں بھی یہ غیر حاضر ہے۔ وزیرِ نظام سے مراد مہاراجہ سرکشن پرشاد ہیں۔

اقبال کا ذہنی ارتقا وطن پرستی سے ملت پرستی کی طرف کو ہوا۔ ان کے ابتدائی کلام میں قوم پرستی نیز مذہبی ہم آہنگی کے جو اشعار اتنے شدید تھے کہ ان کے بعد کے مسلک پر وار کرتے تھے انھیں خارج کر دیا گیا۔ دو چار مثالیں:

نظم ہمالہ کے ایک بند میں بودھ دھرم کی توصیف تھی۔

وہ اصولِ حق نمائے نفیِ ہستی کی صدا روح کو ملتی تھی جس سے لذتِ آبِ بقا

اگلے بند میں ایک مصرع تھا ع

تیرے ہر ذرّے میں ہے کوہِ المپس کی فضا

یونان میں کوہِ المپس دیوتاؤں مسکن مانا جاتا ہے اقبال نے ہندوستان کے ہر ذرّے کو دیوتاؤں کا مسکن قرار دیا۔ یہ دونوں بند منسوخ کر دیے۔

نظم صدائے درد کا درد ہندوستان کے مختلف فرقوں کے نفاق کی وجہ سے ہے۔ اس نظم کا وہ بند خارج کر دیا جس میں اس نفاق کی وجہ سے شاعر ہندوستان سے ہجرت کر کے وسط ایشیا چلا جانا چاہتا ہے۔ اس بند میں ایسے واشگاف اشعار بھی ہیں:

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

ظاہر ہے حکیم ملت اس قسم کے اشعار کیوں کر برقرار رکھ سکتے تھے۔ نظم 'ایک آرزو' سے بھی اس نوع کے اشعار مسترد کر دیے:

شمشاد گل کا بیری گل یاسمن کا دشمن　　ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے
اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر　　میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے

جنوری ۱۹۰۳ء میں نظم 'سید کی لوحِ تربت' شائع کی۔ اس وقت اقبال حب الوطنی سے اتنے سرشار تھے کہ سرسید کی زبانی ملت پرستی کی نہیں قومی ہم آہنگی کی تلقین کرائی۔ اس کے چند مصرعے یہ ہیں:

ع　دیکھ اپنوں میں نہ پیدا ہو کہیں بیگانگی
ع　گالیاں دینا کسی کو دین کی خدمت نہیں
ع　کیا مزا رکھتی ہے ابنائے وطن کی فکر بھی

از شراب حبِ ہم جنسانِ خود مستانہ باش　　شعلۂ شمع وطن را صورتِ پروانہ باش

اس آہنگ کے تمام اشعار قلم زد کر دیے گئے۔ انجمن حمایتِ اسلام میں ۱۹۰۴ء میں طویل نظم 'تصویرِ درد' پڑھی۔ اس میں بھی امتیازِ ملل سے متعلق کئی اشعار خارج کیے:

ہوائے امتیازِ ملتِ و آئیں کی موجوں نے　　غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں

تعصب نے مری خاکِ وطن میں گھر بنایا ہے　　وہ طوفاں ہوں کہ میں اس گھر کو ویراں کر کے چھوڑوں گا

اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی　　مسلمانوں کو آخر نامسلماں کر کے چھوڑوں گا

متداول نظم میں وطن پرستی کے اشعار اب بھی موجود ہیں لیکن جہاں امتیازِ ملل کے خلاف برملا کہا تھا اس پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔

'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' میں سے وہ بند خارج کر دیا جس میں بدھ مت، مسیحیت اور اسلام سب کو ایک صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

گوتم کا جو وطن ہے، جاپان کا حرم ہے　　عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے

مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے

نظم 'نیا شوالہ' میں تو ہندو دوستی سے آگے بڑھ کر ہندوئیت کا رنگ آگیا تھا۔ اس کے اشعار میں کہتے ہیں کہ سونے کی ایک مورتی بنا کر اسے ہر دوار دل میں بٹھا دیں۔ اس دیوتا سے من کی مرادیں مانگیں۔ گلے میں زنّار اور ہاتھ میں تسبیح ہو۔ اس صنم کے ماتھے پر ہندوستان لکھ دیں ..... وغیرہ گویا وطن پرستی کو بت پرستی بنا دیا ہے۔ نصف سے زیادہ اشعار پر مشتمل یہ پورے کا پورا جزو قلم زد کر دیا گیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی اپنے طویل مضمون 'اقبال اور نظریۂ وطنیت' میں کہتے ہیں:

"اس میں وطن کی پرستش کے لیے ہندو روایات اور ذخیرۂ الفاظ سے کام لیا گیا تھا۔ بعد میں اصل نظم سے کئی شعر حذف کر کے اسے بانگ درا میں شائع کیا گیا اور ہندوانہ فضا کو مختصر کر دیا گیا۔ دیوی دیوتاؤں کے تلازمات بھی کم کر دیے گئے[۱]"

روزگار فقیر جلد دوم ص ۳۱۸ - ۳۱۷ پر ایک بغیر عنوان کی چھ شعروں کی نظم ہے جو ظاہراً شیخ اعجاز کی بیاض سے نقل کی گئی ہے۔ معلوم نہیں یہ کبھی کسی رسالے میں شائع ہوئی کہ نہیں بعد میں باقیات اقبال طبع سوم میں اسے اس کے ابتدائی الفاظ کی بنا پر "نوع انساں کی محبت" کے عنوان سے چھاپا گیا۔ اس میں مذہب سے اُوپر اُٹھ کر پوری نوعِ انسان کی محبت کا درس دیا ہے:

نوعِ انساں کی محبت میں ہے مذہب کا کمال — امتیازِ کاسۂ شیخ و برہمن میں نہیں
خاک اگر ناپاک بھی چھونے سے ہو جائے تو کیا — پاک ہے جو چیز وہ آب و گلِ تن میں نہیں

افسوس کہ انسان دوستی کی اتنی ارفع نظم جو ملّت اور وطن سے بلند تر ہے ان کے بعد کے مسلک کی وجہ سے گردن زدنی کر دی گئی۔

۱۹۱۱ء میں انھوں نے عطیہ فیضی کو لکھا تھا کہ وہ پرائیوٹ نوعیت کی نظموں کو پبلک

---

[۱] ڈاکٹر وحید قریشی۔ اقبال اور نظریۂ وطنیت۔ مجلۂ تحقیق (فنون) پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ جلد پنجم شمارۂ اوّل و دوم جنوری و جولائی ۱۹۷۰ء۔ ص ۵۹۔

کے سامنے نہیں لانا چاہتے۔ ان کی مراد عشقیہ نظموں سے تھی لیکن کچھ اور بھی نظمیں ہیں جو ذاتی قسم کی تھیں محذوف کر دی گئیں مثلاً:

۱۹۰۲ء میں ان کے دوست منشی سراج الدین نے غالباً اہلیۂ اقبال کے لیے چار انگوٹھیاں بھیجی تھیں۔ شکریے میں نظم "شکریۂ انگشتری" بھیجی گئی جو مجموعے میں شامل نہیں کی گئی۔ ادبی اعتبار سے یہ تھی بھی ہلکی۔ مئی ۱۹۰۲ء میں ان کی نظم "خطِ منظوم" شائع ہوئی۔ یہ قادیانی جماعت کے پیغام بیعت کے جواب میں تھی۔ اس نظم میں صاف دو حصے ہیں جو دو لخت ہیں۔ بعد میں اقبال نے پہلے حصے کو یکسر قطع کر دیا اور دوسرے حصے کے بھی کئی اشعار منسوخ کر کے بقیہ کو "عقل و دل" کے عنوان سے بانگِ درا میں جگہ دی۔ جولائی ۱۹۰۲ء میں بارہ مولا کے خواجہ صمد کے بیٹے کے انتقال پر والد کی جانب سے مرثیہ لکھا۔ یہ بھی قلم زد ہوا۔ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد جولائی ۱۹۰۳ء میں بلوچستان میں ایم ای ایس میں ایس ڈی او تھے۔ وہ کسی فوجداری مقدمے میں ملوث ہو گئے۔ اقبال کے لیے یہ دوہرا ابتلا تھا۔ انھوں نے دوسری کوششوں کے ساتھ ساتھ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی جناب میں ایک منظوم درخواست "برگِ گل یا ایک درد مند دل کی عرض" کے عنوان سے لکھ کر بھیجی۔ اس میں بڑی رقت اور دل سوزی سے خواجہ کو جنابِ مدفونِ یثرب کی قسم دلائی تھی کہ مجھے اس مصیبت سے رہائی دلائیے۔ یہ نظم متداول کلام میں نہیں آئی۔ ولایت جاتے ہوئے وہ درگاہِ حضرت محبوب الٰہی پر گئے اور نظم "التجائے مسافر" پڑھی۔ بعد میں اس کے بہت سے اشعار محذوف ہوئے جن میں وہ بھی ہیں جن میں بھائی کی ابتلا میں خواجہ کی دست گیری کی طرف اشارہ تھا۔ یہ شعر بھی ساقط ہوا۔

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

قیامِ یورپ کے آخری دور میں انھوں نے کئی عشقیہ نظموں میں اپنی وارداتِ قلبی کو صفحۂ قرطاس پر اتارا۔ روزگارِ فقیر جلد دوم میں ص ۲۴۴ تا ۲۴۶ پر ایک نظم ہے — "پیش کش بہ ......" نام کی جگہ نقطے لگا دیے ہیں جیسے "...... کی گود میں بلی دیکھ کر" میں کیا تھا۔ یہ نظم اس زمرے کی اچھی نظموں میں سے ہے جسے اقبال نے پرائیویٹ نوعیت کی کہا تھا۔ یہ حذف کے قابل نہ تھی۔

روزگارِ فقیر میں بیاضِ اعجاز احمد سے لے کر جو منسوخ نظمیں اور غزلیں دی ہیں اُن کا اس سے پہلے کہیں پتا نہیں چلتا۔ غالباً وہ پہلے کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ ان میں ایک گروہ بچّوں کی حسبِ ذیل چھے نظموں کا ہے۔

جہاں تک ہو سکے نیکی کرو۔ چاند اور شاعر۔ محنت۔ بچّوں کے لیے چند نصیحتیں۔ گھوڑوں کی مجلس۔ شہد کی مکھی۔

یہ سب باقیاتِ اقبال طبع سوم میں لے لی گئی ہیں۔ اقبال نے انگریزی سے ماخود کرکے ایک نظم ایک گائے اور بکری، لکھی تھی۔ بالکل اسی مفہوم کی ان کی طبع زاد نظم "گھوڑوں کی مجلس" ہے۔ بقیہ پانچ نظمیں بچّوں کے لیے خالص ناصحانہ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کیوں منسوخ کیا گیا۔ ان میں بچّوں کے لیے چند نصیحتیں، نام کی نظم بطورِ خاص نہایت قابلِ قدر ہے۔

اب چند متفرق محذوف نظموں کو لیجیے۔ ان میں سے بشتر کا زمانہ معلوم نہیں۔ اُن کے فکر و فن کے معیار سے تاثراتی طور پر ان کے عہد کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ شمعِ ہستی۔ ابتدا ہے ع اے شمعِ ہستی! اے زندگانی

یہ شمع سیریز کی سب سے پرانی نظم ہے جو حیدر الدین سلیم کے رسالہ معارف علی گڑھ بابت ستمبر ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔ بعد میں یہ اقبال ریویو کراچی بابت جنوری ۱۹۶۵ء نیز انوارِ اقبال مؤلفہ بشیر احمد ڈار میں سامنے آتی ہے۔ اس کے حذف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

۲۔ شمعِ زندگانی۔ ع اے شمعِ زندگانی! کیوں جھلملا رہی ہے؟

۱۱ شعروں کی یہ نظم محض باقیاتِ اقبال طبع سوم میں دی ہے۔ اس کا ماخذ نہیں بتایا گیا۔ اس میں شاعر موت کے آگے گڑگڑا کر التجا کرتا ہے کہ مجھے دنیا میں چندے اور رہنے دے، ابھی میری حسرتیں پوری نہیں ہوئیں۔

یہ موضوع اقبال کے مسلک کے بالکل خلاف ہے، اس لیے اسے برقرار رکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

۳ گلِ خزاں دیدہ۔ یہ صفدر مرزا پوری کے مجموعے نیچرل شاعری میں شامل ہے جہاں

سے لے کر نوادرِ اقبال اور باقیاتِ اقبال میں شامل کی گئی۔ گل نے پژمردگی پر واویلا کیا ہے جس میں کوئی گہرائی نہیں۔ اس کے مقابلے میں بانگِ درا کی مفکرانہ نظم گُلِ پژمردہ دیکھیے۔ شاید اس کے ہوتے ہوئے 'گلِ خزاں دیدہ' کو شامل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔

۴۔ شیشۂ ساعت کی ریگ۔ ۱۲ شعروں کی یہ نظم خدنگِ نظر لکھنؤ ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں گھڑی کے ریت کو مختلف زبانوں اور مختلف دیاروں کے خاندان سے مان لیا ہے اور اس آڑ میں فرعون، موسیٰ، مریم و عیسیٰ، ہجرتِ رسول، میدانِ کربلا اور زایرانِ بصرہ کے بارے میں سوال کر دیے ہیں۔ شاید اس نظم کو اس لیے نظر انداز کیا ہو کہ ایک مٹھی ریت کو مختلف زمانوں اور دنیا بھر کے ریگ زاروں سے کیونکر منسوب کر دیا جائے۔

۵۔ ابر۔ اس عنوان کی نظم بانگِ درا میں موجود ہے لیکن اس کا جزوِ اعظم زمانہ جون ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ معلوم نہیں یہ اشعار کیوں نظر انداز ہو گئے۔

۶۔ مزدور کا خواب۔ ع مسافرات کے چاندی کی جیب دآستیں والے

یہ نظم پہلی بار روزگارِ فقیر جلد دوم ص ۳۲۶ پر اور بعد میں باقیاتِ اقبال طبع دوم وسوم میں شامل ہوئی۔ یہ انگریزی کی ایک نظم THE SLAVE'S DREAM کے انداز پر ہے۔ اچھی نظم ہے لیکن ممکن ہے یہ ابھی نامکمل ہو اور اسے شاعر آگے بڑھانا چاہتا ہو۔

۷۔ عورت۔ اسے محمد انور خاں کی بیاض سے لے کر میں نے شائع کر دیا۔ یہ نظم بانگِ درا کی نظم 'محبت' کے انداز کی ہے لیکن اول الذکر میں زبان کی خامیاں ہیں شاید اسی لیے محذوف ٹھہری۔

۸۔ قطرۂ اشک۔ یہ بھی مذکورۂ بالا بیاض میں ہے۔ معلوم نہیں انور خاں نے اسے کس رسالے سے لیا۔ اچھی خاصی نظم ہے۔ ممکن ہے بانگِ درا کی ترتیب کے وقت یہ علامہ کی نظروں سے اوجھل رہی ہو۔

اب لیجیے غزلوں کو اقبال کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔ عرصے تک وہ اپنے اُستاد داغ کے رنگ میں کہتے رہے۔ بیسویں صدی میں آہستہ آہستہ وہ اس رنگ سے ہٹ کر اپنا نیا راستہ بنانے لگے۔ داغ کے رنگ کی جملہ غزلیں متروک ہو گئیں۔ لیکن بانگِ درا میں اس رنگ کی محض ایک غزل باقی رکھی ہے:

تمھارے پیامی نے سب راز کھولا   خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی؟

اکتوبر ۱۹۰۴ء تک کی ایک منسوخ غزل میں اس رنگ کے اشعار ملتے ہیں :

مری جاں! داستاں میری کلیجہ تھام کر سُننا   کہ میرے حال پر آنسو مرے دشمن کے نکلے ہیں

حیرت پر حیرت ہے کہ رسالہ نشتر دسمبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہونے والی ان کی ایک غزل میں اس قسم کے اشعار ہیں :

کیوں وصل کے سوال پہ چپ لگ گئی تمھیں   دو چار گالیاں ہی سنا دو جواب میں

آئینہ رکھ کے سامنے زلفیں سنوار تو   تیری بلا سے، کوئی رہے پیچ و تاب میں

یہ داغ کے رنگ کے مضامین ہیں۔ ۱۹۰۶ء تک اقبال کا فن پوری طرح بالیدہ ہو چکا تھا۔ یہ غزل اس زمانے کی نہیں ہو سکتی۔ کوئی پرانی غزل چھپوا دی ہوگی۔

اقبال نے داغ کے رنگ کی غزلیں یکسر منسوخ کیں۔ عبوری دور کی غزلوں میں جو متفرق اشعار اس رنگ کے تھے انھیں بھی خارج کر دیا۔ جو غزلیں یا بعض غزلوں کے اشعار اس رنگ کے نہیں لیکن شاعرانہ اعتبار سے ساقط المعیار ہیں انھیں بھی خارج کر دیا۔

منسوخ غزلوں کا سب سے بڑا مخزن روزگارِ فقیر جلد دوم ہے۔ اس کی بیشتر غزلیں اس سے پہلے رسالوں میں بھی شائع نہیں ہوئیں۔ وہاں بیاض اعجاز احمد سے لی گئی ہیں۔ روزگار سے انھیں باقیاتِ اقبال طبع سوم میں نقل کیا گیا گو ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ ان میں کئی غزلیں پختہ ہیں۔ بعض تو فن کی بلندیوں پر فائز ہیں۔ انھیں ترک کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بعض اشعار حذف کر دیئے جاتے۔ ذیل میں ایسی غزلوں کی نشاندہی مطلع کے پہلے مصرع سے کی جاتی ہے۔ جن غزلوں میں مطلع نہیں، اُن کے پہلے شعر کا مصرعِ ثانی درج کیا جا رہا ہے۔

۱۔ عاشقِ دیدارِ محشر کا تمنائی ہوا	مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء
۲۔ چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم	مخزن جنوری ۱۹۰۳ء
۳۔ پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے	خدنگِ نظر اگست ۱۹۰۳ء
۴۔ اب کسی کو خدا نہیں ملتا	روزگارِ فقیر ص ۳۰۸

ذیل کی غزلیں نہایت پختہ ہیں ان میں سے ایک دو کے سوا بقیہ سب روزگارِ فقیر میں پہلی بار شائع ہوئیں۔ وہاں سے یہ باقیاتِ اقبال طبع سوم میں شامل کی گئیں۔ ان کے حذف کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ بانگ درا کی ترتیب کے وقت یہ شاعر کے سامنے نہیں تھیں۔

۱۔ ہزار گردش رہی فلک کو مگر یہ تارے بہم رہے ہیں — روزگارِ فقیر جلد دوم ص ۲۵۴
۲۔ چمن ہے اپنا دلِ داغ دار لالوں کا — ص ۲۵۵
۳۔ یہ چاندنی ہے کہ گردوں سے مے برستی ہے — ص ۲۶۶
۴۔ انعام بٹ رہے ہیں تری جلوہ گاہ میں — ص ۲۷۲
۵۔ اس سرزمیں کا یارب! ہر ذرہ طور کیوں ہے؟ — ص ۲۷۴
۶۔ عیاں ستارے، ہویدا فلک، زمیں پیدا — ص ۲۸۶

کوئی وجہ نہیں کہ ایسی پختہ غزلوں کو قلم زد کر دیا جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ اقبال نے اپنی قلندرانہ بے نیازی کے سبب کوئی بیاض نہیں بنائی تھی۔ بانگِ درا کی ترتیب کے وقت انھوں نے کلام کے جمع کرنے میں کوئی کاوش نہیں کی ورنہ کئی قابلِ قدر نظمیں اور متعدد غزلیں حلقۂ بیرون در کی طرح مجموعوں سے باہر نہ رہ جاتیں۔ اقبال جس مرتبے کے شاعر تھے اس پائے کے مدوّن نہ تھے۔

کلامِ اقبال

نظم (منسوخ)

دل میں آئی جو تقی کے تو کبوتر پالے　　جمع لا لا کے کیئے لال، ہرے، مٹیالے
ان میں ایسے ہیں جو ہیں پہروں کے اُڑنے والے　　اب یہ ہے حال کہ آنکھیں ہیں کہیں پاؤں کہیں
پا نو کے نیچے نہ معلوم زمیں ہے کہ نہیں

حواشی: رسالہ الزبیر، اقبال نمبر، ۱۹۷۷ء نمبر ۲، ص ۱۱ پر اقبال کے استاد زادے سید محمد تقی شاہ کا بیان درج ہے کہ ایک بار ہم نے کبوتر خریدے تو اقبال نے خوشی میں تک بندی کی تھی۔
(حوالہ رفیع الدین ہاشمی: تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ص ۴۰۵)

عبدالمجید سالک ذکرِ اقبال ص ۱۲ پر لکھتے ہیں:

"بچپن میں اقبال کو بٹیریں پالنے، کبوتر اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا، مولانا میر حسن کے صاحبزادے سید محمد تقی ان مشاغل میں ان کے شریک تھے اور مولانا میر حسن بھی منع نہ کرتے تھے۔"

یہ اشعار مخمس کا ایک بند ہیں۔ ایسا معلوم ہے جیسے کسی شعر پر تضمین کی ہو لیکن پہلے تین مصرعے چوتھے مصرع سے ہم قافیہ نہیں۔ آخری دو مصرعوں پر مشتمل شعر کسی عاشق کی ذہنی کیفیت کا بھی آئینہ ہو سکتا ہے اور کبوتر باز کی حرکات پر بھی صادق آتا ہے۔ اشعار کا صحیح زمانہ معلوم نہیں۔ لڑکپن ہی کے ہونے چاہئیں۔

غزل (منسوخ)

آبِ تیغِ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا　　باغِ جنت میں خدا نے آبِ کوثر رکھ دیا

آنکھ میں ہے جوشِ اشک اور سینے میں سوزاں ہے دل　　یاں سمند ر رکھ دیا اور واں سمندر رکھ دیا
بے یقیں پھر جائے گا جب دیکھے گا وہ صنم　　غیر کے گھر آج میں نے اپنا بستر رکھ دیا

بعد مردن بھی نہ ڈالا یار کچھ احباب پر — قبر پر میرا صبا نے جسمِ لاغر رکھ دیا
نقشِ پائے غیر دیکھے ہیں جو کوئے یار میں — رہ گزر میں مَیں نے خارِ جسمِ لاغر رکھ دیا
آمدِ خط سے ہوا پوشیدہ کب چاہِ ذقن — خضر نے اک چشمۂ حیواں چھپا کر رکھ دیا
ہنس کے پوچھا اس صنم نے کون ہے تیرا رقیب — میں نے اس کے سامنے آئینہ لے کر رکھ دیا
کشتۂ رخسار کا ظاہر نشاں ہو اس لیے — قبر پر اس نے ہمارے سنگِ مرمر رکھ دیا
خانۂ دل دے دیا ہے داغِ الفت کے عوض — رہن میں نے اک درم پر آج یہ گھر رکھ دیا
ہو نہ جلوے پردۂ انوارِ حق تیرا نقاب — تو نے گر اس کو اٹھا کر روزِ محشر رکھ دیا
ہاتھ دھو بیٹھے آبِ حیواں سے خدا جانے کہاں — خضر نے اس کو چھپا کر اے سکندر رکھ دیا

قصہ خوانِ یار کو بھیجا ہے لکھ کر حالِ دل
ہاتھ میں قاصد کے میں نے ایک دفتر رکھ دیا

ستمبر ۱۸۹۳ء

حواشی - یہ غزل سب سے پہلے گلدستہ 'زبان' دہلی بابت ستمبر ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی اس کے مشاعرے کا مصرعِ طرح تھا۔

ع میرے آگے شکوۂ بے جا کا دفتر رکھ دیا

'زبان' سے لے کر محمد بشیر الحق دیسنوی نے رسالہ 'آج کل' بابت یکم مئی ۱۹۴۵ء میں شائع کر دی اور اس کے بعد مختصر مجموعے 'تبرکاتِ اقبال' میں شائع کی۔ ان کے علاوہ یہ رختِ سفر' نوادر اور باقیات میں بھی ہے۔ سرود اور نوادر میں اس کا ماخذ زبان دہلی ۱۸۹۳ء ظاہر کیا گیا ہے۔ مہینے کا اندراج نہ ہونے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے 'زبان' سے براہِ راست نہیں لی۔ باقیات ص ۳۸۲ پر اس کا ماخذ "زبان" دہلی فروری ۱۸۹۴ء" درج کیا ہے۔ لیکن بشیر الحق سب سے زیادہ معتبر ہیں کہ انھوں نے بالیقین براہ راست 'زبان' سے لے کر 'آج کل' میں شائع کی اور 'آج کل' میں اسے زبان ستمبر ۱۸۹۳ء سے لیا ہے۔

میں نے سنا تھا کہ دیسنہ کا کتب خانہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں آگیا۔ وہاں لکھ کر پوچھا تو رسالہ زبان کا کوئی پتا نہ ملا۔

رفیع الدین ہاشمی نے نقوشِ اقبال نمبر ۱ بابت ستمبر ۱۹۷۷ء میں ص ۱۰ پر لکھا ہے کہ اقبال

ی قدیم ترین مطبوعہ غزل زبان دہلی نومبر ۱۸۹۲ء کی ہے۔ میرے استفسار پر انھوں نے اپنے سہو کا اعتراف کیا اور ستمبر ۱۸۹۳ء کی اس غزل کو قدیم ترین تسلیم کیا۔

غزل (منسوخ)

کیا مزہ بلبل کو آیا شیوۂ بیداد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے، اُڑ اُڑ کر جو گھر صیاد کا

کس بتِ پردہ نشیں کے عشق میں ہوں مبتلا
حسرتِ دل پر ہے برقع دامنِ فریاد کا

جب دعا بہرِ اثر مانگی تو یہ پایا جواب
غیر رد کر لے گئے حصہ تری فریاد کا

ہوں وہ ناداں ڈر سے زیرِ دام پنہاں ہو گیا
دُور سے چہرہ نظر آیا اگر صیاد کا

سن کے اس کو بے رخی سے بھاگ جاتا ہے امام
کیا اثر معشوق ہے اے دل تری فریاد کا

شرم آئی جب مری رگ میں لہو نکلا نہ کچھ
آب میں ہے غرق گویا نیشتر فصاد کا

قمریوں نے باغ میں دیکھا ہے اس خوش قد کو کیا؟
ہے چھُری ان کے لیے، پتا ہر اک شمشاد کا

بھول جاتے ہیں مجھے سب یار کے جور و ستم
میں تو دیوانہ ہوں اے اقبال تیری یاد کا

(نومبر ۱۸۹۲ء)

حاشیہ۔ یہ غزل سب سے پہلے گلدستہ 'زبان' دہلی بابت نومبر ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مشاعرے کا مصرعِ طرح تھا:

ع خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

غزل (منسوخ)

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں

کوچۂ یار میں ساتھ اپنے سلایا ان کو
بختِ خفتہ کو مرے پانوں دعا دیتے ہیں

بدگمانی کی بھی کچھ حد ہے کہ ہم قاصد سے
قسمیں سو لیتے ہیں جب ایک پتا دیتے ہیں

موت بازار میں بکتی ہے تو لا دو مجھ کو
ہم نشیں کس لیے جینے کی دعا دیتے ہیں

رحم آتا ہے ہمیں قیس کی عریانی پر
دھجیاں دامنِ صحرا کی اڑا دیتے ہیں

ایسی ذلت ہے، مرے واسطے عزت سے سوا
خود وہ اٹھ کر مجھے محفل سے اٹھا دیتے ہیں

غیر کہتے ہیں کہ یہ بھول گیا ہے مُردہ
قبر پر میری، جو وہ پھول چڑھا دیتے ہیں

دت بولی، جو ہوا کوچۂ قاتل میں گزر
سر اسی راہ میں مردانِ خدا دیتے ہیں

ن کو بے تاب کیا غیر کا گھر پھونک دیا
ہم دعائیں تجھے اے آہِ رسا دیتے ہیں

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بُت اقبالؔ
حضرتِ داغؔ کے اشعار سنا دیتے ہیں

حواشی۔ یہ غزل گلدستہ زبان دہلی فروری ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی، جہاں سے لے کر محمد بشیر الحق دیسنوی نے رسالہ 'آج کل' بابت ۱۵۔جولائی ۱۹۴۴ء میں شائع کی۔ اس کے مشاعرے کا مصرعِ طرح تھا:

ع یہ اشارے مجھے پیغامِ قضا دیتے ہیں

بیاض میں اس غزل کے محض دو شعر ص ۴۲ پر دیے ہیں اور وہاں مطلع کے برابر پنسل سے 'داغؔ' لکھا ہے۔

غزل (منسوخ)

تم آزماؤ 'ہاں' کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہو گی میری سوالِ وصال کے

جادو عجب نگاہِ خریدار دل میں تھا
بکتا ہے ساتھ بیچنے والا ہی مال کے

کم بخت اک 'نہیں' کی ہزاروں ہیں صورتیں
ہوتے ہیں سو جواب سوالِ وصال کے

ہم موت مانگتے ہیں، وہ گھبرائے جاتے ہیں
سمجھے اُنھوں نے اور ہی معنی 'وصال' کے

اے ضبط! ہوشیار، مرا حرفِ مدّعا
قابو میں آ نہ جائے زبانِ سوال کے

مارے ہیں آسماں نے مجھے تاک تاک کے
کیا بے خطا ہیں تیر کمانِ ہلال کے

ان کی گلی میں اور کچھ اندھیر ہو نہ جائے
اے ضعف! دیکھ مجھ کو گرانا سنبھال کے

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

میں نے کہا کہ "بے دہنی اور یہ گالیاں؟"
کہنے لگے کہ بول ذرا مُنہ سنبھال کے

کہتے ہیں ہنس کے "جائیے، ہم سے نہ بولیے"
قربان جاؤں طرزِ بیانِ ملال کے

بگڑے حیا نہ شوخیِ رفتار سے کہیں
چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے

تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب
عاشق ہوئے ہو تم تو کسی بے مثال

چلتے ہوئے کسی کا جو آنچل سرک گیا — بولی حیا "حضور! دوپٹہ سنبھال کے"
حسرت نہیں کسی کی تمنا نہیں ہوں میں — مجھ کو نکالیے گا ذرا دیکھ بھال کے
کہتا ہے خضرِ دشتِ جنوں میں مجھے کہ "چل — آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹے نکال کے"
اقبال، لکھنو سے نہ دِلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

دسمبر ۱۸۹۵ء یا ۱۸۹۶ء

حواشی۔ اس غزل کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں

۱۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ذکرِ اقبال کے حوالے سے اسے ۱۸۹۰ء کی تصنیف قرار دیا ہے۔
(سرگذشتِ اقبال ص ۳۶۔ لاہور ۱۹۷۷ء)

۲۔ بشیر الحق دیسنوی نے تبرکاتِ اقبال ص ۴۱ پر اس غزل پر ۱۸۹۴ء لکھ کر اس کا ماخذ رسالہ خدنگِ نظر لکھنو ماہ مئی ۱۹۰۲ء ظاہر کیا ہے۔

۳۔ عبدالقوی دسنوی نے غالباً مندرجہ بالا ماخذ ہی کی بنا پر اسے ۱۸۹۴ء سے منسوب کیا ہے۔ (اقبال انیسویں صدی میں۔ ص ۴۳۔ نسیم بک ڈپو لکھنو۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء)

۴۔ سرودِ رفتہ میں اسے بغیر کسی حوالے کے ۱۸۹۶ء کی غزل لکھا ہے۔ ممکن ہے اس کا ماخذ رسالہ شورِ محشر ہو۔

۵۔ سید نذیر نیازی نے اسے ۱۸۹۶ء کے مشاعرے سے متعلق کیا ہے۔
(دانائے راز، سوانح حیاتِ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال۔ ص ۱۵۴۔ اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور ۱۹۷۹ء)

۶۔ منشی محمد دین فوق نے کشمیری میگزین لاہور بابت اپریل ۱۹۰۹ء میں حالاتِ اقبال کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ پورا مضمون نوادرِ اقبال اور عبداللطیف اعظمی کی دانائے راز میں شامل ہے۔ اس میں فوق نے اقبال کا سنہ ولادت ۱۸۷۵ء لکھا ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:
"چند سال ہوئے لاہور میں [illegible]

[illegible]

نے بھی، جب کہ بیس بائیس برس کا سن تھا، طرح پر ایک غزل پڑھی اور جب اس شعر پر پہنچے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا ارشد گورگانی مرحوم بے اختیار واہ واہ کہہ اٹھے اور بولے "میاں اقبال، اس عمر میں اور یہ شعر" یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے باذوق لوگوں کو اس نوجوان اور ہونہار شاعر سے شناسائی ہوئی"۔

(نوادرِ اقبال ص ۲۱ - دانائے راز ص ۲۵-۲۴)

فوق نے اس مضمون میں اقبال کا سنہ ولادت ۱۸۷۵ء لکھا ہے۔ اس حساب سے وہ بیس بائیس سال کے ۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۷ء میں ہوں گے۔

۷- نوادرِ اقبال میں عبدالغفار شکیل نے فوق کے مندرجہ بالا مضمون میں "بیس بائیس برس" کے نیچے فٹ نوٹ میں "غالباً ۱۸۹۷ء" لکھا ہے (ص ۲۱) لیکن متن میں ص ۳۰ پر یہ غزل درج کرتے ہوئے فٹ نوٹ کا غالباً ہٹا کر قطعی طور پر ۱۸۹۷ء لکھ دیا ہے۔

۸- حکیم احمد شجاع نے لکھا ہے کہ ان کے والد حکیم شجاع الدین نے لاہور میں ایک اردو مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے حکیم امین الدین کے مکان پر منعقد ہوتا تھا۔ اس میں جو کلام پڑھا جاتا تھا وہ مشاعرے کے گلدستہ شورِ محشر میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ اقبال نے اسی مشاعرے میں 'عرقِ انفعال' والی غزل پڑھی پہلا مشاعرہ ۳۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو ہوا۔ دوسرے ہی مشاعرے میں اقبال نے 'داغِ سخنداں کا' والی غزل پڑھی جو شورِ محشر دسمبر ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی[1]

حکیم احمد شجاع نے یہ نہیں لکھا کہ 'انفعال کے' والی غزل اقبال نے پہلے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ ان کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اقبال نے پہلی بار دوسرے مشاعرے میں اپنی غزل سنائی اور یہ 'انفعال کے' والی نہیں بلکہ 'سخنداں کا' کی زمین کی غزل تھی۔ جیسا کہ موخرالذکر غزل کے سلسلے

میں آگے دکھایا جائے گا یہ غزل ۱۸۹۶ء کی تصنیف ہے۔ بعض مجموعوں نے اسے 'شورِ محشر' دسمبر ۱۸۹۶ء سے لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے حکیم احمد شجاع کو ایک سال کا سہو ہوا۔ پہلا مشاعرہ ۳۰ نومبر ۱۸۹۶ء کو ہوا ہوگا جس میں اقبال نے 'انفعال کے' والی غزل پڑھی ہوگی۔ دوسرا مشاعرہ ایک ہفتے بعد ہوا ہوگا جس میں اقبال نے 'سخنداں کا' والی غزل پڑھی۔ دونوں شورِ محشر دسمبر ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئیں۔ یہی جناب جگن ناتھ آزاد کا موقف ہے۔[۲] اگر کہیں سے شورِ محشر دسمبر ۱۸۹۶ء کا شمارہ مل جائے تو بات بالکل صاف ہو جائے۔

---

[۱] اقبال کا قیام لاہور۔ نقوش شمارہ ۱۰۸ بابت ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۱۱ - ۱۰۔ یہی مضمون دوبارہ نقوش اقبال نمبر ۲ شمارہ ۱۲۳، بابت دسمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔

[۲] اقبال کے ابتدائی دور کی شاعری۔ رسالہ اکادمی لاہور بابت جنوری، فروری ۸۶ء ص ۱۲ تا ۱۶۔

فلاحِ قوم یا ترقی و تعلیم (منسوخ)

کیا تھا گردشِ ایّام نے مجھے محزوں
بدن میں جان تھی جیسے قفس میں صید زبوں

چڑھائی فوجِ الم کی ہوئی تھی کچھ ایسی
علَم خوشی کا مرے دل میں ہو گیا تھا نگوں

کیا تھا کوچ جو دل سے خوشی کی فوجوں نے
لگائے خیمے تھے واں رنج کے جنودِ فتوں

غم و الم نے جگر میں لگا رکھی تھی اک آگ
بنا ہوا تھا مرا سینہ رشکِ صد کانوں

زبسکہ غم نے پریشاں کیا ہوا تھے مجھے
یہ فکر بسکہ لگی تھی کہ ہو نہ جائے جنوں

جو سامنے تھی مرے قوم کی بری حالت
اُمڈ گیا مری آنکھوں سے خون کا سیحوں

انھیں غموں میں مگر مجھ کو اک صدا آئی
کہ بیت قوم کی صلاح سے ہوئی موزوں

پئے مریض یہ اک نسخہ مسیحا تھا
کہ جس کو سن کے ہوا خرمی سے دل مشحوں

غبار دل میں جو کچھ تھا فلک کی جانب سے
دبے اسی میں غم و رنج صورتِ قاروں

ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم
یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالعِ واژوں

ملے گا منزلِ مقصود کا پتا ہم کو
خدا کا شکر ہے جس نے دیے یہ راہ نموں

ہلال وار اگر منھ میں دو زبانیں ہوں
ادا نہ پھر بھی ہو شکرِ خدائے کن فیکوں

مثالِ شانہ اگر میری سو زبانیں ہوں
نہ طے ہو زلفِ رہِ شکرِ ایزدِ بے چوں

چلی نسیم یہ کیسی کہ پڑ گئی ٹھنڈک
چمن ہوئی مرے سینے میں نارِ سوزِ دروں

یہ کیا خوشی ہے کہ دل خود بخود یہ کہتا ہے
بعید رنج سے اور خرمی سے ہوں مقروں

خوشی نے آ کے خدا جانے کیا کہا اس سے
اُچھل رہا ہے مثالِ تموّجِ جیحوں

کرم سے اس کے وہ صورت فلاح کی نکلی
کہ حصنِ قوم ہر اک شر سے ہو گیا مصئوں

خدا نے ہوش دیا متفق ہوئے سارے
سمجھ گئے ہیں تری چال گنبدِ گردوں

چراغِ عقل کو روشن کیا ہے ظلمت میں
ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا درِ مکنوں

مزا تو جب ہے کہ ہم خود دکھائیں کچھ کر کے
جو مرد ہے نہیں ہوتا ہے غیر کا ممنوں

بڑھے یہ بزمِ ترقی کی دوڑ میں یا رب
کبھی نہ ہو قدمِ تیز آشنائے سکوں

اسی سے ساری اُمیدیں بندھی ہیں اپنی کہ ہے | وجود اس کا پئے قصرِ قوم مثلِ سُتوں
دُعا یہ تجھ سے ہے یارب کہ تا قیامت ہو | ہماری قوم کا ہر فرد قوم پر مفتوں
جو دَوڑ کے لیے میدانِ علم میں جائیں | سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں
کچھ ان میں شوقِ ترقی کا حد سے بڑھ جائے | ہماری قوم پہ یارب وہ پھونک دے افسوں
دکھائیں فہم و ذکا و ہنر یہ اَوروں کو | زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فنوں

جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اسے بھی باندھ لے اقبال اصورتِ مضموں

فروری ۱۸۹۶ء

حواشی ۔ لاہور میں "انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند" قائم کی گئی اور اس کا پہلا اجلاس فروری ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ اقبال نے اس میں یہ نظم پڑھی جو نظرِ ثانی کے بعد کشمیری میگزین لاہور بابت مارچ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی معلوم ہوتا ہے اصلاً اس کا عنوان "فلاحِ قوم" تھا، نظرِ ثانی کے بعد ترقی و تعلیم کر دیا گیا۔

مختصر العروض کا قطعۂ تاریخ

مُصنّف جب کہ ایسا ہو رسالہ کیوں نہ ایسا ہو؟ | گہرباری تقاضا ہے مزاجِ ابرِ نیساں کا
گہرباری دکھائی کلکِ گوہربار نے ایسی | رسالہ آپ کا سلکِ جواہر بن گیا گویا
یہ چھوٹا سا رسالہ کانِ معنی جانِ معنی ہے | نواسنجانِ گلشن کی زباں پر اس کا ہے چرچا
تجلّی طور کی ہے روشنائی اس کے حرفوں کی | بیانِ صفحہ سے ظاہر ہے اعجازِ یدِ بیضا
صدائے نالۂ دل غیرتِ نظمِ فغانی ہے | مگر شورِ فغانِ بلبل نے موزوں کر لیا اپنا
مُصنّف کا قلم یُوں صفحۂ کاغذ کو کہتا ہے | کسی کا دل خزینہ ہے گہرہائے معانی کا
حسیں بیٹھے جو اپنا مصرعِ گیسو بنانے کو | رسالہ آپ کا آئینہ بن کر سامنے آیا
مصنّف اس کا جب اسکندرِ ملکِ معانی ہو | اسے کہیے جو آئینہ، تو ہر صورت سے ہے زیبا
پئے سالِ اشاعت غور کی اقبال نے جس دم | زبانِ ہاتفِ غیبی ہوئی اس طور سے گویا
دکھا کر یہ کتابِ بے بہا دل چھین لیتا ہوں | فصاحت کا، بلاغت کا، لیاقت کا، ذہانت کا

'ادب' کے ساتھ سالِ طبع پھر یوں عرض کرتا ہوں
'جزاک اللہ لکھا ہے رسالہ مختصر کیسا'

۴+۷+۱۸۸۵ = ۱۸۹۶ء

حواشی - یہ قطعۂ تاریخ باقیاتِ اقبال طبع سوم (ص ۴۷۸ - ۴۷۷) سے لیا گیا ہے۔ سنہ تاریخ کے بارے میں یہ نوٹ ہے۔

'پہلے فصاحت' بلاغت' ذہانت کا دل چھین کر چار الف کے چار عدد حاصل کیے۔ پھر تاریخی مادے کے عداد ۱۸۸۵ میں ادب کے سات عدد شامل کیے۔ اس طرح ۴ + ۷ + ۱۸۸۵ = ۱۸۹۶ء سن مطلوب حاصل کیا۔

اس کے بارے میں مزید معلومات قاضی افضل حق قریشی، استادِ شعبۂ صحافت' پنجاب یونیورسٹی لاہور نے اپنے مضمون 'باقیاتِ اقبال' (رسالہ اُردو کراچی جلد ۴۵ شمارہ ۳ - ۱۹۶۹ء) میں بہم پہنچائیں۔ مختصر العروض کے مصنف مولانا ابوسعید محمد شعیب اورینٹل کالج لاہور کے اسکول سیکشن میں عربی مدرس بہ عہدہ مولوی چہارم تھے اورینٹل کالج گورنمنٹ کالج کی عمارت میں تھا۔ ۱۸۸۴ء میں گورنمنٹ سے شعبۂ عربی الگ کر کے اورینٹل کالج میں منتقل کر دیا گیا۔ گورنمنٹ کالج کے طالبِ علم عربی پڑھنے اورینٹل کالج میں جاتے تھے مختصر العروض کے آخر میں اقبال کا مندرجہ بالا قطعہ ہے۔ اس میں شاعر کا نام ان الفاظ میں لکھا ہے۔

شاعر باکمال، ناظم عالی خیال، جناب منشی محمد اقبال صاحب اقبال، شاگرد جناب اُستاد داغ دہلوی، متعلم بی اے کلاس، گورنمنٹ کالج' لاہور۔

رسالہ اُردو کے مضمون میں پورا قطعۂ تاریخ شامل ہے۔ اس میں اور باقیات کے متن کوئی اختلاف نہیں۔

۱؎ غور مذکر ہے اقبال نے اسے مونث باندھا ہے۔

غزل (منسوخ)

بر سرِ زینت جو شمعِ محفلِ جانانہ ہے
شانہ اس کی زلفِ پیچاں کا پرِ پروانہ ہے

شکوۂ جور و جفا سے باز آجاتے ہیں، ہم
کیوں صفِ محشر میں حالت تیری بے تابانہ ہے

کچھ خبر پوچھیں اسیرِ زلفِ پیچاں کی، مگر
سو زبانیں اس کی ہیں کیا اعتبارِ شانہ ہے

اللہ اللہ دیدۂ واعظ میں اُڑ کر جا پڑی
پردہ دارِ مے کشاں خاکِ درِ مے خانہ ہے

میری باری پر گرا ہے، دیکھ تو جذبِ شکست
ساقیا! توبہ سے پہلے ٹوٹتا پیمانہ ہے

رنگ لائی ہیں عبادت کا مری مے خواریاں
روکشِ سجدہ مری ہر لغزشِ مستانہ ہے

ہو گیا میری جبیں سے بت پرستی کا ظہور
خطِ پیشانی رگِ سنگِ درِ بت خانہ ہے

دیکھ مغرب کی طرف سے جھومتا آتا ہے کیا
ساقیا! بادل نہیں، اُڑتا ہوا مے خانہ ہے

مے پرستی بھی نہاں ہے گردشِ تقدیر میں
خطِ پیشانی مرا، گویا خطِ پیمانہ ہے

خانہ بربادی کے صدقے، سوئے صحرا جائیں کیوں
خیر سے گھر ہی ہمارا رشکِ صد ویرانہ ہے

سخت جاں شرمندۂ شوقِ شہادت کیوں نہ ہوں
تیغ میں بل پڑ گیا، قاتل کو دردِ شانہ ہے

ضعف کر دیتا مجھے شرمندۂ دشتِ جنوں
خانہ بربادی، مگر، بولی "یہیں ویرانہ ہے"

حضرتِ واعظ ہیں مےخانے میں شاید آ گئے
کلمۂ لاحول وردِ ہر لبِ پیمانہ ہے

حضرتِ ناصح کو اس محفل میں لے جا کر کہا
ہاں بتا، اب میں ہوں دیوانہ کہ تو دیوانہ ہے؟

تیری محفل میں کبھی چلتا، کبھی رُکتا ہے یہ
ذکر بھی میرا، مگر میری طرح دیوانہ ہے

اس نے پہلو بدلا تو تعظیم کو اُٹھنے لگا
تو بھی اے دردِ دلِ مضطر! کوئی دیوانہ ہے

شورشِ قالوا بلیٰ اٹھی جہاں صبحِ الست
دل اسی مےخانے کا ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے

اُڑ کے اے اقبال! سوئے بزمِ یثرب جائے گا
رُوح کا طائر عرب کی شمع کا پروانہ ہے

حواشی ۔ یہ غزل روزگارِ فقیر ص ۲۵۰ تا ۲۵۳ پر ہے ۔ وہاں سے باقیات طبع سوم میں ص ۵۶۸ تا ۵۷۰ پر دی ہے ۔ باقیات میں اس کا سنہ تصنیف ۱۸۹۶ء دیا ہے ۔ اقبال اور نیرنگ دونوں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک ساتھ تھے ۔ اقبال نے ۱۸۹۵ء میں بی اے کے سالِ اول میں اور نیرنگ نے ایف اے کے سالِ اول میں داخلہ لیا ۔ اقبال نے غالباً نیرنگ کے سالِ اول میں یعنی جولائی ۱۸۹۵ء تا اپریل ۱۸۹۶ء میں یہ غزل لکھ کر نیرنگ کو بھیجی ۔ نیرنگ نے بھی اس زمین میں غزل کہی ۔ اس طرح اقبال کی یہ غزل ۱۸۹۵ء کے نصفِ اول کی ہوسکتی ہے ۔

(حوالہ عبداللہ قریشی : معاصرینِ اقبال کی نظر میں ص ۶۳ ۔

؁۱ پہلے مصرع کے پیشِ نظر یہاں 'بُت خانہ' ہونا چاہیے، 'مے خانہ' سہوِ کتابت ہوسکتا ہے ۔

غزل (منسُوخ)

تصوّر بھی جو بندھتا ہے تو خالِ روئے جاناں کا
بلندی پر ستارا ہے شبِ تاریکِ ہجراں کا

نقاہت قیس کی بولی، جو گزری پاس سے لیلیٰ
ذرا دامن بچانا، یہ بھی کانٹا ہے بیاباں کا

جو ڈالی خاک مٹھی سے، کہا نالوں نے چلّا کر
تجھے آتا نہیں سر پر اُٹھا لینا بیاباں کا

اڑا جب طائرِ رنگِ حنا لیلیٰ کے ہاتھوں سے
وہیں پھندا بنایا قیس نے تارِ گریباں کا

جُنوں کو زخمِ دل کہتا ہے قائل ہیں ہمی جنوں تیرا
جو پھاہا بن کے آنکلے کوئی پُرزہ گریباں کا

جو وحشت میں کبھی موئے میانِ یار کو دیکھا
جُنوں کہنے لگا، یہ تار ہے تیرے گریباں کا

یہی کہتا ہے چاکِ دامنِ یُوسف زلیخا کو
مجھے ٹانکا لگے تارِ نگاہِ پیرِ کنعاں کا

سمجھ کر اخترِ قسمت اُٹھا لیتے ہیں ہم اس کو
ستارا جب گرا کوئی ترے ماتھے کی افشاں کا

جُنوں! تیرِ نگاہِ یار نے چھلنی کیا سینہ
نہیں مشکل رہا اب چھاننا خاکِ بیاباں کا

کبھی تیرِ جنوں دل میں ترازو ہو ہی جائے گا
کبھی کام آ ہی جائے گا مرے کانٹا بیاباں کا

حیا مانع رہی لیکن اِدھر جذبِ محبت تھا
کسی نے اُٹھ کے آخر روزنِ دیوار سے جھانکا

دمِ زورِ جنوں آخر اسی سے سر پٹکتا ہوں
مرے سر پر بڑا احسان ہے دیوارِ زنداں کا

رقیبوں کو جلاتی ہے تمھیں بے تاب کرتی ہے
تمھیں کہہ دو اثر کیا کم ہے میری آہِ سوزاں کا

غضب ہوگا کہیں اب وصل کا وعدہ نہ کر دینا
کہ خوگر ہو گیا ہوں میں شبِ تاریکِ ہجراں کا

بُرا ہو بدگمانی کا، اسی پر آنکھ رہتی ہے
نگہباں جانتے ہیں وہ مجھے اپنے نگہباں کا

بدل جائے اگر میرا مقدر اس کی قسمت سے
قدم آنے نہ دوں تیری گلی میں ایسے درباں کا

سمٹ کر تنگیِ دل سے، سویدا بن گیا آخر
خیال آیا اگر دل میں تری زلفِ پریشاں کا

مزا انکار میں ہے وصل کے اقرار سے بڑھ کر
کرشمہ ہے یہ سب شیرینیِ تقریرِ جاناں کا

ہماری شور بختی کا اثر اتنا تو ہو یا رب
نہ ہو زخمِ جگر محتاج قاتل کے نمک داں کا

نسیمؔ و تشنہؔ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

دسمبر ۱۸۹۶ء

حواشی۔ فوق نے کشمیری میگزین لاہور میں 'حالاتِ اقبال' کے عنوان سے جو مضمون لکھا اس میں لکھتے ہیں:

"ایف اے کی طالب علمی کے دنوں میں ہی آپ نے استاد المعظم نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ مرحوم استادِ حضور نظام دکن سے اصلاح لینی شروع کی، چنانچہ ایک مقطع میں فرماتے ہیں:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا"

(نوادر ص ۲۰)

اقبال ۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۵ء میں ایف اے کے طالب علم تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ غزل بی اے کی طالب علمی کے دوران کہی ہے۔ یہ غزل سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال طبع سوم (ص ۳۸۳) میں ملتی ہے جہاں دونوں نے ماہنامہ شورِ محشر لاہور بابت دسمبر ۱۸۹۶ء سے نقل کی ہے۔ لیکن حکیم احمد شجاع اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ اردو بزمِ مشاعرہ کا پہلا جلسہ ۲۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو ہوا۔

"اور پھر اس بزمِ مشاعرہ کا کوکبِ اقبال ملاحظہ ہو کہ اس کے دوسرے ہی مشاعرے میں اقبال نے غزل پڑھی۔" شورِ محشر کی روئداد بابت دسمبر

۱۸۹۵ء میں ان کی غزل پر ان کا نام اس طرح درج ہے:

جناب شیخ محمد اقبال
تلمیذ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی

اور اس غزل کے مقطع میں انھوں نے خود داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا ہے:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا"[1]

حکیم احمد شجاع اس غزل کو انجمن کے دوسرے مشاعرے سے منسوب کرتے ہیں اور شورِ محشر ۱۸۹۵ء سے نقل کرتے ہیں۔ سرود رفتہ اور باقیات میں اسے شورِ محشر دسمبر ۱۸۹۶ء کے شمارے سے لیا گیا ہے۔ محمد عبداللہ قریشی اپنے مضمون[2] میں لکھتے ہیں کہ فوق ۱۳ جنوری ۱۸۹۶ء کو اپنے وطن سے لاہور آئے۔ وہاں انجمنِ اتحاد کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ ایک مشاعرے میں مصرعِ طرح تھا ع

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

اقبال نے وہ غزل پڑھی جس میں داغ کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔

اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس مصرع طرح کا مشاعرہ ۱۸۹۵ء میں نہیں ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ حکیم احمد شجاع کو سہو ہو گیا ہوگا۔ عبداللہ قریشی نے اپنی کتاب[3] میں صریحاً اس مشاعرے کو ۱۸۹۶ء میں رکھا ہے اور اس کی اشاعت شورِ محشر دسمبر ۱۸۹۶ء میں دکھائی ہے۔

اس غزل کا مقطع مشہور ہے جو کئی کتابوں اور مضامین میں ملتا ہے۔ مثلاً رزاق

---

[1] حکیم احمد شجاع: اقبال لاہور میں۔ نقوش ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۱۱-۱۰

[2] اقبال اور فوق مشمولہ ادبی دنیا لاہور' دورِ ششم اقبال نمبر شمارہ ۲۴ بحوالہ عبدالقوی دسنوی، اقبال انیسویں صدی میں۔ ص ۳۸۔ لکھنؤ اکتوبر ۱۹۷۷ء [3] معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۲۸

کے دیباچے میں ص ۳۲ پر۔

؎۱ نسیم سے مراد سید شبیر حسین جعفری نسیم بھرتپوری متوفی ۱۹۰۸ء ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی نے اپنی کتاب مطالعۂ داغ میں تلامذۂ داغ کی جو فہرست دی ہے اس میں نسیم[1] کا نام والیِ دکن کے بعد دوسرے نمبر پر ہے اور حافظ محمد یوسف خاں تشنہ بلند شہری کا ۹۲ نمبر پر۔ تشنہ کے حالات خم خانۂ جاوید جلد[2] دوم میں دیے ہیں۔ ان کے مطابق تشنہ کا انتقال ۱۹۰۰ء میں ہوا۔ محمد عبداللہ قریشی نے اپنی کتاب 'معاصرین اقبال کی نظر میں'، ص ۲۸ پر ان دونوں کا تعارف درج کیا ہے۔

کشمیر سے متعلق قطعات (منسوخ)

۱

کہکشاں میں آکے اختر مل گئے اک لڑی میں آکے گوہر مل گئے
واہ وا کیا محفلِ احباب ہے ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے

۲

ظلم سہتے ہیں، وطن اپنا نہ جن سے چھٹ سکا شکوۂ حکام پرائے دل نہیں تیرا بجا
کیا عجب کشمیر میں رہ کر جو ہے ان پر جفا پائے گل اندر چمن دائم بُراست از خارہا

۳

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دُور یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دُور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

۴

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اُخوت کی صدف میں پنہاں مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

---

[1] مطالعۂ داغ ص ۳۴۳۔ لکھنؤ ۱۹۰۳ء، [2] ص ۹۲-۹۱

۵

سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے — جیبِ خجلت سے سرِ طُور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلّی گہہِ مولائے جلیل — عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

۶

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا — بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اس دستِ جفاکیش کو یارب! جس نے — رُوحِ آزادیِ کشمیر کو پامال کیا

۷

بُت پرستی کو مرے پیشِ نظر لاتی ہے — یادِ ایّامِ گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبال — کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

۸

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے — اس باغِ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد — جو ہے وطن ہمارا، وہ جنّت نظیر ہے

۹

دہر کی شانِ بقا خطّۂ کشمیر میں دیکھ — باغِ جنّت کی ہوا خطّۂ کشمیر میں دیکھ
ذرّے ذرّے سے ہے اک حُسن کا طوفاں بپا — جوش میں لطفِ خُدا خطّۂ کشمیر میں دیکھ

حواشی۔ انھیں کئی مجموعوں میں رُباعی لکھا ہوا ہے لیکن یہ رباعی کے وزن میں نہیں، اس لیے قطعات ہیں۔ یہ انجمنِ کشمیری مسلمانانِ لاہور میں پڑھے گئے۔ انجمن کا پہلا اجلاس فروری ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ سرودِ رفتہ کے مطابق یہ قطعات اقبال نے اس وقت کہے تھے جب وہ بی اے کے طالبِ علم (۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۷ء) تھے۔ اس طرح یہ فروری ۱۸۹۶ء تا جون ۱۸۹۷ء کے بیچ کی تصنیف ہیں۔ عبدالقوی[1] دسنوی نے انھیں ۱۸۹۷ء سے منسوب کیا ہے لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔

---

[1] اقبال انیسویں صدی میں ص ۳۹

ے اسلام کا ٹیکا محلِ نظر ہے کیوں کہ ٹیکا ہندوئیت کی نشانی ہے نہ کہ اسلام کی۔ دوسرے مصرع کی بات بھی محض برائے بیت ہے۔ اقبال کو اپنے برہمن نژاد ہونے پر حجاب نہیں فخر محسوس ہوتا تھا۔ انھوں نے کئی فارسی اور اُردو اشعار میں برہمن زادگی کا اظہار کیا ہے۔ روزگارِ فقیر جلدِ دوم[1] میں خود اقبال کے ہاتھ کی لکھی ایک نامکمل دستاویز کا فوٹو ہے جس میں انھوں نے خود کو قوم سپرو (کشمیری پنڈت) لکھا ہے۔ اگر انھیں پنڈت کہلانے پر شرم محسوس ہوتی تو اس اصرار سے اس کا اشتہار نہ کرتے۔

غزل (منسوخ)

لاکھ سرتاجِ سخن ناظمِ شرواں[1] ہوگا
پر مرے سامنے اک طفلِ دبستاں ہوگا

مردِ مومن[2] کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
موت جب آئے گی اس کو تو وہ خنداں ہوگا

عشق کی راہ میں جو کوئی قدم رکھے گا
کبھی گریاں کبھی خنداں کبھی عریاں ہوگا

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
جنتی ہوگا، فرشتوں میں نمایاں ہوگا

کیا کہیں مست بنے عشق کہاں ہوتا ہے
یہ درِ دیرِ مغاں ناصیہ کو یاں ہوگا

جیتے جی سر نہ جھکا میں کسی کے آگے
مجھ پہ احسان نہ ہوگا تو یہ احساں ہوگا

زندگی چار دنوں[3] بارے ہے تو اس کی خاطر
بوالہوس ہوگا جو شرمندۂ احساں ہوگا

چار سو پھولوں کا انبار نظر آتا ہے
شاید اس بزم میں اقبال غزل خواں ہوگا

حواشی۔ یہ غزل سرودِ رفتہ اور باقیات میں شامل ہے۔ دونوں میں سے کسی نے اس کا ماخذ نہیں دیا کہ یہ کہاں سے نقل کی ہے۔ سرود میں غلام رسول مہر نے اسے انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل کی کہا ہے۔ باقیات طبعِ سوم میں

---

[1] روزگار ص ۱۲

اس سے پہلے ذیل کے نوٹ میں اس کی شانِ نزول بیان کی ہے ۔

۱۸۹۷ء کے لگ بھگ عیدِ رمضان کی تقریب پر حکیم امین الدین صاحب نے اپنے چند دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا جن میں اقبال بھی تھے ۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شیخ عبدالقادر نے مومن کا یہ شعر پڑھ کر تجویز کی کہ حضرتِ اقبال اور خان احمد حسین خاں اس پر فی البدیہہ غزل کہیں ؂

وعدۂ وصل سے ہو دل کو تسلّی کیوں کر   فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہو گا

اقبال نے اس موقع پر جو غزل کہی وہ حسب ذیل ہے ۔   (ص ۳۸۷ - ۳۸۶)

سید نذیر نیازی کی دانائے راز (ص ۲۰۴) میں بھی اس صحبت کو ۱۸۹۷ء یا ۱۸۹۸ء کی قرار داد ہے لیکن ڈاکٹر عبدالحق (دلّی یونیورسٹی) لکھتے ہیں :

" اتنا تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ غزل انیسویں صدی کے اواخر کی نہیں ہے ۔ اب بیسویں صدی کے اوائل کا نفاذ کب تک ہو گا ..... راقم السطور کا خیال ہے کہ اسرارِ خودی کے بعد کی غزل ہے ۔ اس لیے کہ اس سے پہلے اور کہیں بھی 'مردِ مومن' کا لفظ یا 'خودی' کا لفظ مستعمل نہیں ہوا ہے ۔" [1]

کلامِ اقبال کے ارتقا پر نظر رکھی جائے تو یہ واضح دکھائی دے گا کہ یہ غزل انیسویں صدی ہی کی ہو سکتی ہے ۔ ایسے خام کارانہ کلام کو اسرارِ خودی کے بعد رکھنا بالکل غلط ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال نے اس غزل میں اصلاح کر کے مومن اور خودی کے الفاظ بعد میں بڑھا دیے ہوں ۔

غزل کی اشاعتِ اوّل کا علم ہوتا تو کوئی بہتر فیصلہ کیا جا سکتا تھا ۔ ویسے 'خودی' کا لفظ ان کی ایک اور قدیم غزل میں ملتا ہے ۔

خودی نے عطا کی مجھے خود شناسی   مرا حسن دائم مرے رُوبرو ہے

---

[1] اقبال کے ابتدائی افکار ص ۱۴۲ بحوالۂ عبدالقوی دسنوی: اقبال انیسویں صدی میں ص ۴۶

ع۱ے بقول باقیاتِ سوم ص ۲۴۸ ناظمِ شرواں سے مراد خاقانی شروانی ہے

ع۲ے جیسا کہ سرودِ رفتہ میں نوٹ ہے اسی مضمون کو بہت بعد میں اس فارسی شعر میں ادا کیا۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسّم برلبِ اُوست

ع۳ے "دہاڑے" پنجابی میں دن کو کہتے ہیں۔ اُردو میں یہ لفظ "دن دہاڑے" میں موجود ہے لیکن تنہا کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ بھوپال میں ایک دن کی مزدوری کو دہاڑی بولتے ہیں اور یہ لفظ انھیں معنی میں فرہنگِ آصفیہ میں ملتا ہے۔

غزل (منسوح)

ضد سے قمری نے کہا تم کو گلِ تر کا جواب
کہتی ہے بلبل "نہیں! سرو و صنوبر کا جواب"

مجھ سے بگڑے تو بنے وہ اپنے تیور کا جواب
پھر کے مجھ سے بن گئے میرے مقدّر کا جواب

اُٹھ کے تربت سے ترا دامن پکڑ لیتے ہیں ہم
اور کیا دیں اے ستمگر تری ٹھوکر کا جواب

سر چڑھا جاتا ہے میرے پھوٹ کر چھالا مرا
ہو سکا کب یہ مرے پھوٹے مقدّر کا جواب

ساغرِ گیتی نما پر کر نہ اے جمشید! ناز
شیشۂ دل ہے ہمارا آئینے ساغر کا جواب

تا درِ مے خانہ کیوں چلتا نہیں تو واعظا
آ دکھا لائیں تجھے، کیا نام؟ کوثر کا جواب

ضد سے عمّامے کو واعظ نے کیا غرقِ شراب
پر کہاں رندو! ہمارے دامنِ تر کا جواب

کان پیچکے سے موذّن کے لیے صبحِ وصال
واہ کیا سوجھا مجھے اللہ اکبر کا جواب

مضطرب اے دل نہ ہو وہ دن تو آنے دے ابھی
ہم نے نالوں میں چھپا رکھا ہے محشر کا جواب

پڑ گیا چھالا زباں پر گرمیِ مے کے سبب
دیکھ لے زاہد! حبابِ جامِ کوثر کا جواب

اس نے مُنہ موڑا جو میرے آبلوں نے کیا ہوا
بن کے نشتر چُبھ گیا چھالوں میں نشتر کا جواب

روز کہتے تھے "کہیں مرتا نہیں"، ہم مر گئے
دے دیا ہے آج آخر تیری "مر مر" کا جواب

میں نے یہ پوچھا "کروگے قتل تم کیونکر مجھے؟"
مار کر تلوار بولے "ہے یہ 'کیونکر' کا جواب"

حشر میں نالے کرے گا کُشتۂ رفتارِ یار
لطف تو یہ ہے کہ ہو محشر میں محشر کا جواب

تیرے کانوں تک چلی جائے اگر میری خبر — پھر تو بن جائے ترے کانوں کے گوہر کا جواب
بن کے آیا ہے ہلالِ آسماں لیکن کہاں — تیرے ابرو، تیرے ناخن تیرے خنجر کا جواب

ارشد[1] و رافت[2] سے ہوں اقبال میں خواہانِ داد
آبداری میں ہیں یہ اشعار گوھر کا جواب

حواشی - یہ غزل روزگارِ فقیر میں بیاضِ اعجاز احمد سے نقل کی گئی ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں لیکن اس کے اشعار کا قدیم رنگ اور مقطع میں مرزا ارشد سے داد طلبی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ع 'قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے' والی غزل کے بعد جلد ہی کہہ لی گئی ہو گی۔

[1] باقیات ص ۵۷ کے مطابق میرزا ارشد گورگانی مراد ہیں۔

[2] باقیات ہی کے مطابق رافت بھوپالی مراد ہیں۔ خمخانۂ جاوید[1] میں ان کے حالات دیے ہیں مولوی محمد عبدالرؤف خاں رافت باشندۂ اندور ۱۸۶۹ء میں نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے پرائیویٹ سکریٹری بھی تھے اور بچوں کے اتالیق بھی۔ داغ کے شاگرد تھے۔ کچھ عرصہ پیسہ اخبار لاہور میں سب ایڈیٹر رہے۔

جس زمانے میں اقبال نے یہ غزل کہی ہے رافت لاہور میں ہوں گے۔ روزگار میں رافت کے بجائے راحت چھپا ہے لیکن یہ سہوِ طباعت معلوم ہوتا ہے۔ خمخانۂ جاوید میں راحت تخلص کا کوئی ایسا شاعر نہیں جو اس شعر میں چسپاں ہو سکے۔

غزل (منسوخ)

اُٹھتے اُٹھتے وہ گئے بیٹھ مری محفل میں — کس طرح ٹل گئی اللہ! ہماری آئی
زندگی موت سے ہم دوش ہوئی جاتی ہے — میری میت اٹھی اور اُن کی سواری آئی
بُری عادت ہے یہ ہر روز بگڑ جانے کی — اب تلک آپ کو اے جان! نہ یاری آئی

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۳۵۱

ہائے کس ناز سے آیا ہے خیالِ جاناں
چمن دل میں مرے بادِ بہاری آئی

وہ مجھے روتے ہوئے دیکھ کے فرماتے ہیں
آپ کو بھی روشِ گریہ و زاری آئی

ہائے آکر وہ دمِ نزع کسی کا کہنا
ہائے' اے کاش! مجھے آئے تمھاری آئی

تیر کو ڈھونڈتے ہاتھوں میں کٹاری آئی

لاڈلی رندوں کی، ساقی کی دلاری آئی

حواشی۔ یہ غزل روزگار ص ۲۸۲ - ۲۸۱ پر ہے جہاں یہ بیاضِ اعجاز سے لی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ غزل نامکمل رہی اور شاعر نے اسے کبھی شائع نہ کرایا۔ آخر میں دو مصرعے ایسے ہیں جن کے پہلے مصرعے کہے ہی نہیں گئے۔ ممکن ہے ان میں سے ایک (غالباً آخری مصرع) مصرعِ طرح رہا ہو جسے شاعر نے گرہ لگانے کے لیے بیاض میں لکھ لیا ہو۔

اس کا بھی زمانہ معلوم نہیں لیکن اشعار کے قدیم اور ناپختہ رنگ کی بنا پر یہ بھی ۱۸۹۷ء سے بعد کی نہیں ہوسکتی۔

غزل (منسوخ)

کامِ بلبل نے کیا ہے مانی و بہزاد کا
برگِ گل پر اس نے فوٹو لے لیا صیاد کا

پہلے یہ بیگانگی ہم کو نظر آتی نہ تھی
سبزۂ گلشن پہ سایہ پڑ گیا صیاد کا

چلتے چلتے باغ میں بلبل نے یوں گل سے کہا
تجھ کو گلچیں کا مبارک، مجھ کو، گھر صیاد کا

کچھ کدورت ہے دلوں کی، کچھ دھواں آہوں کا ہے
یہ زمین و آسماں ہے خانۂ صیاد کا

یادِ گلشن ہے زباں پر، لب پہ ذکرِ آشیاں
داغِ ہجرِ گل جگر میں، دل میں ڈر صیاد کا

بیکسوں کے پاس کون آئے قفس میں ہم صفیر
یادِ گل آتی ہے، یا آتا ہے ڈر صیاد کا

ہائے کس کس لطف سے ظالم نے بتلایا مجھے
بھول کر گلچیں سے پوچھا تھا پتہ صیاد کا

چلتے چلتے خارِ گل سے کیوں اٹک جاتا ہے یہ
دل کسی بلبل کا ہے، دامن، مگر صیاد کا

قتل کرتا ہے مجھے، آتا نہیں ہے دل میں رحم   آہنِ مقراض کا ہے دل مگر صیاد کا
ہوں کبھی اِس شاخ پر میں اور کبھی اس شاخ پر   ناک میں آخر کو دم آیا مرے صیاد کا

ہوگیا اقبال قیدی محفلِ گجرات[1] کا
کام کیا اخلاق کرتے ہیں مگر صیاد کا

حواشی ۔ یہ غزل بالکل ابتدائی رنگ کی ہے ۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ پوری غزل بہ قیدِ یک قافیہ 'صیاد' لکھی گئی ہے ۔

عـلـہ انوارِ اقبال[1] کے مطابق اقبال کی پہلی شادی خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد ساکن گجرات کی دختر سے ہوئی تھی ۔ اقبال شادی کے بعد اکثر وہاں جایا کرتے تھے ۔ غالباً ۱۸۹۸ء میں گجرات والا شعر پڑھا ۔ معلوم ہوتا ہے دوسرے مصرع میں 'اخلاق' کسی شخص کا نام ہے ۔

نذیر نیازی[2] کے مطابق اقبال ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۰ء کے بیچ لاہور سے اکثر گجرات جایا کرتے تھے ۔ تبھی یہ شعر کہا ہے ۔

غزل (منسوخ)

میں تو کچھ اور ہو گیا جب سے   تیری محفل میں باریابی ہے
حسن مرتا ہے پردہ داری پر   عشق کو شوقِ بے حجابی ہے
موت کے بعد، دیکھیے کیا ہو   زندگی میں تو سو خرابی ہے
بادہ کش ہے نگاہ، گلشن میں   پھول ساغر، کلی گلابی ہے
آدمی کام[1] کا نہیں رہتا   عشق میں یہ بڑی خرابی ہے
لن ترانی بھی، طور سوزی بھی   پردے پردے میں بے حجابی ہے
پوچھتے کیا ہو مذہبِ اقبال   یہ گنہ گار بُو ترابی ہے

---

[1] بشیر احمد ڈار : انوارِ اقبال : ص ۳۱۲ ۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۔ طبعِ دوم ۱۹۷۷ء

[2] دانائے راز ص ۹۵ ۔ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۹ء

حواشی۔ یہ غزل روزگار ص ۲۴۶-۲۴۵ سے لی گئی ہے جہاں سے اسے باقیات میں نقل کیا گیا۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں۔ اس کے رنگ کی بنا پر اندازے سے یہاں رکھ دیا ہے

علہ عشق نے ہم کو نکما کر دیا ؎ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے (غالبؔ)

غزل (منسوخ)

یہ جوانی کے ولولے اے دل — دو گھڑی کے اُبال ہوتے ہیں
میری فرقت میں تم مرو؟ توبہ! — یہ حسینوں کے جال ہوتے ہیں
زور تم اپنی کم سنی پہ نہ دو — سب حسیں خورد سال ہوتے ہیں
ہائے وہ مار ڈھیلے ہاتھوں کی — کس مزے کے ملال ہوتے ہیں
ذکر کچھ آپ کا بھی ہے اُن میں — قبر میں جو سوال ہوتے ہیں
اُف یہ نازک مزاجیاں تیری! — بات میں سو ملال ہوتے ہیں
جن کی سیرت بھی دل کو بھڑکا دے — وہ حسیں خال خال ہوتے ہیں
عاشقوں سے یہ پوچھتا ہے کوئی — "کس طرح پائمال ہوتے ہیں؟"

شاعرؔ، اقبال سے نہ ہوں حیراں
آدمی با کمال ہوتے ہیں

حاشیہ۔ روزگار کی اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ اس کے رنگ کی بنا پر اندازے سے یہاں رکھ دی گئی ہے۔

غزل (منسوخ)

تیرے مریض کو تپِ فرقت ہے کیا لگی — اس کو دُعا لگی نہ کسی کی دوا لگی
کرتی ہے شمع اس رُخِ روشن سے ہمسری — لو اس زباں دراز کو بھی اب ہوا لگی
برباد کر رہی ہے جو یہ آشیاں مرا — صیّاد! تیرا ہاتھ بٹانے صبا لگی
زخمِ جگر جو بھے شبِ فرقت میں ہم سخن — چپکے سے چاندنی پسِ دیوار آ لگی

پھوٹا ہے سر مرا تو جنوں تیرا کیا گلہ
قسمت ہی اینٹ بن کے ہے ماتھے پہ آ لگی

تنگ آ کے اس کو بھی تری گالی سمجھ لیا
تیری خبر ہمیں جو نہ اے بے وفا لگی

مشاطہ! باندھ کس کے حنا بند اس قدر
بولیں بگڑ کے "واہ یہ اچھی حنا لگی"

خونِ رقیب نے اسے بے آبرو کیا
تیغِ نگاہِ یار مجھے کیوں نہ آ لگی

زندہ کیا جو لب نے تو مارا نگاہ نے
یعنی بقا کے ساتھ ہے قیدِ فنا لگی

اقبال گر یہی ہیں حسد کی بناوٹیں
جانے، مشاعرے میں[۱]، ہماری بلا، لگی

حاشیہ۔ اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ اس کے رنگ کی بنا پر یہاں رکھ دیا ہے۔

[۱] اس مصرع کی نثر ہوگی: مشاعرے میں ہماری بلا جانے لگی۔ کس غضب کی تعقید ہے۔

غزل (منسوخ)

خارِ صحرا نہ سہی، دشت کے پتھر ہی سہی
میرا چھالا نہیں پھوٹا تو مقدر ہی سہی

روزِ محشر کوئی مے خوار نشے میں بولا
مۓ احمر نہیں ملتی ہے تو کوثر ہی سہی

حشر کے روز مرا دشتِ جنوں کہتا ہے
اب کہاں جائیں، چلو دامنِ محشر ہی سہی

تیغِ ابرو جو نہیں ہے تو رگِ جاں کے لیے
مژۂ یار کا چبھتا ہوا نشتر ہی سہی

مجھے[۱] صیاد تہِ دام پھڑک جانے دے
میں نہ گلشن[۲] میں رہوں گا تو مرے پر ہی سہی

لوگ کہتے ہیں کہ مشکل ہے عدم کی منزل
جیتے جی کاٹ تو لی، کیا ہوا، مر کر ہی سہی

کس کو یاد آؤں گا میں حشر کے ہنگامے میں
میرا دفتر ہے گناہوں کا تو، دفتر ہی سہی

اُن کو کافر جو کہیں ہم تو یہ ملتا ہے جواب
'تم کو اسلام مبارک ہو، میں کافر ہی سہی'

جب کہا آپ ستم گر ہیں، فرماتے ہیں
'آپ کہتے ہیں ستم گر تو ستم گر ہی سہی'

شعر[۳] اقبال کو آتا نہیں کہنا لیکن
تم[۴] جو کہتے ہو سخنور تو سخنور ہی سہی

حاشیہ۔ اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ اس میں ابتدائی غزلوں سے زیادہ پختگی

اور چُستی ہے ۔ ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء کی ہونی چاہیے مشاعرے میں اس کے مقطع نے لوگوں کو چونکا دیا تھا۔

عا اس مصرع کی بندش ناقص ہے۔ صحیح اور مکمل ترتیبِ الفاظ یوں ہوتی۔

میرا دفتر گناہوں کا ہے تو گناہوں کا دفتر ہی سہی

دوسرے جزو میں عجزِ بیان کے باعث 'گناہوں کا' چھوٹ گیا۔

غزل (منسوخ)

میرے تپِ دروں کا بیاں قصہ خواں نہ ہو — شعلے کی بھی زباں ہو تو ممکن بیاں نہ ہو
پوشیدہ اس میں طرزِ جفائے بتاں نہ ہو — اے دل شکایتِ ستمِ آسماں نہ ہو
مدِّ نظر جو دانۂ خالِ بتاں نہ ہو — یوں صبح اُٹھ کے شیخ بھی تسبیح خواں نہ ہو
لیلیٰ کے ناقے کو حرکت ساربان نہ ہو — جب تک کہ رُوحِ قیس بدن سے رواں نہ ہو
جنّت وہ کیا کہ جس میں ترا آستاں نہ ہو — سر رکھنے کو ذرا سی جگہ بھی جہاں نہ ہو
جانا تو در کنار، اگر قتل ہوں وہاں — تیری گلی سے خون بھی میرا رواں نہ ہو
تنکا کوئی ہوا نے قفس میں گرا دیا — صیّاد دیکھتا ہے خسِ آشیاں نہ ہو
کہتے ہیں آج غیر کی حسرت نکل گئی — اے دل نکل کے دیکھ، کہیں میری جاں نہ ہو
اے دُودِ آہ! بس کہ نہیں تابِ جَور اور — پیدا ہمارے سر پہ نیا آسماں نہ ہو
اے باغباں! چمن کا ہر اک برگ ہے دو نیم — صحنِ چمن میں دفن کوئی نیم جاں نہ ہو
حوروں کے ناز مجھ سے اُٹھائے نہ جائیں گے — مجھ ناتواں کا خلد میں، یارب! مکاں نہ ہو
جب آہ کا مزا ہے کہ پیدا دھواں نہ ہو

اقبال! کہہ رہے ہیں یہ میری غزل کے شعر
بے سود ہے کلام اگر قدرداں نہ ہو

حاشیہ ا۔ یہ غزل روزگار سے لی گئی ہے جہاں مقطع سے پہلے کے شعر کا مصرعِ اولیٰ موجود نہیں۔ ہوسکتا ہے یہ مصرعِ طرح ہو جس پر گرہ لگانے کا ارادہ ہو لیکن لگائی نہ گئی۔

غزل کا زمانہ معلوم نہیں لیکن بقولِ روزگار یہ ابتدائی دور کی ہے ۔

غزل (منسوخ)

جس کو شہرت بھی ترستی ہے وہ رسوا اور ہے
ہوش بھی جس پر پھڑک جائیں وہ سودا اور ہے

بن کے پروانہ ترا، آیا ہوں میں اے شمعِ طور!
بات پھر وہ چھڑ نہ جائے، یہ تقاضا اور ہے

جان دیتا ہوں تڑپ کر کوچۂ الفت میں میں
دیکھ لو تم بھی، کوئی دم کا تماشا اور ہے

اور کچھ اندھیر کر دیتا نہ اے نورِ سحر
ہجر کی شب ہے، ابھی مجھ کو تڑپنا اور ہے

یوں تو اے صیاد آزادی میں ہیں لاکھوں مزے
دام کے نیچے تڑپنے کا تماشا اور ہے

رنگِ اَو ادنیٰ میں رنگیں ہو کے اے ذوقِ طلب
کوئی کہتا تھا کہ لطفِ مَاخَلَقْنَا اور ہے

دیکھ اے ذوقِ تکلم یاں کوئی موسیٰ نہیں
جو مری آنکھوں میں پھرتا ہے وہ نقشہ اور ہے

شمع کو بھی یوں تو رلواتی ہے پروانے کی موت
حسرتیں روئیں جسے، وہ مرنے والا اور ہے

تم ہنسی میں سچ سمجھ بیٹھے، نہیں جاناں نہیں
وصل کیسا؟ اب مرے دل کی تمنا اور ہے

قیس پر یوں طعنہ زن ہوتی ہے لیلیٰ دشت میں
جس کے کانٹے دل میں چبھتے ہیں وہ صحرا اور ہے

بدگمانی تم کو ہوتی ہے مری ہر بات پر
ٹھہرو ٹھہرو! سنبھلو سنبھلو! یہ فسانہ اور ہے

یوں نہ کھُل کھیلو مری جاں اڈھب کی شوخی چاہیے
کوئی کیا سمجھے گا، دیکھو! اب زمانہ اور ہے

تیرے خنجر نے جگر ٹکڑے کیا، اچھا کیا
کچھ مرے پہلو میں لیکن چلبلا سا اور ہے

تاکتا پھرتا ہے جنسِ معصیت کو نقدِ عفو
تو نے کیا سمجھا ہے اے واعظ! یہ سودا اور ہے

وہ صفِ محشر میں کہتے ہیں مجھے پہچان کر
تم وہی اقبال ہو، لو میں نے جانا اور ہے

حاشیہ ۔ اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں ۔ اس کے رنگ اور روزگار میں اس کے وقوع کی بنا پر اسے یہاں جگہ دی گئی ہے ۔

غزل (منسوخ)

فتنے اٹھتے ہیں تیرے کوچے سے
یہ زمیں آسمان ہے گویا

بے حجابی بھی ہے تو ایسی ہے | جس میں پردے کی شان ہے گویا
ہے کشش پر مدار ہستی کا | عشق جانِ جہان ہے گویا
جب سے دل میں ہوا گزر تیرا | یہ مکاں لا مکان ہے گویا
کہتے ہیں دیکھ کر خموش مجھے | یہ بڑا کم زبان ہے گویا
عذرِ ناسازیِ مزاج نہیں | صبر کا امتحان ہے گویا
زندگانی کا اعتبار نہیں | آدمی میہمان ہے گویا
تم مرے دل میں رہتے سہتے ہو | یہ تمھارا مکان ہے گویا
عشق کی راہ و رسم اُلٹی ہے | یاں خموشی زبان ہے گویا

اہلِ دل ہی اسے سمجھتے ہیں
شعر دل کی زبان ہے گویا

حاشیہ: اس غزل کا پہلا شعر گلدستہ 'اصلاحِ سخن' جلد ۱ نمبر ۱ بابت جون ۱۹۰۷ء میں ایڈیٹر کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

"شیخ صاحب (اقبال) نے ایک مختصر سی غزل اس طرح پر ہمیں لاہور میں سُنائی تھی ایک شعر یاد آرہا ہے، وہی لکھ دیا گیا۔"

ایڈیٹر

وہاں سے لے کر بشیر الحق دیسنوی نے یہ شعر اور نوٹ تبرکاتِ اقبال ص ۲۲ پر دے دیا۔ بقیہ نو اشعار روزگار ص ۱۷۳ اور باقیات ص ۵۲۲ - ۲۲۴ پر دیے گئے ہیں۔ لگتا ہے ع یہ زمیں آسمان ہے گویا' مصرعِ طرح ہوگا۔ غزل میں ردیف 'گویا' جس طرح کئی اشعار میں بالکل حشو ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غزل ابتدائی دَور کی یعنی ۱۹۰۰ء سے پہلے کی ہوگی

نالۂ یتیم
(منسوخ)

آہ کیا کہیے کہ اب پہلو میں اپنا دل نہیں | بجھ گئی جب شمعِ روشن در خورِ محفل نہیں
اے مصافِ نظمِ ہستی! ہیں ترے قابل نہیں | ناامیدی جس کو طے کرلے یہ وہ منزل نہیں

ہائے کس منہ سے شریکِ بزمِ مے خانہ ہوں میں
ٹکڑے ٹکڑے جس کے ہو جائیں وہ پیمانہ ہوں میں

خارِ حسرت غیرتِ نوکِ سناں ہونے لگا یوسفِ غم زینتِ بازارِ جاں ہونے لگا
دل مرا شرمندۂ ضبطِ فغاں ہونے لگا نالۂ دل روشناسِ آسماں ہونے لگا

کیوں نہ وہ نغمہ سرائی رشکِ صد فریاد ہو
جو سرودِ عندلیبِ گلشنِ برباد ہو

پنجۂ وحشت بڑھا چاکِ گریباں کے لیے اشکِ غم ڈھلنے لگے پابوسِ داماں کے لیے
مضطرب ہے یوں یہ دلِ نالاں بیاباں کے لیے جس طرح بلبل تڑپتا ہے گلستاں کے لیے

لیں گے ہم ہنگامۂ ہستی میں اب کیا بیٹھ کر
روئیے جا کر کسی صحرا میں تنہا بیٹھ کر

قابلِ عشرت دلِ خوکردۂ حسرت نہیں در خورِ بزمِ طرب شمعِ سرِ تربت نہیں
زیرِ گردوں شاہدِ آرام کی صورت نہیں غیرِ حسرت، غازۂ رخسارۂ راحت نہیں

صبحِ عشرت بھی ہماری غیرتِ صد شام ہے
ہستیِ انساں غبارِ خاطرِ آرام ہے

ہے قیامِ بحرِ ہستی، جزر و مدِ امّید کا گاہے گاہے آ نکلتی ہے مسرّت کی ہوا
زندگی کو نورِ الفت سے ملی جس دم ضیا لے کے طوفانِ ستم ابرِ تغیّر آ گیا

ہے کسی کو کامِ دل حاصل، کوئی ناکام ہے
اس نظارے کا مگر خاکِ لحد انجام ہے

اے فلک! تجھ سے تمنّائے سعادت پروری ہر ستارہ ہے ترا داغِ دلِ نیک اختری
تو نے رکھّا ہے کسے حرماں نصیبی سے بری اے مسلماناں! فغاں از دورِ چرخِ چنبری

دوستی از کس نمی بینیم، یاراں را چہ شد؟
دوستی کے آخر آمد؟ دوستداراں را چہ شد؟

نطق کر سکتا نہیں کیفیتِ غم کو عیاں　　اس کی تیزی کو مٹا دیتے ہیں اندازِ بیاں
آ نہیں سکتی زباں تک رنج و غم کی داستاں　　خندہ زن میرے لبِ گویا پہ ہے دردِ فغاں
عجزِ گویائی ہے، گویا حکمِ قیدِ خامشی
محرمِ اظہارِ غم کو یہ سزا ملنے لگی

زخمِ دل کے واسطے ملتا نہیں مرہم مجھے　　اپنی قسمت کا ہے رونا صورتِ آدم مجھے
ظلِّ دامانِ پدر کا ہے زبس ماتم مجھے　　ہاں ڈبو دے، اے محیطِ دیدۂ پرنم مجھے
مضطرب اے دل! نہ ہونا ذوقِ طفلی کے لیے
تو بنا ہے تلخیِ اشکِ یتیمی کے لیے

سایۂ رحمت ہے تو اے ظلِّ دامانِ پدر!　　غنچۂ طفلی پہ ہے مثلِ صبا تیرا گذر
رہ نما ہے وادیِ عالم میں تو مثلِ خضر　　تو تو ہے اک مظہرِ شانِ کریمی سربسر
ہے شہنشاہی جو طفلی، تو ہما تاثیر ہے
تو نہ ہو تو زندگی اک قیدِ بے زنجیر ہے

عینِ طفلی میں ہلال آسا کمر خم کھا گئی　　صبحِ پیری کی مگر، بن کر یتیمی آ گئی
یادِ ناکامی اسے، کیا جانیے کیا سمجھا گئی　　شعلۂ سوزِ الم کو اور بھی بھڑکا گئی
دم کے بدلے میرے سینے میں دمِ شمشیر ہے
زندگی اپنی کتابِ موت کی تفسیر ہے

جوششِ صرصر سے ہے اے بحر! جولانی تری　　اور قمر کے دم سے ہے یہ ساری طغیانی تری
کوہ و دریا سے ہے قائم شانِ سلطانی تری　　اور شعاعِ مہر سے ہے خندہ پیشانی تری
نظمِ عالم میں نہیں موجود سازِ بے کسی
ہو گئی پھر کیوں یتیمی صیدِ بازِ بے کسی

کھینچ سکتا ہے مصوّر خندۂ گُل کا سماں　　اور کچھ مشکل نہیں اے برق! تیرا شوخیاں
صبح کا اختر نہیں کلکِ تصور پر گراں　　اور ہی کچھ ہیں مگر میرے تبسّم کے نشاں

یہ تبسم اشکِ حسرت کا نمک پروردہ ہے
دردِ پنہاں کو چھپانے کے لیے اک پردہ ہے

یادِ ایامِ سلف! تونے مجھے تڑپا دیا   آہ اے چشمِ تصور! تونے کیا دکھلا دیا؟
اے فراقِ رفتگاں! تونے یہ کیا سمجھا دیا   دردِ پنہاں کی خلش کو اور بھی چمکا دیا

رہ گیا ہوں دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر
کچھ مداوا اس مرض کا، اے دلِ ناکام! کر

آمدِ بوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ ارم   ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم
لذتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صبحدم   یا صدائے نغمۂ مرغِ سحر کا زیر و بم

رنگ کچھ شہرِ خموشاں میں جما سکتے نہیں
خفتگانِ کنجِ مرقد کو جگا سکتے نہیں

ہر گھڑی اے دل! نہ یوں اشکوں کا دریا چاہیے   داستاں جیسی ہو، ویسا سننے والا چاہیے
ہر کسی کے پاس یہ دکھڑا نہ رونا چاہیے   آستاں اس کو یتیمِ ہاشمی کا چاہیے

چشمِ باطن کی نظر بھی کیا سبک رفتار ہے
سامنے اک دم میں درگاہِ شہِ ابرار ہے

اے مددگارِ غریباں! اے پناہِ بےکساں   اے نصیرِ عاجزاں! اے مایۂ بےمایگاں
کاروانِ صبر و تحمل کا ہوا دل سے رواں   کہنے آیا ہوں میں اپنے درد و غم کی داستاں

ہے تری ذاتِ مبارک حلِ مشکل کے لیے
نام ہے تیرا شفا، دکھتے ہوئے دل کے لیے

بیکسوں میں تابِ جورِ آسماں ہوتی نہیں   ان دلوں میں طاقتِ ضبطِ فغاں ہوتی نہیں
کون وہ آفت ہے جو رہینِ بیاں ہوتی نہیں؟   اک یتیمی ہے کہ ممنونِ زباں ہوتی نہیں

میری صورت ہی کہانی ہے دلِ ناشاد کی
ہے خموشی بھی مری، سائل تری امداد کی

بزمِ عالم میں طرازِ مسندِ عظمت ہے تو   بہرِ انساں جبرئیل آیۂ رحمت ہے تو
اے دیارِ علم و حکمت! قبلۂ اُمّت ہے تو   اے ضیائے چشمِ ایماں! زیبِ ہر مدحت ہے تو

درد جو انساںؑ کا تھا وہ تیرے پہلو سے اُٹھا
قلزمِ جوشِ محبت تیرے آنسوؤں سے اُٹھا

آبِ کوثر تشنہ کامانِ محبت کا ہے تو   جس کے ہر قطرے میں سو موتی ہوں وہ دریا ہے تو
طور پر چشمِ کلیم اللہ کا تارا ہے تو   معنیِ یٰسیں ہے تو، مفہومِ اَوْ اَدنیٰ ہے تو

اس نے پہچانا نہ تیری ذاتِ پُر انوار کو
جو نہ سمجھا احمدِ بے میم کے اسرار کو

دل ربائی میں مثالِ خندۂ مادر ہے تو   مثلِ آوازِ پدر، شیریں تر از کوثر ہے تو
جس سے تاجِ عرش کو زینت ہو وہ گوہر ہے تو   از پئے تقدیرِ عالم صورتِ اختر ہے تو

زیبِ حسنِ محفلِ اشرافِ عالم تو ہوا
تھی مؤخر گرچہ آمد، پر مقدّم تو ہوا

تیرا رتبہ جوہرِ آئینۂ لولاک ہے   فیض سے تیرے رگِ تاکِ یقیں نم ناک ہے
تیرے سائے سے منور دیدۂ افلاک ہے   کیمیا کہتے ہیں جس کو تیرے در کی خاک ہے

تیرے نظّارے کا موسیٰ میں کہاں مقدور ہے
تو ظہورِ لن ترانی گوئے اوجِ طور ہے

دوپہر کی آگ میں وقتِ درو، دہقان پر   ہے پسینے سے نمایاں، مہرِ تاباں کا اثر
جھلکیاں امید کی، آتی ہیں چہرے پر نظر   کاٹ لیتا ہے مگر جس وقت محنت کا ثمر

"یا محمدؐ" کہہ کے اٹھتا ہے وہ اپنے کام سے
ہائے کیا تسکیں اسے ملتی ہے تیرے نام سے

وہ پناہِ دینِ حق، وہ دامنِ غارِ حرا   جو ترے فیضِ قدم سے غیرتِ سینا ہوا
وہ حصارِ عافیت، وہ سلسلہ فاران کا   جس کے ہر ذرّے سے اٹھی دینِ کامل کی صدا

فخرِ پابوسی سے تیری آسماں سا ہو گئی
یہ زمیں ہم پایۂ عرشِ معلّیٰ ہو گئی

نظمِ قدرت میں نشاں پیدا نہیں بے داد کا
شکوہ کرنا کام ہوتا ہے دلِ ناشاد کا
آ گرا ہوں تیرے در پہ وقت ہے امداد کا
سرفرازی چاہیے بدلہ مری افتاد کا
آ نہ سکتا تھا زباں تک بیکسی کا ماجرا
حوصلہ لیکن مجھے تیری یتیمی نے دیا

تھم ذرا بے تابیِ دل! کیا صدا آتی ہے یہ
لطفِ آبِ چشمۂ حیواں کو شرماتی ہے یہ
دل کو سوزِ عشق کی آتش سے گرماتی ہے یہ
روح کو یادِ الٰہی کی طرح بھاتی ہے یہ
ہاں ادب، اے دل بڑھا اعزاز مشتِ خاک کا
میں مخاطب ہوں جنابِ سیدِ لولاک کا

"اے گرفتارِ یتیمی! اے اسیرِ قیدِ غم!
تجھ سے ہے آرامِ جانِ سیدِ خیر الامم
ناامیدی نے کیے ہیں تجھ پہ کچھ ایسے ستم
چیرتا ہے دل کو تیرا نالۂ دردِ الم
تیری بے سامانیوں سے کیوں نہ میرا دل جلے
شرم سی آتی ہے تجھ کو بے نوا کہتے ہوئے

خرمنِ جاں کے لیے بجلی ترا افسانہ ہے
دل نہیں پہلو میں تیرے غم کا عشرت خانہ ہے
جس پہ بربادی ہو صدقے، وہ ترا ویرانہ ہے
سہم جائے جس سے فرحت وہ ترا کاشانہ ہے
کانپتا ہے آسماں تیرے دلِ ناشاد سے
ہل گیا عرشِ معظم بھی تری فریاد سے

خون رلواتا ہے تیرا دیدۂ گریاں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تو رہنِ غمِ پنہاں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تیرا حال بے ساماں مجھے؟
کیوں نظر آتا ہے تو مثلِ تنِ بے جاں مجھے
میری اُمت کیا شریکِ دردِ پیغمبر نہیں؟
کیا جہاں میں عاشقانِ شافعِ محشر نہیں؟

جس طرح مجھ سے نبوت میں کوئی بڑھ کر نہیں   میری اُمّت سے حمیت میں کوئی بڑھ کر نہیں
امتحانِ صدق وہمت میں کوئی بڑھ کر نہیں   تم مسلمانوں سے غیرت میں کوئی بڑھ کر نہیں

یہ دل وجاں سے خدا کے نام پر قربان ہیں
ہوں فرشتے بھی فدا جن پر یہ وہ انسان ہیں

انجمن لاہور میں ، اک حامیِ اسلام ہے   آسماں پر جس کا پیمانِ محبت نام ہے
جس کی ہر تدبیر تسکینِ دلِ ناکام ہے   جس کا نظارہ مرادِ چشمِ خاص و عام ہے

جمع ہیں عاشق مرے سب، ہند اور پنجاب کے
تو وہاں جاکر مری امّت کو یہ پیغام دے

جاکے یوں کہنا کہ اے گلہائے باغِ مصطفیٰ   تم سے برگشتہ نہ ہو جائے زمانے کی ہوا
عرصۂ ہستی میں از بہرِ حصولِ مدّعا   رشکِ صد اکسیر ہوتی ہے یتیموں کی دعا

یہ وہ جادو ہے کہ جس سے دیوِ حرماں دور ہو
یہ وہ نسخہ ہے کہ جس سے دردِ عصیاں دور ہو

یہ دعا میدانِ محشر میں بڑے کام آئے گی   شاہدِ شانِ کریمی سے گلے ملوائے گی
آتشِ عشقِ الٰہی سے تمھیں گرمائے گی   جو نہ موسیٰ نے بھی دیکھا تھا، تمھیں دکھلائے گی

جس طرح مجھ کو شہیدِ کربلا سے پیار ہے
حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

جوش میں اپنی رگِ ہمت کو لانا چاہیے   احمدی غیرت زمانے کو دکھانا چاہیے
بندشِ غم سے یتیموں کو چھڑانا چاہیے   مل کے اک دریا سخاوت کا بہانا چاہیے

کام بے دولت تہِ چرخِ کہن چلتا نہیں
نخلِ مقصد، غیرِ آبِ زر کبھی پھلتا نہیں

صیدِ شاہینِ یتیمی کا پھڑکنا اور ہے   نوک جس کی دل میں چبھتی ہو وہ کانٹا اور ہے
علتِ حرماں نصیبی کا مداوا اور ہے   دردِ آزارِ مصیبت کا مسیحا اور ہے

پھونک دیتا ہے جگر کو دل کو تڑپاتا ہے یہ
نسوزِ مہر و محبت سے مگر جاتا ہے یہ

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اسلام کی | پہلے رکھی ہے یتیموں نے بنا اسلام کی
کہہ رہی ہے اہلِ دل سے ابتدا اسلام کی | ہے یتیموں پر عنایت انتہا اسلام کی

تم اگر سمجھو تو یہ سو بات کی اک بات ہے
آبرو میری یتیمی کی تمھارے ہات ہے"

۲۴ فروری ۱۹۰۰ء

حواشی۔ ارشد گورگانی نے "انفعال" کے" والے شعر کی داد دے کر اقبال کا پہلی بار نوٹس لیا تھا۔ نالۂ یتیم سے بحیثیت شاعر اقبال پایۂ اعتبار کو پہنچے۔ عبداللطیف اعظمی نے اپنی کتاب "اقبال" دانائے راز" میں لکھا ہے کہ کئی کتابوں میں اس نظم کی تاریخ ۱۸۹۹ء لکھی ہے مثلاً ا سیرتِ اقبال از طاہر فاروقی ۲ ببلیوگرافی آف اقبال" خواجہ عبدالوحید ۳ اقبال کامل از عبدالسلام ندوی ۴ باقیاتِ اقبال طبع اوّل ۱۹۵۲ء ۵ ذکرِ اقبال از سالک ۶ فوق کا مضمون کشمیری میگزین ۱۹۰۹ء ۷ مضمون "اقبال اور انجمنِ کشمیری مسلمانان" مشمولہ ادبی دنیا لاہور" اقبال نمبر ۱۹۲۷ء وغیرہ۔

دوسرے لوگوں نے ۱۹۰۰ء لکھی ہے۔ اعظمی نے پیسہ اخبار لاہور کا ۳ر مارچ ۱۹۰۰ء یکم ذی قعدہ ۱۳۱۷ھ کا شمارہ دیکھا جس میں اس کی تفصیل دی تھی۔ اعظمی نے سہواً اخبار کی تاریخ ۳۰ مارچ درج کی ہے جو ۳ مارچ ہونی چاہیے کیونکہ یکم ذی قعدہ اسی کے مطابق ہے۔ نیز انجمن کی رپورٹ ایک ماہ کے بعد کیوں شائع ہوتی۔ انھوں نے سرودِ رفتہ" (۱۹۵۹ء) نہیں دیکھی جس میں انجمن کی ۱۹۰۰ء کی رپورٹ سے نقل کیا گیا ہے کہ اقبال نے یہ نظم انجمن کے پندرھویں سالانہ اجلاس میں ۲۴ فروری کو بعد نمازِ عصر

---

[1] ص ۱۱-۱۰

بڑھی۔ مولوی نذیر احمد دہلوی نے اس کی صدارت کی۔ انھوں نے ان الفاظ میں نظم کی داد دی:

"میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سنیں ہیں مگر واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی۔"[1]

اپنی مقبولیت کے سبب اگلے دن ۲۵ فروری کے اجلاس میں بھی یہ نظم شروع سے آخر تک پڑھوائی گئی۔ پہلے روز اس نظم کے پڑھنے کے دوران تین سو روپے سے اوپر چندہ ہوگیا اور نظم کی کل کاپیاں فروخت ہوگئیں۔ بعض کاپیاں چار چار روپے کو بکیں۔ ۱۹۰۰ء کے چار روپے کی قیمت ذہن میں رکھیے۔

آئینہ ایام اقبال میں اس نظم کی تاریخ ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء لکھی ہے جو صحیح نہیں۔

خدا حافظ

منشی محبوب عالم کے سفر یورپ پر الوداعی نظم

(منسوخ)

لیجیے حاضر ہے مطلعِ رنگیں
جس پہ صدقے ہو شاہدِ تحسیں

سوئے یورپ ہوئے وہ راہ سپر مفت میں ہو گیا ستم ہم پر
آنکھ اپنی ہے اشکِ خونیں سے غیرتِ کاسۂ مئے احمر
فتحِ ملکِ ہنر کو جاتے ہیں ہم رکابی کو آ رہی ہے ظفر
تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے کھینچ کر لے چلا ہے ذوقِ نظر
فخرِ انساں کا ہے تلاشِ کمال جستجو چاہیے مثالِ قمر

---

[1] روئداد انجمن حمایت اسلام بابت ۱۹۰۰ء ص ۳۶ بحوالہ سرود رفتہ ص ۹

خوب تاڑا ہے سیر کا موقع — نکتہ بیں چاہیے نگاہِ بشر
سیرِ دریا میں ہیں ہزار مزے — جس کو دکھلائے خالقِ اکبر
وہ سرِ شام بحر کی موجیں — مہر کا وہ خرام پانی پر
وہ سمندر بساط کی صورت — اور وہ موجوں کا کھیلنا چوسر
اور وہ چاندنی کہ بحر جسے — اوڑھ لیتا ہے صورتِ چادر
دی خبر آپ نے یہ کیا ناگاہ — چپکے چپکے چبھو دیا نشتر
دوستوں کا فراق قاتل ہے — درد اُٹھتا ہے صورتِ محشر
آنکھ میں ہیں، نہیں رواں لیکن — اشک اپنے ہیں مثلِ آبِ گہر
جائیے اور پھر کے آئیے گا — صورتِ بوئے نافۂ اذفر
اس طرح راہ آنکھ دیکھے گی — جوں موذّن کو انتظارِ سحر
بزمِ یاراں رہے گی یوں خاموش — جیسے چپ چاپ شام کو ہوں شجر
سرِ مژگاں پہ آ گئے آنسو — نکل آیا جو دل میں تھا مضمر
مدحِ احباب، فرضِ انساں ہے — لاؤں اس کے لیے میں خامۂ زر
یاں خموشی گناہ ہے ایسی — جس طرح کفر ہجوِ پیغمبر

یہ حضر آپ کو مبارک ہو
یہ سفر آپ کو مبارک ہو

آپ ہیں محوِ سیرِ دریائی — چشمِ احباب غم سے بھر آئی
رقص موجوں کا جا کے دیکھیں گے — بھیج دی ہے جہاز کو سائی
لطف اخبار کا جب آتا ہے — بزمِ یورپ سے ہو شناسائی
دمِ رخصت وہ گرم جوشی ہے — آتشِ عشق جس سے شرمائی
کسی کونے کو تاکتی ہے اسے — گرمیِ آفتاب جو لائی
لب سے نکلا کہ فی امان اللہ — فخر کرتی ہے تابِ گویائی
نشۂ دوستی چڑھا ایسا — شعر میں بھی ہے رنگِ صہبائی

آب آئینہ پر گراتے ہیں — بہ سلامت روی و باز آئی
عزمِ پنجاب ہو مگر جلدی — کہ نہیں طاقتِ شکیبائی
ہو نہ محبوب سے جدا کوئی — اے رگِ جانِ عالم آرائی
الغیاث اے معلمِ ثالث — دردِ فرقت سے جان گھبرائی
ایسی پڑیا کوئی عنایت ہو — دل سے اُٹھے کہ وہ شفا پائی
آگیا بحر، چپ رہو اقبال — خامہ کرتا ہے عذرِ بے پائی
توبہ کرلی ہے شعر گوئی سے — اس کی قیمت پڑی نہ اک پائی
شعر سے بھاگتا ہوں میں کوسوں — ہے یہ توحید اور میں عیسائی
آں چہ دانا کند، کند ناداں — لیک بعد از ہزار رسوائی

دوستوں کی رہے دعا حافظ
ہو سفر میں ترا خدا حافظ

۲۵ مئی ۱۹۰۰ء

حواشی: منشی محبوب عالم مالکِ پیسہ اخبار لاہور کے سفرِ یورپ پر جانے سے قبل ۲۵ مئی ۱۹۰۰ء کو ایک الوداعی پارٹی ہوئی جس کی روداد پیسہ اخبار میں شائع ہوئی اور بعد میں محبوب عالم کے سفرنامۂ یورپ[1]، بلادِ روم و شام و مصر، س ن ۔ لاہور ۱۹۰۸ء میں شامل ہوئی۔ پارٹی میں تقریریں ہوئیں، ایک شاعر احمد[2] حسین خاں نے نظم سنائی، محبوب عالم نے شکریہ ادا کیا اور بعد میں کھانا پینا ہوا۔ آخر میں حاضرین گھروں کو جانے لگے۔ جب پندرہ بیس آدمی باقی رہ گئے تو اقبال نے کہا کہ وہ بھی اس موقع کے لیے ایک نظم لکھ کر لائے ہیں اور اسے سنانا چاہتے ہیں۔

اس بات کا افسوس رہا کہ انھوں نے بھرے جلسے میں نظم کیوں نہ پڑھی۔

---

[1] بہ حوالہ تبرکاتِ اقبال ص ۵۹

[2] جلسے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو رختِ سفر طبع دوم نومبر ۱۹۷۷ء ص ۱۸۱ تا ۱۸۴

بہر حال نظم سنائی گئی۔ حیرت ہے کہ اقبال جیسے شاعر کو اتنا حجاب کیوں تھا کہ خاص موقع کے لیے لکھی ہوئی نظم جلسے میں نہ سنا سکے، بالخصوص اس صورت میں جب کہ ایک اور شاعر نے نظم سنائی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ احمد حسین خاں کی نظم شاعرانہ اعتبار سے بہتر تھی جس کی وجہ سے اقبال نے اس وقت اپنی نظم کو پی جانا مناسب سمجھا ہو۔ بعد میں جلسے کی روداد کے ساتھ اقبال کی نظم پیسہ اخبار میں بھی چھپی اور ۱۹۰۸ء میں منشی محبوب عالم کے سفرنامے میں بھی۔ یہ نظم ترکیب بند ہے لیکن اس میں اقبال نے یہ جدّت کی ہے کہ پہلے بند سے بھی پہلے یعنی ابتدائے نظم میں ٹیپ کی ایک بیت ٹانک دی ہے۔ اس کے بعد دو بندوں کے آخر میں حسبِ معمول ایک ایک بیت ہے اس طرح دو بندوں میں ٹیپ کی ابیات تین ہیں۔

ع۱ یہ مصرع نواب مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق کا ہے۔ محبوبہ الوداعی ملاقات میں اشعار پڑھتی ہے۔

ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے | تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ہوتے آفت کے ہیں یہ پرکالے | تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

ع۲ اس مصرع میں 'ایسے' ہونا چاہیے، ایسی کا مقام نہیں۔ شعر کی نثر ہو گی:
یاں خموشی ایسے (بہ معنی اس طرح) گناہ ہے جس طرح ہجوِ پیغمبر کفر ہے)

ع۳ محبوب سے مراد منشی محبوب عالم ہیں۔ دوسرے مصرع میں 'عالم' کا لفظ بھی لے آئے ہیں۔

ع۴ سرودِ رفتہ کی صراحت کے مطابق معلم ثالث سے مراد حکیم بوعلی سینا ہے کیونکہ معلمِ اوّل ارسطو اور معلم ثانی حکیم ابونصر فارابی تھا۔ فرہنگ آصفیہ جلد چہارم ص ۳۷۴ کے مطابق بھی انھیں تینوں حکما کو اسی ترتیب سے معلم قرار دیا ہے چونکہ بوعلی سینا بہت بڑے طبیب بھی تھے اس لیے شاعر نے ان سے دوا پڑیا طلب کی ہے۔

ع۵ اس مصرع کے معنی سمجھ میں نہیں آئے۔ خود کو عیسائی کیوں کہا۔ عیسائیت کی خصوصیت

تثلیث پر عقیدہ ہے ۔ شعر توحید کیوں ہے ؟ اس میں دو مصرعے ہوتے ہیں۔ خود کو توحید سے کیوں مبرّا کر لیا اور تثلیث کو کیوں پسند کیا ۔ ایسا لگتا ہے کہ عیسائی کے قافیے کو کسی نہ کسی طرح باندھ دیا ہے گو اس سے شعر دولخت ، بلکہ بے معنی کیوں نہ ہو جائے ۔

؎ فارسی کا مشہور شعر ہے جس کے دوسرے مصرع میں قافیے کی خاطر ترمیم کر لی ہے اصل مصرع یہ ہے ۔ ع لیک بعد از خرابی بسیار

شمعِ ہستی
(مثنوی)

۱

اے شمعِ ہستی ! اے زندگانی — بھاتی ہے دل کو تیری کہانی
ہے کوچ تیرا ؎ ہر لمحہ جاری — جاتی ہے بگٹٹ تیری سواری
بجلی سے بڑھ کر بیتاب ہے تو — یا واہمہ ہے یا خواب ہے تو
کیوں چپ چپاتے ہر دم رواں ہے — آئی کہاں سے جاتی کہاں ہے
ظاہر ہیں یوں تو سب پر ترے گُن — لیکن نہ پایا تیرا اسروئن ؎
گزرا کوئی اس ہفت خواں سے — جاہل ہیں تیرے سرِّ نہاں سے
فی الجملہ ؎ ہمت سب ہار بیٹھے — ہیں سر بہ زانو ناچار بیٹھے

۲

اے زندگانی ! اے شمعِ ہستی — سونی پڑی تھی تجھ بن یہ بستی
چاروں طرف تھی چھائی اندھیری — ناگاہ اٹھی اک ڈیک ؎ تیری
وہ ڈیک تھی بس نورٌ علیٰ نور — کاہے کو رہتی پردے میں مستور
پھولوں میں جھلکی تاروں میں چمکی — بخشی جہاں کو رونق ارم کی
ہوتا نہ یاں جو تیرا ٹھکانا — چوپٹ ہی رہتا یہ ؎ کارخانا
کیا پھونک ماری دنیا کے تن میں — گویا لگا دی دَون ؎ خشک بن میں

بزمِ جہاں میں رونق ہے تجھ سے
اس میکدے میں رونق ہے تجھ سے
ہے تیرے دم سے اے عالم آرا
بزمِ عروسی آفاق سارا
سرگرم ہے تو جادوگری میں
ہیں تیرے عشوے خشکی تری میں
مٹی کا جوبن تو نے نکھارا
دے دے کے چھینٹے اس کو نکھارا
بے حس کو بخشا احساس تو نے
دی مشتِ گل کو بوباس تو نے
تھی بھولی بھالی، بھونڈی، بہنگم
تو نے سکھایا اس کو خم و چم
کرتب سے تیرے سانچے میں ڈھل کر
کندن سی نکلی رنگت بدل کر
ٹھکرا کے تو نے جو کہہ دیا قُم
اُٹھ بیٹھی فوراً کرتی تبسم
بھولی ہے اپنی اوقات پہلی
پھرتی ہے خوش خوش کیا اہلی گہلی

۴

باقی ہے خلقت جو تیری آہٹ
ہوتی ہے پیدا اک گُدگُداہٹ
مچتا ہے پھر تو اودھم غضب کا
بجتا ہے ڈنکا عیش و طرب کا
کہتی ہے دنیا، تو ہے تو کیا غم
تو آئے نت نت، تو آئے جَم جَم
جیتے ہیں جب تک، مرتے ہیں تجھ پر
سب کچھ تصدق کرتے ہیں تجھ پر
کیا مال ہے جو تیرے سوا ہے؟
تو ہی نہ ہو تو سب پردھا ہے

۵

اے سب کی پیاری! سب کی چہیتی!
کہہ منھ زبانی کچھ آپ بیتی[۳]
"قدرت کے گھر کی میں لاڈلی ہوں
ناز و نعم سے برسوں پلی ہوں
تقویمِ احسن میرا لگن ہے
فردوسِ اعلیٰ میرا وطن ہے
حور و مَلک کی آبادیاں تھیں
بے فکریاں تھیں، آزادیاں تھیں
چلتی تھی ہر دم بادِ بہاری
شیر و عسل کی نہریں تھیں جاری
میری ادا پر مرتے تھے قدسی
سجدے پہ سجدہ کرتے تھے قدسی

تکریم میری ہوتی تھی از حد　　ہیں داستانیں جن کی زباں زد
پھر دیس چھوٹا، گزری سو جھیلی　　پردیسیوں کا اللہ بیلی
پل مارنے کا ہے یاں بسیرا　　حبِّ وطن ہے ایمان میرا

۶

آب و ہوا میں دشت و جبل میں　　میری رسائی ہے ہر محل میں
لیکن یہاں میں خلوت نشیں ہوں　　ہوں اس طرح پر، گویا نہیں ہوں
خوابِ گراں کی حالت ہے طاری　　مستی میں گم ہے سب ہوشیاری
جب آتے آتے سبزے میں آئی　　کروٹ بدل کر میں لہلہائی
انگڑائیاں لیں، منھ کھول ڈالا　　پھر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا
داخل ہوئی جب حیواں کے تن میں　　اک شور اٹھا اس انجمن میں
انساں کا جامہ جب میں نے پہنا　　اللہ رے میں! کیا میرا کہنا

کس کس جتن سے میں نے بنایا　　رتبہ بہ رتبہ پایہ بہ پایہ
جامد کو نامی ۔ نامی کو حیواں　　حیواں کو وحشی، وحشی کو انساں
پھیلایا میں نے کیا کیا بکھیڑا　　شادی و غم کے ارگن کو چھیڑا
نیکی بدی کے میلے جمائے　　کھوٹ اور سچ کے سکے چلائے
جو ناچ میں نے جس کو نچایا　　وہ ناچتے ہی اس کو بن آیا
القصہ ہوں میں وہ اسمِ اعظم　　ہے جس کے بس میں تسخیرِ عالم
کچھ کچھ کھلے ہیں انداز میرے　　دیکھے ہیں کس نے اعجاز میرے
مجھ کو نہ سمجھو تم آج کل کی　　ہوں موجِ مضطر بحرِ ازل کی
رکھوں گی جاری یوں ہی سفر میں　　قصرِ ابد کی لوں گی خبر میں
ہے میری ہستی اک طرفہ مضموں　　کچھ بھی نہیں ہوں، پر میں ہی میں ہوں

سنتے رہوگے میری کہانی
جب تک ہے باقی دنیائے فانی

حواشی۔ یہ نظم سب سے پہلے رسالہ معارف علی گڑھ زیرِ ادارتِ وحیدالدین سلیم بابت ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔

ع۱ہ ’ڈیک‘ کے معنی معلوم نہ ہوسکے۔ یہ لفظ لغات میں بھی نہ مل سکا۔

ع۲ہ ’دون‘ بمعنی آگ

ع۳ہ پانچویں بند کے پہلے شعر کے بعد سے آخر تک ’زندگی‘ بول رہی ہے اس لیے میں نے واوین لگا دیے ہیں۔ بہتر یہ ہوتا کہ تاکہ پانچویں بند کا پہلا شعر چوتھے بند کے آخر میں لگا دیا جاتا۔ اس طرح پورا پانچواں بند اور چھٹا بند زندگی کے قول پر مشتمل ہوتا۔ میں نے یہ تقسیم تو نہیں کی کیونکہ شاعر کی ترتیب میں مجھے ترمیم کا حق نہیں تھا۔

غزل (منسوخ)

سمجھ میں آگئی تیرے پہیلی راز قدرت کی ——— مگر یہ بھی کبھی سوچا ہے تو خود بھی پہیلی ہے
نکل جائیں گے لے ذوقِ طلب! ارماں ترے سارے ——— نمائش گاہِ ہست و بود میں ہر شے پہیلی ہے
یہ شعلوں میں پلی ہے بجلیوں کے ساتھ کھیلی ہے
میں اے اقبال! دق آیا ہوں ان اردو نویسوں سے ——— جو ہو اخبار روزانہ تو کہتے ہیں کہ ڈیلی ہے

حاشیہ: غزل کے یہ ساڑھے تین اشعار سب سے پہلے روزگار ص ۲۷۵ پر دیے گئے جہاں سے لے کر انھیں باقیات ص ۵۷۸ میں شامل کیا گیا تیسرے شعر کا مصرعِ اولے موجود نہیں۔ دوسرے مصرع کی چستی اس پر دال ہے کہ یہ کسی مشاعرے کا مصرعِ طرح ہے۔ اقبال نے اسے بیاض میں لکھا ہوگا تاکہ اس پر گرہ لگا سکیں۔ مقطع میں انگریزی قافیہ ڈیلی کو کسی نہ کسی طرح استعمال کرلیا گیا ہے۔

اس نامکمل غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ اندازے سے اسے ابتدائی دور کے

کلام میں جگہ دے دی گئی ہے۔

قطعاتِ تاریخِ طباعت

مثنوی عقدِ گوہر یعنی موتیوں کا ہار

تصنیف پیرزادہ محمد حسین صدیقی. جج ہائی کورٹ جموں و کشمیر

(منسوخ)

میرے مخدومِ مکرم نے لکھی ایسی کتاب — شاہدِ لیلائے عرفاں کا جسے محمل کہیں
ہے مصنف نخل بندِ گلشنِ معنی اگر — مزرعِ کشتِ تمنا کا اسے حاصل کہیں
از پئے تاریخ ہاتف نے کہا اقبال کو
زیب دیتا ہے اگر "مرغوبِ اہلِ دل" کہیں
۱۳۱۰ھ

روح، فردوس میں، رومی کی دعا دیتی ہے — آپ نے خوب کیا، خوب کہا، خوب لکھا
دردمندانِ محبت نے اسے پڑھ کے کہا — نقشِ تسخیر پئے طالب و مطلوب لکھا
ہاتفِ غیب کی امداد سے ہم نے اقبال
بہرِ تاریخِ اشاعت "سخنِ خوب" لکھا
۱۳۱۰ھ

بزمِ سخن میں اہلِ بصیرت کا شور ہے — یہ نظم ہے کہ چشمِ فصاحت کا نور ہے
میں نے کہا یہ دل سے کہ اے مایۂ ہنر — تاریخِ سالِ طبع کا لکھنا ضرور ہے
ہاتف نے دی صدا سرِ اعدا کو کاٹ کر
"حقا یہ نظم موجِ شرابِ طہور ہے"

۱۹۰۱ - ۱ = ۱۹۰۰ء

غیرتِ نظمِ ثریا ہے یہ نظمِ دل کش   خوبیِ قول اسی نظم کی شیدائی ہے
فکرِ تاریخ میں سرگرمیاں جو ہوا   کہہ دیا دل نے "یہ خضرِ رہِ دانائی ہے"

۱۹۰۱ء

حواشی: پیرزادہ محمد حسین نے مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ کیا اور اس کا نام مثنوی عقدِ گوہر یعنی موتیوں کا ہار رکھا۔ اقبال نے اس کی تاریخِ طباعت کی چھ تاریخیں کہیں، چار اُردو میں اور دو فارسی میں۔ یہ باقیاتِ اقبال طبع سوم ۱۹۷۸ء سے نقل کی گئی ہیں۔ دو فارسی تاریخوں سے ۱۳۱۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ دو اُردو تاریخوں سے ۱۳۱۸ھ۔ ایک اُردو تاریخ سے ۱۹۰۰ء اور دوسری سے ۱۹۰۱ء برآمد ہوتا ہے۔ ۱۳۱۷ھ کے پہلے آٹھ مہینے برابر ہیں ۱۸۹۹ء کے اور آخری چار مہینے ۱۹۰۰ء میں آتے ہیں۔ ۱۳۱۸ھ کے پہلے آٹھ مہینے ۱۹۰۰ء میں آتے ہیں اور بعد کے چار مہینے ۱۹۰۱ء میں۔ اس طرح کتاب کی تاریخِ طباعت ۱۳۱۷ھ کے آخری چار مہینوں اور پورے ۱۳۱۸ھ میں ممکن ہے۔ عیسوی سنہ میں کہہ سکتے ہیں کہ پورے ۱۹۰۰ء میں اور اگلے سال ۱۹۰۱ء کے پہلے چار مہینوں میں۔ گویا عرصۂ اشاعت ۱۶ مہینوں کو محیط ہے دو ہجری اور دو عیسوی سنہ کیوں؟ جناب کسریٰ منہاس نقوشِ اقبال نمبر[۱]، سنہ ۱۹۷۷ء کے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"قیاس واثق ہے کہ مصنف نے پہلے ۱۳۱۷ھ و ۱۹۰۰ کو اس کتاب کی تاریخ کے لیے احباب کو لکھا ہو گا اور بعد میں ۱۳۱۸ اور ۱۹۰۱ء کے لیے۔ احباب نے دونوں سنین کہہ کر بھیج دیے ہوں گے۔"

منہاس صاحب نے عقدِ گوہر کے آخر سے ایک ہی صفحے پر دو دوسرے حضرات کے قطعاتِ تاریخ لکھے ہیں جن میں پہلے سے ۱۳۱۷ھ اور دوسرے سے ۱۳۱۸ھ نکل رہا ہے۔ اقبال نے فارسی کی ایک تاریخ یہ نکالی ہے۔

سروشِ دل رقم زد بہرِ تاریخ   خیابانے زبستانِ عجم، کرد

۱۳۱۷ھ

---

[۱] اقبال اور تاریخ گوئی۔ نقوشِ اقبال نمبر، شمارہ ۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۳۹۳

راقم الحروف نے حساب لگا کر معلوم کیا کہ اس سے محض ۱۳۰۷ھ نکلتے ہیں۔ اگر 'بستانِ عجم' لکھا جائے تو مطلوبہ اعداد حاصل ہو جائیں گے۔ لیکن یہ معنوی صحت کے خلاف ہو گا۔ بعد میں کسریٰ منہاس صاحب کا مضمون دیکھا تو صفحہ ۲۹۲ پر انھوں نے بھی یہی لکھا تھا۔

ع۱ اس تاریخ میں اعدا کے سر الف کے ایک عدد کا تخرجہ ہے۔

ع۲ 'یہ خضرِ رہ دانائی ہے' کے نیچے باقیات طبع سوم ص ۴۸۱ پر ۱۹۰۰ء لکھا ہے حالانکہ دراصل اس سے ۱۹۰۱ء نکلتا ہے چنانچہ منہاس صاحب نے اپنے مضمون میں اس کے ۱۹۰۱ء اعداد ہی لیے ہیں۔ وہ مزید یہ کہتے ہیں کہ ی سے پہلے کے ہمزہ کو بھی ی شمار کر کے اس کے دس اعداد لیے جاتے ہیں جس سے فقرۂ تاریخ میں دس عدد بڑھ جائیں گے اس لیے اس مصرع میں دانائی کو بدون ہمزہ 'دانای' لکھنا چاہیے۔

غزل (منسوخ)

پاس ہیں اور ڈھونڈتے ہیں اسے — کتنے غافل جہاں والے ہیں
دب کے رہتے نہیں کسی سے بھی — جو زمانے میں آن والے ہیں
میرے دل کے مکان میں رہنا! — آپ تو لامکان والے ہیں
کہہ رہے ہیں ملک" یہ اہلِ زمیں — کتنی اُونچی اُڑان والے ہیں"
تجھ کو اقبالؔ ان سے کیا نسبت
دلّی والے زبان والے ہیں

حاشیہ: روزگار کی اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ اندازے سے یہاں جگہ دے دی ہے۔ عبداللہ قریشی کے بموجب مقطع شاید اس زمانے کا ہے جب داغؔ نے دعویٰ کیا تھا۔

لہ معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۳۰

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

غزل (منسوخ)

تم نے آغازِ محبت میں یہ سوچا ہوگا
کس طرح کا یہ نیا چاہنے والا ہوگا

تم نے سمجھا تو ہے اس گھر کو ہمارا لیکن
اب ہمارا ہے کوئی دن میں تمھارا ہوگا

حشر میں کچھ تو تمھیں حسن پہ ہو گی اُمید
کچھ مرے شکوہ نہ کرنے کا بھروسا ہوگا

گھر میں بیٹھے ہیں، خدا رکھے کہ باہر ہی کہیں
نامہ بر یہ بھی کسی نے تجھے پوچھا ہوگا

نامہ بر! کام تو باتوں میں ہوا کرتے ہیں
مان جائیں گے اگر تجھ کو سلیقہ ہوگا

ہاں سنا پہلے ہمیں، ان کو کہے گا کیا کیا
نامہ بر! ہم جو بتائیں، وہی کہنا ہوگا

ہم کہیں جائیں، کسی کام کو جائیں لیکن
دل یہ کہتا ہے اسی رہ سے گزرنا ہوگا

تیرے اشعار میں اقبال! یہ رنگت تو نہیں
تو نے کم بخت کسی شوخ کو تاکا ہوگا

حاشیہ: سرود میں اس کا ماخذ بہارِ گلشن جلد دوم مرتبہ فوق ۱۹۰۱ء دیا ہے۔
اس کے علاوہ بھی یہ کئی مجموعوں میں موجود ہے۔

غزل (منسوخ)

کجی جزوِ فطرت ہے اہلِ ستم کی
کبھی ہم نے خنجر کو سیدھا نہ دیکھا

بہت تو نے اے آنکھ دیکھے تماشے
جسے دیکھنا، دیکھنا تھا نہ دیکھا

ظہور و عدم اپنا مثلِ شرر تھا
یہ سمجھو کہ دنیا کو دیکھا، نہ دیکھا

اگرچہ پھرا میں بہت اس چمن میں
کسی نے مرا آنا جانا نہ دیکھا

حاشیہ: یہ غزل روزگار ص ۲۸۰ اور باقیات میں ص ۶۰۸ سے لی گئی ہے۔
اس کا زمانہ معلوم نہیں۔ اس کے رنگ کی بنا پر اسے یہاں جگہ دے دی گئی ہے۔

غزل (منسوخ)

گزر کس صنم کا ہوا بُت کدے میں — کہ بُت بن گئے آج سب برہمن بھی
تصور کی، اے دل! یہ سب خوبیاں ہیں — کہ غربت میں کرتا ہے سیرِ وطن بھی
حسیں ہم نے دیکھے ہیں دنیا میں لاکھوں — غضب ہے مگر آپ کا سادہ پن بھی
تصور کے کیونکر نہ قربان جاؤں — وصالِ وطن ہے فراقِ وطن بھی
مقدّر میں بلبل کے تھا قید ہونا — تہِ دام تو تھی زمینِ چمن بھی
بہار آئی وحشت کی ہے آمد آمد — گلے میرے ملنے لگا پیرہن بھی
مجھے نقدِ جاں[1] اپنی بھاری ہے یا رب! — رہِ عشق میں ہے کوئی راہزن بھی

یہی ہے جو شوقِ ملاقاتِ حضرت[2]
تو دیکھیں گے اک بار ملکِ دکن بھی

حاشیہ ۱: اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔
[1] اقبال نے نقد کو مونث باندھا ہے حالاں کہ عرفِ عام میں مذکر ہے۔ تانیث کی شکل میں نقدی ہو جاتا ہے۔
[2] حضرت سے مراد استاد داغ ہیں جو حیدر آباد میں مقیم تھے۔

چند متفرّق اشعار (منسوخ)

ان متفرق اشعار کا زمانہ معلوم نہیں لیکن یہ ابتدائی دور کے معلوم ہوتے ہیں۔

اقبال میرے نام کی تاثیر دیکھیے — میں جس کے ساتھ ہوں اُسے ممکن نہیں شکست

حاشیہ ۱: یہ شعر بیاضِ عماد، سرود ص ۲۱۱ اور باقیات ص ۵۰۳ پر ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے محمد اقبال، ایک ادبی سوانحِ حیات ص ۲۹ پر لکھا ہے کہ گیارہ بارہ سال کی عمر میں اقبال دیر سے اسکول میں پہنچے۔ ماسٹر صاحب کے وجہ دریافت کرنے پر جواب دیا "اقبال دیر ہی میں آتا ہے"۔ مندرجہ بالا شعر میں بھی نام پر اسی قسم کا فخر جھلکتا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ ابتدائے عمر کا ہوگا۔

رومال کے لباس میں ابر آکے بارہا پانی پیا کیا مری چشمِ زلال سے
(باقیات ص ۵۰۱)

گر اے شبِ سیہ تجھے حسرت ہے نام کی کچھ قرض مانگ لے مرے بختِ سیاہ سے
(سرود ص ۲۴۶)

حاشیہ: سرودِ رفتہ میں اس پر یہ نوٹ لکھا ہے۔
اقبال کے ایک ہم وطن میرا بخش صاحب جلوہ سیالکوٹی تھے جو عرضی نویسی کرتے تھے شعر بھی کہتے تھے اور انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اقبال نے یہ شعر بطورِ تفنن ان کے لیے کہا تھا۔ جلوہ صاحب کا رنگ خاصہ سیاہ تھا جس کی وجہ سے شعر ان پر خوب چسپاں ہوا۔

لوگ کہتے ہیں مجھے راگ کو چھوڑ و اقبال راگ ہے دین مرا، راگ ہے ایماں میرا

حاشیہ: دانائے راز از نذیر نیازی ص ۸۰ کے مطابق محمد دین فوق نے ۱۹۰۴ء میں یادِ رفتگاں کے نام سے صوفیہ کے حال میں ایک کتاب لکھی۔ اس میں سماع کے جواز میں اقبال کا یہ شعر درج کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ اقبال کی نظم 'زہد و رندی' میں ایک مصرع ہے 'سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل'
یادِ رفتگاں کی مزید تفصیل ملاحظہ ہو۔ رسالہ نقوش لاہور نمبر[۱] میں یادِ رفتگاں ہندو مسلم صوفیائے لاہور کا تذکرہ ہے۔ اس کے مقدمے میں فوق نے بحث کی ہے کہ راگ، سرود، سماع جائز ہے کہ نہیں اگر جائز ہے تو کن حالات میں۔

---

[۱] نقوش۔ لاہور نمبر شمارہ ۹۲۔ فروری ۱۹۶۲ء۔ ص ۱۰۰۲، ۱۰۰۱

عیشِ جوانی (منسوخ)

اے شبابِ رفتہ! اے آرامِ جانِ بے قرار
کتنے دل کش آہ، ظالم! تھے ترے لیل و نہار

ہائے وہ دن موجزن تھے دل میں جب ارمانِ وصل
ہائے وہ راتیں کہ تھیں جب صحبتِ بوس و کنار

اُف وہ رسوائی کا عالم جب دلِ آوارہ کو
تیر و نشتر سے تھے بڑھ کر پندِ ناصح ناگوار

کچھ عجب تسکیں فزا تھے، اُف وہ ایامِ نشاط
جوش پر اپنی جوانی کی تھی جب فصلِ بہار

ہلکی ہلکی بام پر نکھری ہوئی وہ چاندنی
ٹھنڈی ٹھنڈی روح افزا وہ نسیمِ خوش گوار

دل میں ارمانوں کا وہ مجمع، وہ بزمِ آرزو
وہ تپاکِ قلب سے اُف اُف زباں پر بار بار

وہ محبت کے مزے، وہ لطفِ شب ہائے وصال
چاندنی راتوں کا وہ منظر، وہ پھولوں کی بہار

بام پر اک ماہ سیما سے وہ سامانِ وصال
اک پری وش سے وہ ذوقِ لذتِ بوس و کنار

وہ نگاہِ نازِ سرمستِ مئے ریعانِ حسن
نیم باز آنکھوں میں وہ خوابِ جوانی کا خمار

ساعدِ سیمیں میں وہ پھولوں کے گجرے خوش نما
بھینے بھینے گردنِ نازک میں وہ بیلے کے ہار

ہلکا ہلکا اک دوپٹہ صندلی، زیبِ بدن
دوشِ نازک پر نزاکت سے وہ آنچل ناگوار

رُخ پہ بل کھائے ہوئے وہ آہ گیسوئے دراز
بکھری بکھری گورے گالوں پر وہ زلفِ مشکبار

نیچی نیچی آہ وہ نظریں، وہ اندازِ حجاب
نرگسِ مستانہ میں وہ سرمۂ دنبالہ دار

ہلکی ہلکی پان کی سرخی لبِ گل رنگ پر
وہ حنائی ہاتھ جن سے پنجۂ گل شرمسار

نشۂ جوشِ جوانی کی وہ مستانہ اُمنگ
جس طرح ہو کوئی سرمستِ ادا، مستِ خمار

گل سے رخساروں پہ قطرے یوں پسینے کے عیاں
جس طرح وقتِ سحر پھولوں پہ شبنم آشکار

ہائے وہ الھڑپنے کے دن، جوانی کا وہ بن
عنفوانِ حسن کا کم کم وہ سینے پر ابھار

بام میں وہ چاندنی میں شب کو خلوت کے مزے
لطفِ یک جائی کے ساماں، لذتِ بوس و کنار

بھینی بھینی عطر میں ڈوبی ہوئی بادِ نسیم
ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی کی وہ، آہ، کرنیں خوش گوار

میری جانب سے وہ پیہم عرضِ شرحِ آرزو
داستانِ عشق، رودادِ دلِ امیدوار

ضدِ ہم آغوشی، شوقِ نیم جامہ کو ادھر
اور اُدھر محوِ تغافل نازِ حسنِ پردہ دار

مل میں لب پر اُدھر عذرِ نزاکت کا گلہ
مسکرا کر مُنھ چھپا لینا اُدھر زیرِ نقاب
گوری گوری گردنِ نازک میں فرطِ شوق سے
وہ دلوں میں آہ، اک پیکانِ الفت کی خلش
وہ تبسّم ہائے پنہاں، وہ نگاہِ شرمگیں
ہائے وہ شب بھر شرابِ وصل کی سرمستیاں
پھیکا پھیکا لب پہ وہ بدرنگ لاکھا پان کا
دوش پر بکھرے ہوئے وہ لمبے لمبے سر کے بال
آہ وہ جھینپی ہوئی نظریں وہ شرمیلی ادا
حسرت اے شامِ جوانی، آہ اے شامِ وصال
آہ اے دورِ نشاطِ ہستیِ موہوم آہ
برق کی چشمک تھی ایامِ جوانی کی نمود
لطفِ یک جائی کے ساماں کچھ دنوں باہم رہے
خوش نہ آئی چرخ کو یہ صحبتِ لطف و نشاط
انقلابِ دہر نے لی ایسی کروٹ ناگہاں
اُٹھ گئے وہ آہ اگلے لطف و صحبت کے مزے
وہ دلِ زندہ کبھی تھا، آہ، جو جانِ نشاط
دردِ دل کی طرح ان آنکھوں میں اب شامِ فراق
لوٹتی تھیں جو کبھی شب کو بہارِ حسن آہ
نشہ کے ڈورے کہاں آنکھوں میں اب وہ سرخ سرخ
اب نہ ارمانوں کا جمگھٹ ہے، نہ وہ شوقِ وصال
اب کہاں ذوقِ ہم آغوشی کے وہ اگلے مزے
کس پہ تم بھولے ہوئے ہو آہ یارانِ نشاط

اضطرابِ دل سے یاں شکوہ زباں پر بار بار
اور ادھر ذوقِ تماشا کو نگاہیں بے قرار
ڈال دینا بڑھ کے باہیں، وہ مرا بے اختیار
عشق کے اک ناوکِ دلجو سے دو سینے فگار
نیچی نظروں سے چُرا لینا وہ دل، بے اختیار
صبح کو آنکھوں میں کم کم خوابِ نوشیں کا خمار
نیلے نیلے رخ پہ بوسوں کے نشاں وہ آشکار
اُبھرے سینے پر وہ کمھلائے ہوئے پھولوں کے ہار
شب کی کیفیت کا، جن سے رازِ پنہاں آشکار
تیرا دورانِ طرب تھا کس قدر ناپائیدار
کتنے سرگرمِ تگ و دو تھے ترے لیل و نہار
وصل کی سرگرمیاں تھیں شوخیِ رقص و شرار
اور نکالی مل کے چند سے حسرتِ بوس و کنار
رنگ لایا، آہ، آخر آسمانِ دوں شعار
وہ بساطِ عیش برہم ہو گئی پایانِ کار
صبر رخصت ہو گیا، جاتا رہا دل سے قرار
اس کا اب ہونے لگا، افسوس، مُردوں میں شمار
پھیلتی جاتی ہے بڑھ کر ظلمتِ شب ہائے تار
جو کسی کے چاند سے چہرے پہ رہتی تھیں نثار
خوں فشاں ہیں روز و شب اب دیدۂ خونابہ بار
لے رہا ہے چٹکیاں پہلو میں دردِ انتظار
ناتوانی سے ہے کروٹ بھی بدلنا ناگوار
ہونے والا ایک دن ہے عیشِ دنیا کا فشار

خندۂ گل ہے مگر ہنگامۂ لطف و طرب
چار دن کی آہ، مہماں ہے جوانی کی بہار

حواشی: یہ نظم نوادرِ اقبال سے لی گئی ہے جس کے آخر میں لکھا ہے۔
"ماخوذ از نیچرل شاعری مرتبۂ صفدر مرزا پوری - ہمدم پریس لکھنو۔"

یہ نظم باقیاتِ اقبال طبع سوم میں (ص ۵۱۷ تا ۵۲۳) بھی ہے جہاں ماخذ کے طور پر نیچرل شاعری کا حوالہ دیا ہے لیکن یہ بالیقین نوادر سے نقل کی گئی ہے۔ کیونکہ یہاں بھی نوادر کی غلطیاں دہرادی گئی ہیں۔ نیچرل شاعری کا ایک نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے اس کی تفصیلات مجھے لکھ کر بھیجیں۔ اس کے سرورق پر لکھا ہے۔

"نیچرل شاعری
جس میں ہند کے مشاہیر شعرائے نازک خیال کی چند نظمیں جذباتِ پاکیزہ کا انمول خزانہ، حسنِ فطرت کی نظر فریب تصویریں نہایت حسن و خوبی سے جلوہ طراز ہیں۔ مرتبۂ مشہور سخنور حضرات صفدر مرزا پوری۔ باہتمام مسٹر انیس احمد عباسی بی۔ اے ہمدم برقی پریس لکھنو میں چھپا۔"

تعدادِ صفحات ۵۶۔ سنہ اشاعت درج نہیں۔ ڈاکٹر سلیمان حسین کے مطابق یونیورسٹی کے لیے یہ کتاب غالباً ۱۹۲۴ء میں خریدی گئی تھی۔ اس میں ڈاکٹر اقبال ایم اے اور مسٹر اقبال ایم اے۔ بیرسٹر ایٹ لا کے نام سے حسب ذیل نظمیں شامل ہیں۔

۱ - پیامِ عشق۔ ص ۵۔۴
۲ - بغیر عنوان کے ص ۱۵۔۱۴ ع نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں میں نے
۳ - گلِ خزاں دیدہ ص ۱۶۔۱۵
۴ - عیشِ جوانی ص ۲۶ تا ۲۸
۵ - محبت ص ۲۹۔۲۸
۶ - رات اور شاعر۔ اس کا ماخذ 'پنجاب ریویو' درج ہے۔

ان میں نظم ۳ اور ۴ بانگ درا میں شامل نہیں ہیں۔ صفدر نے ان کا ماخذ درج نہیں کیا۔ ظاہراً کسی رسالے سے لی گئی ہوں گی۔

عیشِ جوانی ایک جنس زدہ نظم ہے جسے اقبال سے منسوب کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ اس میں ایسا مصرع بھی ہے ع ضدِّ ہم آغوشیِ شوقِ نیم جامہ کو ادھر غنیمت ہے کہ انھوں نے 'شوقِ بے پجامہ' نہیں لکھ دیا، لیکن در ایامِ جوانی چناں کہ افتد دانی' والا معاملہ ہے۔ یہ نظم نوجوانی کی یعنی ۱۹۰۰ء تک کی تخلیق رہی ہوگی۔ اقبال نے ۱۹۰۱ء میں اپنی نظم

ع ہم نچوڑیں گے دامن' میں بھی جسمِ نسوانی کا تجزیہ کیا ہے۔

ع یہ قامت، یہ عارض، یہ سینہ، یہ جوبن

ع جو دستِ حنائی سے دامن نچوڑا

پھر اس نظم کی ہیئت مطلع دار قطعے کی ہے۔ عام طور سے قطعے میں مطلع نہیں ہوتا لیکن اقبال نے اپنی کئی نظموں میں ایسا کیا ہے مثلاً شمعِ زندگانی میں۔ یہی ہیئت دوسری نظم گلِ خزاں دیدہ کی ہے۔ آخری شعر میں 'خندۂ گل' کا موضوع بھی اقبال پن لیے ہوئے ہے۔

گلِ خزاں دیدہ

(منسوخ)

خوشا وہ دن کہ میں آرائشِ صحنِ گلستاں تھا — خوشا وہ دن کہ میرے فرق[6] پہ تاجِ زرافشاں تھا
خوشا وہ دن کہ شوقِ جامہ زیبی تھا گلستاں میں[2] — شمیمِ ناز سے میرا معطّر جیبِ گریباں تھا
بہارِ جلوۂ حسنِ ازل تھا[1] پردۂ[3] گل میں — وہ جگنو تھا کہ کاشانہ فروزِ صحنِ بستاں تھا
نگاہیں بلبلِ گلچیں کی بڑے[4] ڈھب مجھ پہ پڑتی تھیں — بہارِ حسن تھی، جوشِ شباب فتنہ ساماں تھا
صبا گہوارہ[5] جنباں، قصّہ گو بانگِ عنادل تھی — مرا چھوٹا سا بسترِ خوابِ آسائش کا ساماں تھا
فضائے لالہ و ریحان و گل پریوں کی محفل تھی — نسیمِ صبح کا جھونکا جو تھا تختِ سلیماں تھا

ترنّم ریز تھا شاخوں پہ میرے طائرِ سدرہ ۔۔۔ چمن کا میرے مست آموز، اک مرغِ غزل خواں تھا
جوابِ خطۂ کشمیر میرا کنجِ دلکش تھا ۔۔۔ بہارِ سبزہ و گل تھی، ہجومِ سرو و ریحاں تھا
ادھر سنبل کو تھا نازا اپنے گیسوئے مسلسل پر ۔۔۔ ادھر نرگس کو گلشن میں غرورِ چشمِ فتّاں تھا
کلی دوشیزۂ ناکتخدا تھی ایک گلشن میں ۔۔۔ شگوفہ جو چمن میں تھا، عروسِ گل بداماں تھا
موافق مجھ سے تھی آب و ہوائے دہر اے ہمدم! ۔۔۔ صبا تھی عطر آگیں، ابرِ رحمت گوہر افشاں تھا
نہ تھا یوں منتشر شیرازۂ جمعیتِ اجزا ۔۔۔ برنگِ بو نہ جھونکوں میں ہوا کے یوں پریشاں تھا
اِرم خانہ تھا مجھ کو آہ کنجِ دل نشیں میرا ۔۔۔ زمیں پر یوں نہ سیلی خوردۂ ریگِ بیاباں تھا
نہ یوں الجھے ہوئے تھے خارِ صحرا میرے دامن سے ۔۔۔ نہ یوں نُچ دیا ہوا ناخنوں میں ہر اک تارِ گریباں تھا
گلِ خنداں تھا میں بھی باغِ عالم کے مرقع میں ۔۔۔ نہ میں حسرت کا پتلا تھا نہ میں تصویرِ حرماں تھا
نہ یوں نالہ کشِ بیتابیِ دل تھا بیاباں میں ۔۔۔ نہ یوں شکوہ طرازِ گردشِ آشوبِ دوراں تھا
کہاں لائی اڑا کر آہ تو بادِ خزاں مجھ کو! ۔۔۔ کہیں خارِ بیاباں تھے، کہیں غولِ بیاباں تھا
یہ ہے افسانہ کل کا، کیا کہوں اے ہم نشیں! تجھ سے ۔۔۔ چمن میرا وطن تھا، میرا کاشانہ گلستاں تھا
بہارِ عالمِ نیرنگ تھی ہر پنکھڑی میری ۔۔۔ نہ تھا معلوم، رنگِ انقلابِ دہر پنہاں تھا
حقیقت کھل گئی دورِ خزاں آیا جو گلشن میں ۔۔۔ نہ تھا غازہ رخِ گل رنگ پر خونِ شہیداں تھا
مرا حسنِ تعیش سوز تھا رقصِ شرر گویا ۔۔۔ چمن میں میں گلِ شمعِ سرِ گورِ غریباں تھا
طلسمِ بے ثباتِ دہر تھا، رنگِ بقا میرا ۔۔۔ بساطِ گوشۂ مرقد، مری ہستی کا میداں تھا

تحیر زا تھا منظر آہ، اک باغِ ہستی کا
وجودِ عالمِ امکاں مگر خوابِ پریشاں تھا

حواشی :- یہ نظم بھی صفدر مرزا پوری کی کتاب نیچرل شاعری سے لی گئی ہے جہاں یہ ص ۱۶-۱۵ پر دی ہوی ہے۔ وہاں سے اسے نوادر میں نقل کیا گیا اور اپنے ماخذ نیچرل شاعری کا اعتراف کیا۔ یہ نظم باقیاتِ طبعِ سوم میں ص ۵۱۴ تا ۵۱۶ پر ہے۔ وہاں اس کا کوئی ماخذ نہیں دیا، لیکن ظاہرا یہ نوادر ہی سے نقل کی گئی ہوگی۔
اس نظم کا زمانہ معلوم نہیں۔ اندازے سے یہاں رکھ دی گئی ہے۔

ع۱۵ 'بہار' مونث ہے۔ اس کے ساتھ 'تھا' کے بجائے 'تھی' چاہیے تھا۔ نیچرل شاعری میں 'تھا' لکھا ہے
ع۲۵ 'میرے' کی جگہ 'میری' چاہیے۔ 'میری شاموں' کہیں گے نہ کہ 'میرے شاموں'

شمعِ زندگانی

(منسوخ)

اے شمعِ زندگانی کیوں جھلملا رہی ہے
شاید کہ بادِ صرصر تجھ کو بجھا رہی ہے

ہاں ہاں ذرا ٹھہر جا اس منزلِ فنا میں
بزمِ جہاں کی اُلفت مجھ کو ستا رہی ہے

مجھ زار و ناتواں پر للہ اب کرم کر
کیوں نخلِ آرزو پر بجلی گرا رہی ہے

دل کا بخار کچھ تو مجھ کو نکال لینے دے
گذری ہوئی کہانی اب تک رُلا رہی ہے

کیا نا اُمید ہو کر بزمِ جہاں سے جاؤں؟
کیوں خاک میں ابھی سے مجھ کو ملا رہی ہے

دنیا کے یہ مناظر پیشِ نظر ابھی ہیں
مجھ کو مری تمنّا اب تک ستا رہی ہے

برباد ہو رہی ہے کشتِ مراد میری
مثلِ چنار اس کو ناحق جلا رہی ہے

ارمان و آرزو پر تجھ کو نہ رحم آیا
کیوں میری حسرتوں کو دل سے مٹا رہی ہے

اے شمع! کیوں ابھی سے آنکھیں سب کی پُرنم
کیا مرگِ ناگہانی تشریف لا رہی ہے

رو لیں گے بعد میرے جی بھر کے رونے والے
کیوں تو ابھی سے رو کر سب کو رُلا رہی ہے

تیری اگر خوشی ہو مرنے پہ میں ہوں راضی
شمعِ حیات گُل ہو، کیوں جھلملا رہی ہے؟

حاشیہ۔ یہ نظم محض باقیاتِ اقبال طبع سوم میں ص ۲۲۹، ۲۲۸ پر ہے۔ مرتّب نے اس کا ماخذ نہیں دیا تاکہ اقبال سے اس کے انتساب کے بارے میں مزید یقین ہو جاتا۔ ویسے شمع سے خطاب کرنا اقبال کو بہت مرغوب ہے۔ اس نظم میں شاعر موت کے آنے پر گڑگڑا کر کہہ رہا ہے کہ چندے اور دنیا میں رہنے دے۔ یہ خیال اقبال کے مسلک کے بالکل برعکس ہے۔ نظم کا زمانہ معلوم نہیں لیکن اس کی ذہنی افتاد کے پیشِ نظر یہ ابتدائی دور ہی کی ہو سکتی ہے۔

اشکِ خوں

(یعنی ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ)

(منسوخ)

اے آہ آج برق سرِ کوہسار ہو
یا تیر بن کے میرے کلیجے کے پار ہو

ہو ٹکڑے ٹکڑے ٹوٹ کے اے رشتۂ نفس
اے مرغِ روح! بازِ اجل کا شکار ہو

اے دامنِ دریدۂ پیرہنِ حیات!
ہاں آج زیبِ دیدۂ خوں نابہ بار ہو

پھرتے ہیں ڈھونڈتے اجلِ ناگہاں کو ہم
ہاں اے حیاتِ خضر! نگاہوں میں خار ہو

اے افسری کے تاج! گریباں کو چاک کر
اے کرسیِ طلائے شہی! سوگوار ہو

اے دل اگر جفا طلبی کا مذاق ہے
مرہونِ تلخیِ ستمِ روزگار ہو

پسنے کا جب مزا ہے کہ اے آسیائے غم!
پس پس کے جان اپنی مثالِ غبار ہو

میت اُٹھی ہے شاہ کی، تعظیم کے لیے
اقبال! اُڑ کے خاکِ سرِ رہ گزار ہو

مدت کے بعد تجھ کو ملے ہیں غمِ فراق!
ہم تجھ پہ صدقے جائیں، تو ہم پر نثار ہو

چلتے رہِ حیات، مگر گھات میں، خوشی
کوتے لگی ہوئی نہ سرِ رہ گزار ہو

آئی اِدھر نشاط، اُدھر غم بھی آگیا
کل عید تھی تو آج محرم بھی آگیا

ہاں اے ہلالِ عید! خدا کی قسم تجھے
خواہانِ عیش کیا نظر آتے ہیں ہم تجھے؟

اے جامِ بزمِ عید! مقدر یہ تھا ترا
لبریز کرنے آئے مئے اشکِ غم تجھے

ایسی گھڑی میں تیری افق پر ہوئی نمود
سمجھا نہ کوئی حلقۂ ماتم سے کم تجھے

ایمن تھے غم سے ہم، مگر اے خنجرِ ستم!
کرتے تھے ذبحِ طائرِ بامِ حرم تجھے

کھلتی ہے کچھ ہمارے مقدر پہ یہ کبھی
سجتا نہیں نظر میں ہماری یہ خم تجھے

تیغِ ستم سے بڑھ کے رہیں تیری تیز یاں
ہم اپنے لب سے مانگ کے دیتے ہیں دم تجھے

بیماریِ نشاط اگر ہے، تو صبحِ غم
پڑھ کر کرے گی، سورۂ والحشر دم تجھے

ہاں اے شعارِ ماہِ شبِ اولِ طرب!
دل جانتا ہے تیرِ کمانِ ستم تجھے

صورت وہی ہے، نام میں رکھا ہوا ہے کیا
دیتے ہیں نام ماہِ محرّم کا ہم تجھے
اے شامِ عید! اپنے مہِ نو سے پوچھ لے
سمجھا ہوا ہوں صبحِ دیارِ عدم تجھے

کہتے ہیں آج عید ہوئی ہے، ہوا کرے
اس عید سے تو موت ہی آئے، خُدا کرے

قربان تیرے اے ستمِ روزگار آج
آنکھوں میں ہر نگہ بھی ہوئی اشک بار آج
اس روزِ رنج و غم سے تو آسان تھی یہی
محشر کی صبح ہو نہ گئی آشکار آج
دل کا تو ذکر کیا ہے کہ دل کا قرار بھی
سیماب کی طرح سے ہوا بے قرار آج
سوزِ الم نے جاں کو جلایا ہے اس طرح
کانونِ دل سے اٹھتے ہیں غم کے شرار آج
ناکامیوں نے اس کو سُنا دی وہ کیا خبر
اُمید دل میں پھرتی ہے دیوانہ وار آج
ہاں اے دلِ حزیں! اَلَموں کا یہ دور ہے
ہو طوفِ شمعِ غم تجھے پروانہ وار آج
مثلِ سموم تھی یہ خبر کس کی موت کی؟
گلزارِ دل میں اُگنے لگے غم کے خار آج
پژمردہ ہو گیا گُلِ بستانِ افسری
خوں ہو رہی ہے باغِ جہاں میں بہار آج
اقلیمِ دل کی، آہ، شہنشاہ چل بسی
ماتم کدہ بنا ہے دلِ داغ دار آج
تو جس کی تخت گاہ تھی، اے تخت گاہِ دل!
رخصت ہوئی جہان سے وہ تاج دار آج

فرماں نہ ہو دلوں پہ تو شانِ شہی نہیں
سونے کا تاج، کوئی نشانِ شہی نہیں

شاہی یہ ہے کہ اور غم چشمِ تر میں ہو
شاہنشہی پہ شانِ غریبی نظر میں ہو
شاہی یہ ہے کہ آنکھ میں آنسو ہوں اور کے
چلّائے کوئی، درد کسی کے جگر میں ہو
غم دل میں اور کا ہو، خوشی دل میں اور کی
کوئی گرے، شکست کسی کی کمر میں ہو
بے تابیاں جو اور کی ہوں اپنے دل میں ہوں
جو درد اور کا ہو، وہ اپنے جگر میں ہو
پامالِ فکرِ غیر رہے تخت گاہ پر
آئے کسی پہ تیغ، کسی کی سپر میں ہو
معمور ہو شرابِ محبت سے جامِ دل
جو دل میں ہو نہاں، وہ نمایاں نظر میں ہو
جو بات ہو صدا ہو لبِ جبرئیل کی
تقدیر کی مراد، دلِ دادگر میں ہو

ہم چشم[9]، معدلت کے ستارے کی روشنی
مانگے اماں عدو تو مروّت نظر میں ہو

شہرت کے آسمان پہ روشن ہو اس طرح
ہو مہر میں وہ نور، نہ وہ ضَو قمر میں ہو

فرمان ہو[10] دلوں کی ولایت میں اس طرح
جس طرح نور، رشتہ رتارِ نظر میں ہو

اے ہند تیری[11] چاہنے والی گزر گئی
غم میں ترے کراہنے والی گزر گئی

اے بحر! حکمراں جو زمینوں کی تھی گئی
آغوشِ موج جس کے سفینوں کی تھی، گئی

موجیں[12] رواں ہوں خون کی، چشمِ حباب سے
وہ آبرو، جو تیرے خزینوں کی تھی، گئی

دردِ اجل کی تاک بھی کیسی غضب کی تھی
انگشتری جو دل کے نگینوں کی تھی، گئی

اے ہند! تیرے سر سے اٹھا سایۂ خدا
اک غم گسار تیرے مکینوں[13] کی تھی، گئی

اے ہند! جو فضیلتِ نسواں میں اک دلیل[14]
تیرے گھروں کی پردہ نشینوں کی تھی، گئی

ہو سوگوار آج، خواتینِ ہند! تم
جو داستاں تمھارے شبینوں کی تھی، گئی

خوں نابہ بار آج ہوا ہے چشمِ سلطنت!
واقف جو تیرے سارے قرینوں کی تھی، گئی

اے سالِ قرنِ نو! یہ ستم تو نے کیا کیا
عزّت ذرا جو تیرے مہینوں کی تھی، گئی

تو آج سر بہ خاک ہو، سیّارۂ زمیں
رونق جو تیرے سارے مکینوں کی تھی، گئی

صرفِ بُکا ہے جانِ سلاطینِ روزگار
دہلیز جس کی، عید جبینوں کی تھی، گئی

ہو موت میں حیات، ممات اس کا نام ہے
صدقے ہو جس پہ خضر، وفات اس کا نام ہے

جانِ نزار آ کے لبوں تک[15] اٹک گئی
آنکھوں سے، خون بن کے تمنّا ٹپک گئی

روزِ طرب جہاں میں سیہ پوش ہو گیا
اے روزگارِ غم! تری قسمت چمک گئی

آئی جو یاس[16] خنجرِ عریاں لیے ہوئے
ڈر کر امید، گوشۂ دل میں دُبک گئی

ہا دو نگاہ، دیدۂ صیّاد تھی کوئی
دیکھا جو آنکھ بھر کے تو بلبل پھڑک گئی

اے شمعِ بزمِ ماتمِ سلطانۂ جہاں!
کیا تھی جھلک تری کہ ثریّا تلک گئی

ماتم بھی وہ دیا کہ ہزاروں میں ایک ہے
آنکھ اپنی، انتخابِ فلک پر بھڑک گئی

لالیِ افق پہ آنکھ نے، دیکھی جو شامِ عید
اک بات تھی کہ خونِ جگر کو کھٹک گئی

سمجھی ہے اپنے آپ کو آئی ہوئی اجل
لو میری خامشی سے قضا بھی بہک گئی

اے دردِ! آ مرے چمنِ دل کی سیر کر
غم کی کلی ہوائے نفس سے چٹک گئی

اے دردِ جاں گداز خدا کے لیے نہ تھم
ہم بھی اٹھیں گے ساتھ، جو تیری کسک گئی

ہر آنکھ، دل بہ ریزشِ طوفاں نہادہ ہے
مژگانِ چشم کیا، رگِ ابرکشادہ ہے

ماتم میں آ رہے ہیں یہ ساماں کیے ہوئے
داغِ جگر کو شمعِ شبستاں کیے ہوئے

تاریک ہو گیا ہے زمانہ، مگر قضا
آجائے غم کی شمع فروزاں کیے ہوئے

رکھتا ہوں طائرِ دلِ رنگیں نوا کو میں
پہلو کو غیرتِ چمنستاں کیے ہوئے

لکھتا ہوں شعر دیدۂ خوں بار سے مگر
کاغذ کو رشکِ بابِ گلستاں کیے ہوئے

ماتم میں لے گیا ہوں دلِ پاش پاش کو
آزارِ جاں گدازیِ درماں کیے ہوئے

ہر زخمِ دل کو ماتمِ حسان تون دہر میں
بیٹھے ہیں مستِ ذوقِ نمک داں کیے ہوئے

مغرب کے آسماں پہ چمکتی ہے تیغِ غم
جوہر کو رازدارِ رگِ جاں کیے ہوئے

لے، اے عروسِ ہند! تری آبرو گئی
آنکھوں کو اشکِ غم سے دُرافشاں کیے ہوئے

برطانیہ! تو آج گلے مل کے ہم سے رو
سامانِ بحر ریزیِ طوفاں کیے ہوئے

بوتے ہیں نخلِ آہ کو باغِ جہاں میں ہم
ممنونِ آبِ دیدۂ گریاں کیے ہوئے

آہم، چو سرو، در چمنِ روزگار ماند
ایں مصرعِ بلند زمن یادگار ماند

کیا منزلِ عدم کو ہمارا نفس گیا
یہ سب سے پہلے صورتِ بانگِ جرس گیا

آ، اے ہجومِ غم! ترے قربان جاؤں میں
اُجڑا ہوا تھا شہر مرے دل کا، بس گیا

ہو ہو کے پرزے خارِ غمِ سینہ سوز سے
تن سے نکل کے دامنِ موجِ نفس گیا

ایسا اثر ہے گریۂ آہن گداز میں
اشکوں کے ساتھ بہ کے ہمارا قفس گیا

اٹھا وہ ابر گوشۂ مغرب سے شعلہ ریز
مشرق سے بڑھ کے ہند پہ آ کر برس گیا

وہ ضرب[۲۱] غم لگی ہے کہ ٹوٹا ہے بند بند
کیا مُرغِ رُوح توڑ کے اپنا قفس گیا
نکلا وہ مار، صحنِ گلستانِ عیش سے
دل کو جگر کو، سینے کو، پہلو کو ڈس گیا
اے روز! تو پہاڑ تھا یا غم کا روز تھا
دِن بَن کے تو چڑھا تھا، پہ ہو کرزن[۲۲] گیا
لا گلشنِ عدم سے اسے اے سمومِ غم!
بوئے گُلِ اجل کو مرا جی ترس گیا
آنکھوں کی راہ کیوں نہ گیا بن کے جوئے خوں
دم بھی گیا تو لے کے یہ جی میں ہوس گیا

شہرہ ہوا جہاں میں یہ کس کی وفات کا
ہے ہر ورق سیاہ، بیاضِ حیات کا

ہاں بھولنا نہ موجۂ بادِ صبا کہیں
ہو ملکِ نیستی میں جو تیرا[۲۳] گزر کہیں
مانگی تھی ہم[۲۴] نے آج اجل کے لیے دعا
صدقے نہ ہو گیا ہو دعا پر اثر کہیں
ٹلتی نہیں ہے شورِ بُکا سے اجل کبھی
اس تیغِ جاں ستاں کی نہیں ہے سپر کہیں
دونی تھی جن کی شان سے، ہیروں کی آبرو
وہ آج کر گئے ہیں جہاں سے سفر کہیں
اے کوہِ نور تو نے تو دیکھے ہیں تاجور
دیکھا ہے اس طرح کا کوئی تاجور کہیں؟
دیتے ہیں تجھ کو دامنِ کہسار کی قسم
اس شان کا ملا ہے تجھے دادگر کہیں؟
بن کر چراغ، سارے زمانے میں ڈھونڈتا
کہنا ہمیں بھی آئے[۲۵] جو ایسا نظر کہیں
جس کی ضیا سے آنکھ چکا چوند تھی تری
دنیا میں اب نہیں وہ جبیں جلوہ گر کہیں
تو کیا؟ کسی پہ گوہرِ جاں تک نثار تھے
پیدا جہاں میں ہوتے ہیں ایسے بشر کہیں
صورت تری ہے اشکِ جگر سوز کی طرح
قربان ہو نہ جائے ہماری نظر کہیں

ہلتا ہے جس سے عرش یہ رونا اسی کا ہے
زینت[۲۶] تھی جس سے تجھ کو، جنازا اسی کا ہے

پیغامِ خانہ سوزیِ دل بار بار دے
فرصت نہ دو گھڑی نفسِ شعلہ بار دے
زورِ جنوں میں جائے جو دشتِ عدم کو دِل
پہلے قدم پہ جامۂ ہستی اُتار دے
پھونکا ہے غم کی آگ نے جانِ نزار کو
ہم کو تسلیاں دلِ آشفتہ کار دے
جس کا دلوں پہ راج ہو مرتا نہیں کبھی
صدیاں ہزار، گردشِ دوراں گزار دے

رہتا ہے دل میں صورتِ حرفِ نگیں وہ نام — شہرت جسے جہاں میں پروردگار دے
وکٹوریہ نہ مُرد کہ نام نکو گذاشت — ہے زندگی یہی، جسے پروردگار دے
اے غم کشانِ دودۂ شاہی! خدا تمھیں — اس دردِ جاں گزا میں شکیب و قرار دے
رفتار اس کے نقشِ قدم پر کرے نصیب — یہ مہرِ مادری کی تمھیں یادگار دے
اے باغِ ہند! اشتر[28] آ خیاباں بجائے گل — موتی، ستالِ[29] دامنِ ابرِ بہار دے
پژمردہ کر گئی ہے جو بادِ خزاں تجھے — صد نو بہارِ ناز، تجھے روزگار دے

مرحوم کے نصیب ثوابِ جزیل ہو
ہاتھوں میں اپنے دامنِ صبرِ جمیل ہو

جنوری ۱۹۰۱ء

حواشی: ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوا۔ اس دن عید تھی۔ غلام رسول مہر کا قیاس ہے کہ تقریب کا جلسہ ۲۳ یا ۲۴ جنوری کو منعقد کیا گیا ہوگا۔ اس میں اقبال نے اتنا طویل مرثیہ پڑھا۔ دو ایک دن میں ۱۱۰ اشعار کی نظم لکھ دینا ان کی زود گوئی اور پُرگوئی کی دلیل ہے۔ یہ مرثیہ مطبع خادم التعلیم لاہور سے بھی شائع ہوا اور مطبع مفیدِ عام لاہور سے بھی۔ افضل حق قریشی[1] نے آخرالذکر کے سرورق کی یہ نقل دی ہے۔

اشکِ خوں
یعنی ترکیب بند
جو حضور ملکۂ معظمہ مرحومہ محترمہ کے انتقالِ
پُرملال پر مسلمانانِ لاہور کے ایک ماتمی جلسہ
میں پڑھا گیا
از
خاکسار اقبال

---

[1] قاضی افضل حق قریشی، باقیاتِ اقبال رسالہ اُردو کراچی شمارہ ۳۵، ۱۹۶۹ء۔ ص ۴۳

ع۱۵ امیر مینائی کے ذیل کے شعر کا مصرعِ ثانی ملاحظہ ہو۔

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ع۲۵ سرودِ رفتہ کی صراحت کے مطابق یہاں 'برس' سے مراد 'سال' ہے۔

دردِ دل

یا

یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے

(منسوخ)

اے مہِ عید ا بے حجاب ہے تو — حسنِ خورشید کا جواب ہے تو
اے گریبانِ جامۂ شبِ عید! — شاہدِ عیش کا شباب ہے تو
اے نشانِ رکوعِ سورۂ نور! — نقشۂ کلکِ انتخاب ہے تو
اے جوابِ خطِ جبینِ نیاز! — طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو
ہائے اے حلقۂ پرِ طاؤس! — قابلِ ذالکَ الکتاب ہے تو
فوجِ اسلام کا نشاں تو ہے — جسمِ نصرت کا انتخاب ہے تو
چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا — کہہ دیا خواب کو کہ خواب ہے تو
طوفِ منزل گہِ زمیں کے لیے — ہمہ تن پائے در رکاب ہے تو
یہ ابھرتے ہی آنکھ سے چھپنا — روشنی کا مگر حباب ہے تو

تو کمندِ غزالِ شادی ہے
لذّت افزائے شورِ طفلی ہے

مقصدِ دیدۂ امید ہے کل — گو ہر عیش کی خرید ہے کل
دیدۂ مہرِ عالم آرا میں — سرمۂ عید کی کشید ہے کل

گلشنِ نو بہارِ ہستی میں　　سبزۂ عیش کی دمید ہے کل
گُلِ محرابِ ہر جبینِ نیاز　　زینت افزائے عینِ عید ہے کل
اے مہِ نو! ترا پیامِ طرب　　ہے نویدِ آج، چشمِ دید ہے کل
اے نسیمِ نشاطِ روحانی!　　باغِ دل میں تری وزید ہے کل
ہے یہی نغمۂ لبِ طفلی　　"ہاتھ لانا اِدھر، کہ عید ہے کل"
کم سِنوں کو یہ کہہ رہے ہلال　　"لو میاں! شب بخیر، عید ہے کل"
سرِ بالیں لباسِ طفلی ہے　　میری عریاں تنی کی عید ہے کل

اے مہِ نو! خوشی ہو کیا جی کو؟
تیرے آنے سے کیا یتیمی کو؟

جھوٹ ہے، عید کا ہلال ہے تو　　ساغرِ بادۂ ملال ہے تو
کہہ سُنا قصۂ ستم زدگاں　　کہ ہمارا لبِ مقال ہے تو
خامشی سوز ہے نظارہ ترا　　غازۂ عارضِ مقال ہے تو
اے گدائے شعاعِ پرتوِ مہر!　　ہمہ تن کاسۂ سوال ہے تو
چشمۂ مہر پر نظر ہے تری　　تشنہ کامِ مئے کمال ہے تو
یہ دکھاوا ہے سب تلاشِ کمال　　پایۂ منزلِ زوال ہے تو
ہائے، شاید خبر نہیں تجھ کو　　اپنی امید کا مآل ہے تو
بڑھ گیا خم مرے مقدر کا　　کیوں نہ کہہ دیں کہ بے مثال ہے تو
میرے شوقِ لباسِ نو کے لیے　　سبق آموزِ انفعال ہے تو

کیا بتاؤں تجھے کہ کیا ہوں میں
تجھ کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں

ستمِ گوشِ باغباں ہوں میں　　خبرِ آمدِ خزاں ہوں میں
شرمسارِ متاعِ ہستی ہوں　　مایۂ نازشِ زیاں ہوں میں
مجھ سے شرما گیا تبسم بھی　　کہ سراپا لبِ فغاں ہوں میں

بار ہوں طاقتِ شنیدن پر — کس مصیبت کی داستاں ہوں میں
آہ منزل نہیں نصیبوں میں — موجۂ گردِ کارواں ہوں میں
اپنی بے مائگی پہ نازاں ہوں — مفت جاتا ہوں کیا گراں ہوں میں
اے فلک! خوانِ زندگی پہ مگر — کوئی ناخواندہ میہماں ہوں میں
ستمِ ناروا سے مرتا ہوں — آسماں کا مزاج داں ہوں میں
آرزو یاس کو یہ کہتی ہے — اک مٹے شہر کا نشاں ہوں میں

ایسی قسمت کسی کی ہوتی ہے؟
آہ میری، اثر کو روتی ہے

بن کے نشتر چبھا ہے تو دل میں — آرزو ہو گئی لہو دل میں
چاکِ دل پر نثار ہوتی ہے — حسرتِ سوزنِ رفو دل میں
یاس نقشہ جمائے جاتی ہے — چھپتی پھرتی ہے آرزو دل میں
دردِ تیزی سے بڑھ گیا، اے غم! — کیا رہی تیری آبرو دل میں؟
دو گھڑی بیٹھنے نہیں دیتی — ہے کوئی چیز فتنہ خو دل میں
گرہِ رشتۂ حیات نہ ہو — یہ جو ہوتی ہے آرزو دل میں
دیکھ، اے یاس! اب تلک باقی — خونِ اُمّید کی ہے بو دل میں
عمر تیری بڑی ہے، یادِ پدر! — تھی ابھی تیری گفتگو دل میں
اے خیالِ مسرتِ طفلی — آ گیا ہے کدھر سے تو دل میں

دردِ دل کا بھی کیا فسانہ ہے!
خون رونے کا اک بہانہ ہے

مصرِ ہستی میں شام آتی ہے — رنگ اپنا جمائے جاتی ہے
اے سبوئے مئے شفق! اے شام! — تو مئے بے خودی پلاتی ہے
سرمۂ دیدۂ افق بن کر — چشمِ ہستی میں تو سماتی ہے
کس خموشی سے اڑ رہے ہیں طیور — تو رہِ آشیاں دکھاتی ہے
ریزشِ دانہ ہائے اختر کو — مزرعِ آسماں میں آتی ہے

تو، پرِ طیرِ آشیاں رَو کو　　چشمِ صیاد سے چھپاتی ہے
صبح در آستیں ہے تو شاید　　آنکھ اختر کی کھلتی جاتی ہے
تو پیامِ وفاتِ بیداری　　محفلِ زندگی میں لاتی ہے
اپنے دامن میں بھر کے غنچہ[12] و گل　　خواب لے کر چمن میں آتی ہے
خامشی زا ہے تیرا[13] نظارہ
آہ یہ حسنِ انجمن آرا

تیری تاثیر ہو گئی آخر
میری تقدیر سو[14] گئی آخر
آبرو جائے[15] موت کی نہ کہیں　　موت بن جائے بے کسی نہ کہیں
درد کو زندگی سمجھتے ہیں　　جاوداں ہو یہ زندگی نہ کہیں
ہوں وہ بیکس کہ ڈرتا رہتا ہوں　　چھوڑ دے مجھ کو بیکسی نہ کہیں
زخم[16] منت پذیرِ مرہم ہے　　چھپ کے سنتی ہو چاندنی نہ کہیں
غنچۂ دل میں ہے چٹک ایسی　　اس کلی میں ہو بیکلی نہ کہیں
ہوں[17] نفس دو نفس مثالِ سحر　　موت ہو[18]، میری زندگی نہ کہیں
گاہے ماہے ہلال آتا ہے　　ہو لبِ ناں[19] مفلسی نہ کہیں
ماہ کے بھیس میں نمایاں ہو　　اپنی تقدیر کی کجی نہ کہیں
خطِ دستِ سوال ہی[20] اپنا　　ہو رگِ جانِ مفلسی نہ کہیں
قابلِ جبرِ زندگی نہ ہوا
ٹکڑے ٹکڑے مرا سفینہ ہوا
سیر میں اب نہ دل لگائیں گے　　کس کی انگلی پکڑ کے جائیں گے؟
صبح جانا کسی کا وہ گھر سے　　اور وہ رونا کہ ہم بھی جائیں گے

کھیل میں آگئی جو چوٹ کبھی — کس کی آنکھوں سے اب چھپائیں گے
کوئی ناغہ جو ہو گیا تو کسے — ساتھ مکتب میں لے کے جائیں گے
سننے والے گزر گئے، اے دل! — اپنے شکوے کسے سنائیں گے؟
اُٹھ گئے آہ، قدرداں اپنے — لکھ کے تختی کسے دکھائیں گے؟
دردِ دل کی زباں نرالی ہے — تجھ کو اسے خامشی اِسکھائیں گے
کس غضب کے نصیب ہیں اپنے! — روتے آئے تھے، روتے جائیں گے
عید آئی ہے، اے لباسِ کہن! — اب ترے چاک پھر سلائیں گے

عید کا چاند آشکار ہوا
تیرِ غم کا جگر کے پار ہوا

آنکھ میں تارِ اشکِ پیہم ہے — کیا رواں آبِ خنجرِ غم ہے
دیکھ اے ضبط! گر نہ جائے کہیں — اشکِ غم آبروئے ماتم ہے
اے مہِ عید! تو ہلال نہیں — سینہ کاوی کو ناخنِ غم ہے
پھول ایسا ہے اشکِ چشمِ یتیم — رونقِ خانۂ محرّم ہے
اس گلستاں میں آشیاں ہے مرا — ہر شجر جس کا نخلِ ماتم ہے
کس کے نظارۂ مصیبت کو — ماہ بامِ فلک پہ یوں خم ہے؟
خونِ امید ہے یہ اشک نہیں — کس بھلاوے میں چشمِ پُرنم ہے
پوچھنا اے نفس! نکل کے ذرا — کیوں اجل کا مزاج برہم ہے
اے فلک! کیوں زمیں ہے برسرِ کیں؟ — میری بربادیوں کو تو کم ہے؟

ہے جو دل میں نہاں، کہیں کیونکر؟
مفلسی کے ستم سہیں کیونکر؟

ہاتھ اے مفلسی! صفا ہے ترا — ہائے کیا تیر بے خطا ہے ترا
تیرہ روزی کا ہے تجھی پہ مدار — بدنصیبی کو آسرا ہے ترا
مایۂ صد شکستِ قیمتِ دل — دہر میں ایک سامنا ہے ترا

تو بھلا مجھ پہ کیوں نثار نہ ہو؟ — کہ یتیمی تو مدعا ہے ترا
مُسکراتا ہے تجھ کو دیکھ کے زخم — یہ کوئی صورت آشنا ہے ترا
التجا پر خموشیِ منعم — ایک فقرا جلّا بُھنا ہے ترا
یہ بھی کیا دامنِ یتیمی ہے! — نام کیسا نکل گیا ہے ترا
موت مانگے سے بھی نہیں آتی — درد کیا زندگی فزا ہے ترا
شورِ آوازِ چاکِ پیراہن — لبِ اظہارِ مدّعا ہے ترا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند
اس چمن کو نہیں بہار پسند

چمنِ خار خار ہے دنیا — خونِ صد نو بہار ہے دنیا
زندگی نام رکھ دیا کس نے — موت کا انتظار ہے دنیا
ہے نسیمِ جہاں خزاں پرور — دیکھنے کو بہار ہے دنیا
ڈھونڈ لیتی ہے اک نہ اک پہلو — درد کی غم گسار ہے دنیا
ہے تمنّا فزا ہوائے جہاں — کیا شکستِ خمار ہے دُنیا!
خون روتا ہے شوق منزل کا — رہزن و رہگزار ہے دنیا
جان لیتی ہے جستجو اس کی — دولتِ زیرِ مار ہے دنیا
یاس و امّید کا ملاوا ہے — کوئی جاتی بہار ہے دنیا
خندہ زن ہے فلکِ دوں پہ جہاں — چرخ کی راز دار ہے دنیا

اہلِ دنیا و شرحِ دردِ جگر
رگِ بے خون و کاوشِ نشتر

کیا قیامت ہیں غم کے آنسو بھی — بڑھتا جاتا ہے دردِ پہلو بھی
نوکِ مژگاں ہے نشترِ رگِ اشک — خوں فشاں ہو رہے ہیں آنسو بھی
ٹوٹی پھوٹی زباں میں کہتا ہے — رنگِ احوال، دردِ پہلو بھی
سوزشِ اشکِ غم ہے برقِ مژہ — جل گیا سبزۂ لبِ جو بھی

آہ اے چشمِ اشک ریزِ یتیم — خواب کا اک خیال ہے تو بھی
حسرتِ دید غم گسار نہ پوچھ — چشم ریزاں میں مرے آنسو بھی
قطرۂ خوں تو عام ہے لیکن — دل کو کہتے ہیں دردِ پہلو بھی
آ ترے صدقے اے خیالِ پدر — عید کا چاند ہو گیا تو بھی
ہائے اے برق! بن گی گر کر — میرے حاصل کی آبرو تو بھی

عید کا چاند اضطراب بنا
طاقِ آتش گہِ عذاب بنا

طعن دیتا ہے کس بلا کے مجھے — آسماں بن گیا ستا کے مجھے
ہائے بے خود کیا تصور نے — داستانِ عرب سنا کے مجھے
ہے تصدق مری یتیمی پر — کوئی نقشہ دکھا دکھا کے مجھے
چاہیے اے خیال! پاسِ ادب — تو کہاں لے گیا اڑا کے مجھے؟
ہائے اے آتشِ فراقِ پدر! — خاک کر دے جلا جلا کے مجھے
اے یتیمی! فتادگی بن کر — چھوڑنا خاک میں ملا کے مجھے
لبِ اظہار وا ہوا نہ کبھی — غم نے دیکھا ہے آزما کے مجھے
پردہ رکھ لے شکستہ پائی کا — کارواں لے چلے اٹھا کے مجھے
زندگی کیا اسی کو کہتے ہیں؟ — کہ مزے مل گئے فنا کے مجھے

عرش ہلتا ہے جب یہ روتے ہیں
کیا یتیموں کے اشک ہوتے ہیں!

کیا ہنسی ضبط کی اڑاتے ہیں — اشک آ آ کے چھیڑ جاتے ہیں
اک بہانہ ہلالِ عید کا ہے — قوم کو حالِ دل سناتے ہیں
کس مزے کی ہے داستاں اپنی — قوم سنتی ہے، ہم سناتے ہیں
دیکھ اے زندگی! مرے آنسو — یہ ترے نقش کو مٹاتے ہیں
ہاں بتا اے فلک! کہ طفلی میں — درد کو کس طرح چھپاتے ہیں؟

خاکِ راہِ فنا میں اڑتی ہے — منہ کفن میں چھپائے جاتے ہیں
وہ بھی ہوتے ہیں اے خدا! کوئی — جو مصیبت کو بھول جاتے ہیں
اس طرح کی ہے داستاں اپنی — ہے عیاں جس قدر چھپاتے ہیں
ہم نہ بولیں تو خامشی کہہ دے — یہ قیامت کے دکھ اٹھاتے ہیں

آبرو بڑھ گئی خموشی کی
یہ زباں بن گئی یتیمی کی

رنگِ گلشن جو ہو[۳۵] خزاں کے لیے — قہر ہوتا ہے باغباں کے لیے
چاہیے پاس برق کا اے دل! — ہو خس خشک آشیاں کے لیے
اڑ کے آتا ہے رنگ عاشق زرد — کس مصیبت کی داستاں کے لیے!
حال دل کا سنا دیا سارا — کچھ بھی رکھا نہ رازداں کے لیے
ہے اقامت طلب جدا مری — قوم ہو خضر اس[۳۶] مکاں کے لیے
ہاتھ اے قوم مہرباں! تیرا — ابر ہے کس کے گلستاں کے لیے؟
حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں — اور رکھیں اسے کہاں کے لیے؟
صورتِ شمعِ خانۂ مفلس — خامشی ہے مری زباں کے لیے
اب مگر ضبط کا نہیں یارا — سب ترسنے لگے فغاں کے لیے

دردمندوں کی دادخواہ ہے قوم
بے کسوں کی امید گاہ ہے قوم

۲۴ فروری ۱۹۰۱ء

حواشی: علامہ اقبال نے یہ نظم انجمنِ حمایت اسلام کے سولھویں اجلاس میں ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء کو پڑھی وہ اس کی کاپیاں چھپوا کر لائے تھے۔ "نالۂ یتیم" کی طرح اس کی بھی اتنی قدر ہوئی کہ بعض کاپیاں چار چار روپے تک کو بکیں۔ یہ نظم "دادِ انجمن ضمیمہ ۱۱" میں بھی شامل ہے۔ معلوم ہوتا ہے پہلے اس نظم کا عنوان "دردِ دل یا ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید کو" تھا بعد میں "یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے" کر دیا گیا۔

یہ نظم آخرکار منسوخ ہوگئی مختلف نسخوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دو منزلیں ہیں۔ نقشِ ثانی میں بعض بندوں کی ٹیپ میں بھی تبدیلی کر دی گئی۔ اس کے بعض بند علیحدہ نظم کے طور پر چھپوائے گئے جن کی تفصیل اختلافِ نسخ میں ملاحظہ ہو۔ اگست ۱۹۰۲ء کے اُردوئے معلیٰ میں ایک مضمون "اردو زبان پنجاب میں" از تنقیدِ ہمدرد چھپا۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کے بقول اس پردے میں خود حسرت لکھتے تھے[1]۔ لیکن اس کے شروع میں ایڈیٹر کا نوٹ ہے۔ "ہم کو سخن سنجان پنجاب کی دل شکنی کے خیال سے اس مضمون کے شائع کرنے میں کسی قدر تامل تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ صاحبِ مضمون نے زبان کی کمزوریوں سے گزر کر حضرت اقبال کی نفس شاعری پر مطلق اعتراض نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی جابجا تعریف کی ہے، ہم اس کی اشاعت کو جائز رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ اہلِ پنجاب کی انصاف پسند طبیعتوں کو یہ بیانِ حقیقت ناگوار نہ گزرے گا۔"

اس مضمون میں معترض لکھتے ہیں:

"خود حضرتِ اقبال کی جس نظم نے بقول اڈیٹر مخزن، ان کی شہرت کی بنیاد رکھی ہے، اس کے ہر بند میں ایسی غلطیاں زبان و محاورے کی موجود ہیں جن کو اربابِ مذاق کبھی گوارا نہیں کرسکتے بطور نمونہ چند درج ذیل ہیں۔"

اشارہ اسی نظم کی طرف تھا۔ اقبال نے مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء میں جوابی مضمون 'اُردو زبان پنجاب میں' ہی کے عنوان سے لکھا۔ یہ مضمون ڈاکٹر غفار شکیل کے نثری افکار میں شامل ہے۔ مضمون میں اس نظم پر چار اعتراضات کے ساتھ جواب ہیں۔

۱۔ اس شعر میں لفظ 'کو' پر اعتراض تھا کہ یہاں 'سے' ہونا چاہیے۔

۲۔ 'صفا' پر اعتراض تھا کہ یہاں 'صاف' کا مقام تھا۔

۳۔ اعتراض تھا کہ 'شور' کیونکر 'لب' بن سکتا ہے۔ اقبال نے جواب دیا کہ یہ استعارہ ہے۔ اور پھر اس قسم کے استعاروں کی نظیر پیش کیں۔

---

[1] اقبال سفر لکھنؤ۔ حقیقت یا افسانہ۔ ہماری زبان بابت ۱۵ مئی ۱۹۶۸ء

۹ اس شعر میں 'تجھے' کی جگہ 'تجھ سے' ہونا چاہیے تھا۔
اقبال نے اپنی تائید میں اساتذہ کے یہاں سے اسناد پیش کیں۔ فروری ۱۹۰۴ء کے اردوئے معلیٰ میں تنقید ہمدرد نے 'اصلاحِ زبانِ پنجاب' کے عنوان سے جواب الجواب لکھا' اور بتایا کہ 'مولانا حالی نے (اپنے مشہور تار کے ذریعے سے) اور سنا ہے مولوی شبلی نے بھی کسی مصلحت سے حضرت اقبال کی تاویلوں کو صحیح قرار دیا ہے' لیکن انبالوی صاحب نے (میر غلام بھیک نیرنگ نے اس نام سے تنقید ہمدرد کا جواب دیا تھا) کم از کم ع۱ اور ع۵ والے اعتراض کو تسلیم کر لیا۔ تنقید ہمدرد نے اقبال کی کسی تاویل کو نہیں مانا اور دعویٰ کیا کہ اُن اسناد سے اعتراض کا رد نہیں ہوتا۔

پنجۂ فولاد

(منسوخ)

"پنجۂ فولاد" اک اخبار ہے — جس سے سارا ہند واقف کار ہے
دفترِ اخبار ہے لاہور میں — جس کا کوچہ کوچۂ کوئے یار ہے
ہے روش اس کی پسندِ خاص و عام — واہ وا کیا معتدل اخبار ہے
غیر سے نفرت، نہ اپنوں سے لگاؤ — اپنے بیگانے کا ہردم یار ہے
سطر سطر اس کی مفیدِ ملک و قوم — کوئی کہہ دے، یہ خبر بے کار ہے؟
دید کے قابل نہ ہو کیوں بزمِ فوق — شمع اس محفل کی یہ اخبار ہے
"ضامنِ صحت" کا ایسا ہے عمل — وہ ضمانت کے لیے تیار ہے
ہے "تجارت" کا بھی کالم کیا مفید — یوسفِ معنی کا یہ بازار ہے
وہ "لطائف" ہیں کہ پڑھتے ہی جنھیں — لوٹنے میں دل کبوتر وار ہے
کیوں نہ نظم و نثر کا چرچا رہے — جب ایڈیٹر ناظم و نثّار ہے
"سیٹلمنٹ آفس" کا بھی ہے بندوبست — شاہدان دعووں کا خود اخبار ہے

ہے مدلل رائے اس اخبار کی ہے وہ کافر، جس کو کچھ انکار ہے
رائے زن اس سے نہیں بڑھ کر کوئی منصفوں کو اس کا اب اقرار ہے
جتنے ہیں ہم عصر دیکھیں غور سے فقرے فقرے سے ٹپکتا پیار ہے
تین رائج سکے قیمت سال کی اس سے سستا اور کون اخبار ہے
اور پھر انعام میں ناول ہیں مفت واہ کیا سودا ہے! کیا بیوپار ہے!
آٹھویں دن حاضری لے لیجیے تابعِ فرمان، خدمت گار ہے
سیر اس گلشن کی کر کے دیکھیے ایک گلشن، رشکِ صد گلزار ہے
رنگِ آزادی ہے ہر مضمون میں سرو ہو کر بھی یہ میوہ دار ہے
کون ہے اس بانکے پرچے کا مدیر؟ بات یہ بھی قابلِ اظہار ہے
لیجیے مجھ سے جواب مختصر یہ معما کچھ نہیں دشوار ہے
نام ہے اس کا محمد دین فوق عمر چھوٹی ہے مگر ہشیار ہے
شوق ہے مضمون نویسی کا اسے طبع گویا ابرِ گوہر بار ہے
گشت کے عالم میں دیکھا تھا اسے آدمی ہشیار واقف کار ہے

۱۹۰۱ء

حواشی: منشی محمد دین فوق اقبال کے دوست تھے۔ ۱۸۹۶ء میں لاہور آئے شاعری میں داغ کے شاگرد تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ہفتہ وار پنجۂ فولاد جاری کیا جس کا داغ نے قطعۂ تاریخ لکھا۔ اس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے۔

ہوا ہے پنجۂ فولاد جاری خریدارو نیا اخبار دیکھو
سنا دو مصرعِ تاریخ اے داغ یہ لو اخبار جوہر دار دیکھو[1]

۱۳۱۹ھ

بقول کسریٰ منہاس یہ ہفتہ وار ایک دوست نما دشمن کی مہربانی سے ۱۹۰۵ء

---

[1] کسریٰ منہاس: مورخینِ لاہور۔ نقوش لاہور ـــ نمبر شمارہ ۹۲۔ فروری ۱۹۶۲ء۔ ص ۹۹۹ - ۹۹۸

میں بند ہوگیا۔ اقبال نے اسی اخبار کے اجرا پر یہ نظم لکھی۔ سرودِ رفتہ کے مطابق بزمِ فوق، ضامنِ صحت، تجارت، مذاقِ سخن، مشاہیر، لطائف، سٹیلمنٹ آفس وغیرہ اس اخبار کے مستقل کالم تھے۔

[۱] سیٹلمنٹ، بروزنِ مستفعلن ہے۔ اقبال نے اسے سکوڑ کر بروزنِ فاعلن باندھا ہے۔

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں! چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں[۱] کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے گردش[۲] شام و سحر کے درمیاں
تیری ہستی[۳] پر نہیں باد تغیر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایام پر[۴]

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے
امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو پاسباں اپنا ہے تو، دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ[۵] اول فلک جس کا ہو وہ دیواں[۶] ہے تو سوئے خلوت گاہِ دل، دامن کشِ انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر
تیری عمرِ[۷] رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن وادیوں میں ہیں تری، کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری، ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا[۸]، آئینۂ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے   تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ! کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے   دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی   جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی   دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی   کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی   سنگِ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیِ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا   دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا   وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

وہ اچھالی پنجۂ قدرت نے گیند اک نور کی   جھانکتا ہے وہ درختوں کے پرے خورشید بھی
دل لگی کرتی ہے ہر پتے سے جس کی روشنی   میرے کانوں میں صدا آئی مگر کچھ اور ہی

دل کی تاریکی میں وہ خورشید جاں افروز ہے
شمعِ ہستی جس کی کرنوں سے ضیا اندوز ہے

وہ اصولِ حق نمائے نفیِ ہستی کی صدا   روح کو ملتی ہے جس سے لذتِ آبِ بقا
جس سے پردہ روئے قانونِ محبت کا اٹھا   جس نے انساں کو دیا رازِ حقیقت کا پتا

تیرے دامن کی ہواؤں لے اُگا تھا یہ شجر
بیخ جس کی ہند میں ہے، چیں و جاپاں میں ثمر م

تو تو ہے مدّت سے اپنی سرزمیں کا آشنا م کچھ بتا ان رازدانانِ حقیقت کا پتا
تیری خاموشی میں ہے عہدِ سلف کا ماجرا م تیرے ہر ذرّے میں ہے کوہِ المبس کی فضا
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلّی ہے سراسر چشمِ بینا کے لیے م

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سُنا مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلّف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصوّر! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام! تو

آنکھ اے دل! کھول اور نظارۂ قدرت کو دیکھ م اس فضا کو، اس گل و گلزار کی نکہت کو دیکھ
اپنی پستی دیکھ، اور اس کوہ کی رفعت کو دیکھ م اس خموشی میں سرورِ گوشۂ عزلت کو دیکھ
شاہدِ مطلب ملے جس سے، وہ ساماں ہے یہی
دردِ دل جاتا رہے جس سے، وہ درماں ہے یہی م

اپریل ١٩٠١ء

حواشی: یہ نظم اقبال نے کسی ادبی جلسے میں پڑھی۔ شیخ عبدالقادر نے بانگ درا کے مقدّمے میں لکھا ہے کہ کئی لوگوں نے اس کی اشاعت کی فرمائش کی لیکن اقبال نے یہ عذر کیا کہ ابھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ جب شیخ عبدالقادر نے مخزن جاری کیا تو ان سے نظم مانگی۔ اقبال کو ہمالہ دینے میں پس و پیش تھی لیکن عبدالقادر نے زبردستی وہ نظم بہ صورتِ اوّل ان سے لے لی اور مخزن کے پہلے شمارے اپریل ١٩٠١ء میں شائع کردی۔

عبدالقوی[1] دسنوی کا قیاس ہے کہ یہ نظم ۱۹۰۰ء کے آخر میں لکھی گئی ہو گی لیکن اقبال کے عذر کے پیشِ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخزن کے اجرا اپریل ۱۹۰۱ء سے کچھ ہی پہلے لکھی گئی ہوگی۔ تین مہینے پیش ترکی ہوتی تو اقبال اس پر نظرِ ثانی نہ کر لیتے۔

نسیم فاطمہ نے آئینۂ ایامِ اقبال ص ۱۰ میں ذکرِ اقبال کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ نظم اپریل ۱۹۰۱ء میں کسی جلسے میں پڑھی گئی۔ دوسری طرف ص ۱۶ پر وہ ۹ فروری ۱۹۰۱ء کے تحت فلسفۂ اقبال از حکیم عبدالقوی دریابادی ص ۹ کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ مخزن میں پہلی نظم شائع ہوئی۔ گویا ان کا خیال ہے کہ فروری ۱۹۰۱ء میں مخزن میں اقبال کی کوئی دوسری نظم شائع ہوئی جب کہ ہمالہ اپریل ۱۹۰۱ء میں جلسے میں پڑھی گئی۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔ مخزن تو نکلا ہی اپریل میں۔ ۹ فروری میں اس میں کوئی نظم کیسے چھپ جاتی۔

جب مخزن میں یہ نظم چھپی تو اس کا نام کوہستانِ ہمالہ تھا۔

ع۱ ذوق کے قصیدے کا مصرع یاد کیجیے ع کہ جیسے جائے کوئی پیلِ مست بے زنجیر

ع۲ سرودِ رفتہ کے دیباچے میں مولانا غلام رسول مہر نے توجہ دلائی کہ یہ مصرع بانگِ درا کی نظم فلسفۂ غم میں اس شکل میں موجود ہے۔

ع آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی۔

ع۳ جیسا کہ دوسروں نے بھی واضح کیا ہے 'اصولِ حق نما' سے مراد بودھ دھرم ہے۔

گلِ رنگیں

تو شناسائے[1] خراشِ عقدۂ مشکل نہیں　　اے گلِ رنگیں! ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں　　یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

---

[1] اقبال انیسویں صدی میں۔ ص ۴۶ اور ص ۴۳

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

تیرے حسن گلشن آرا پر جھکا جاتا ہے دل م لذتِ نظارہ سے بے خود ہوا جاتا ہے دل
پر لگا کر صورتِ بلبل اُڑا جاتا ہے دل م حلقہ ہائے موجِ نکہت میں پھنسا جاتا ہے دل

کام مجھ کو دیدۂ قدرت کے الجھڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا م

توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں
آہ! یہ دستِ جفا جو اے گلِ رنگیں! نہیں کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گلچیں نہیں

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

آہ اے گل! تجھ میں بھی جوہر وہی مستور ہے م جو دلِ انساں میں مضمر مثلِ موجِ نور ہے
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے م ہائے پھر مجھ سے جدائی کیوں تجھے منظور ہے

دل میں کچھ آتا ہے لیکن منہ سے کہہ سکتا نہیں
اور تکلیفِ خموشی کو بھی سہہ سکتا نہیں م

بھا گئے انداز تیرے اے گلِ رعنا مجھے م مار ڈالے گا خوشی سے جھومنا تیرا مجھے
کیوں نہیں ملتی یہ تسکینِ قرار افزا مجھے م ہاں سکھا دے کچھ سبق اپنی خموشی کا مجھے

باغِ ہستی میں پریشاں مثلِ بُو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں م

سوز بانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے راز وہ کیا ہے، ترے سینے میں جو مستور ہے؟
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے میں چمن سے دور ہوں، تو بھی چمن سے دور ہے

مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

یہ پریشانی مگر جمعیتِ عرفاں نہ ہو م یہ حنا بندِ کفِ محبوبۂ ایماں نہ ہو
یہ خزاں اپنی بہارِ گلشنِ رضواں نہ ہو م یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ انساں نہ ہو

ہے یہ تاریکی مگر اک شمعِ دل افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے م

یہ پریشانی مگر سامانِ جمعیت نہ ہو   یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو   رشکِ جامِ جم مرا آئینۂ حیرت نہ ہو

یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

مئی ۱۹۰۱ء

حاشیہ: یہ نظم مئی ۱۹۰۱ء میں چھپی۔ بانگِ درا میں لیتے وقت بہت ترمیم کی گئی جس کی تفصیل اختلافاتِ نسخ میں ملاحظہ ہو۔

غزل

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی   مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی؟
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا   خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی؟
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا   تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی!
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد   مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی
کھنچے خود بخود جانبِ طورِ موسیٰ   کشش تیری، اے شوقِ دیدار کیا تھی
کوئی یوں گیا ہے اِدھر سے نکل کر م قیامت تھی، بجلی تھی، رفتار کیا تھی
نہ چھوڑا کبھی بے وفائی نے تم کو م مری طرح یہ بھی وفادار کیا تھی!
ہزاروں کلیجے کو تھامے ہوئے ہیں م الٰہی وہ چشمِ فسوں کار کیا تھی؟

لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں م کرامت تھی • شرمِ گنہ گار کیا تھی؟

ٹھہرتا • ذرا سُن کے، کم بخت! آتا م وہاں نامہ بر! آج تکرار کیا تھی؟
مرا دل بھی اٹھنے کو چاہا نہ واں سے م فسوں تھا کوئی، بزمِ اغیار کیا تھی؟
یہ وعدہ کسی نے کیا، کیا سمجھ کر؟ م مری بزم تھی، بزمِ اغیار کیا تھی؟
چھپائی ہے زاہد، کوئی چیز تو نے م یہ شے، تیرے قرباں، مرے یار! کیا تھی؟
ترے ساتھ اڑتی گئی رہ گزر میں م مری خاک، اے دامنِ یار! کیا تھی؟
قفس میں ہے بلبل، تو ویراں چمن ہے م یہی رونقِ رنگِ گلزار کیا تھی؟
سلیقہ نہ تھا بات کرنے کا تم کو م مجھے یاد ہے، میری سرکار کیا تھی؟

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی، تیری گفتار کیا تھی

جون ۱۹۰۱ء

حواشی: اس غزل کے کچھ اشعار مخزن جون ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئے۔ اس کا سال بھی ۱۹۰۱ء ہے۔ سرود میں ص ۱۵۱ کے فٹ نوٹ میں اس کا ماخذ مخزن ۱۹۱۰ء دیا ہے جو سہوِ کتابت ہے صحیح جون ۱۹۰۱ء ہے۔

عہدِ طفلی

ہاں اٹھا اے ساحرِ ایام! یہ جادو ذرا م ابلقِ گردوں! نہ ہو محوِ رمِ آہو ذرا
ہائے پھر آ جا کہیں سے عمرِ رفتہ تو ذرا م لا وہ نظارہ پئے چشمِ تماشا جو ذرا

خون رلواتے ہیں ایامِ جوانی کے مزے
لا کہیں سے پھر وہی ایامِ طفلی کے مزے م

ہائے وہ عالم کہ عالم گیر تھی اپنی ادا ٭ غیرتِ صد فصلِ گل تھی اپنے گلشن کی ہوا
مکتبِ طفلی میں غیر از درسِ آزادی نہ تھا ٭ زنگ* افکارِ جہاں سے شیشۂ دل تھا صفا
مایۂ دارِ صد مسرت اک تبسم تھا مرا
گوشِ دل لگ جائیں جس پر وہ تکلم تھا مرا ٭
تھے دیارِ نو زمین و آسماں میرے لیے ٭ وسعتِ آغوشِ مادر، اک* جہاں میرے لیے
تھی ہر اک جنبش نشانِ لطفِ جاں میرے لیے ٭ حرفِ بے مطلب* تھی خود میری زباں میرے لیے
دردِ طفلی* میں اگر کوئی رلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیرِ در میں لطف آتا تھا مجھے
تکتے رہنا ہائے وہ پہروں تلک سوئے قمر ٭ وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اُس کے کوہ و صحرا کی خبر ٭ اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر
آنکھ وقفِ دید تھی، لب مائلِ گفتار تھا
دل* نہ تھا میرا، سراپا ذوقِ استفسار تھا
آہ اے دنیا! نمک پاشِ خراشِ دل ہے تو ٭ جس کے ہر دانے میں سو بجلی* ہے، وہ حاصل ہے تو
جو مسافر سے پرے رہتی ہے وہ منزل ہے تو ٭ جس کی لیلیٰ مایۂ وحشت ہو، وہ محمل ہے تو
تیرے* ہاتھوں کوئی جویائے سے تسکیں نہ ہو
ایمن از مارِ زمینِ گلستاں، گل چیں نہ ہو ٭

جولائی ۱۹۰۱ء

حاشیہ - یہ نظم مخزن جولائی ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی

غزل (منسوخ)

محبّت کو دولت بڑی جانتے ہیں ٭ اسے مایۂ زندگی جانتے ہیں
نرالے ہیں انداز دنیا سے اپنے ٭ کہ تقلید کو خودکشی جانتے ہیں
کوئی قید سمجھے مگر ہم تو اے دل! ٭ محبّت کو آزادگی جانتے ہیں

حسینوں میں ہیں کچھ وہی ہوش والے ۔۔۔ کہ جو حسن کو عارضی جانتے ہیں
جو ہے گلشنِ طور اے دل! تجھے ہم ۔۔۔ اسی باغ کی اک کلی جانتے ہیں

وہ کیا قدر جانیں گے میری وفا کی ۔۔۔ کہ ہوتے ہیں جو آدمی جانتے ہیں
بری چال ہوتی ہے بے اعتنائی ۔۔۔ یہی ہم تو اچھی بُری جانتے ہیں
کیا ماجرا ان کے گھر کا تو بولے ۔۔۔ قسم ہے، تجھے ہم ولی جانتے ہیں
بڑے شوخ و گستاخ ہیں رند زاہد ۔۔۔ مسلماں کو دو زخی جانتے ہیں
تری چال دیکھی ہوئی ہے جنھوں نے ۔۔۔ قیامت کو اک دل لگی جانتے ہیں
میں ہوں صاف گو مُنہ نہ کھلوائیے گا ۔۔۔ تمھاری وفا کو سبھی جانتے ہیں
گدا گر ہو اور بال ہوں سر کے لمبے ۔۔۔ مسلماں اس کو ولی جانتے ہیں
بدلنا پڑا ہم نشیں! نامہ بر کو ۔۔۔ اسے واں کے سب آدمی جانتے ہیں
عجب زندگانی ہے اقبال اپنی ۔۔۔ نہ مرجانتے ہیں، نہ جی جانتے ہیں
کہا میں نے "اقبال کو جانتے ہو؟" ۔۔۔ تو بولے یہ ہنس کر کہ "جی! جانتے ہیں"

نئی ہو، پرانی ہو، اقبال کو کیا؟
یہ حضرت تو بس ایک پی جانتے ہیں

جولائی ۱۹۰۱ء

حواشی۔ اس غزل کے پہلے پانچ شعر مخزن جولائی ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئے۔ بقیہ بعد میں ملتے ہیں۔ غزل میں تین مقطعے ہیں۔ پہلے میں 'مرنا' اور 'جینا' کی جگہ محض 'مر' اور 'جی' باندھنا سقم ہے۔ دوسرا مقطع داغ کے رنگ میں غنیمت ہے۔ تیسرے مقطع میں بھی 'پینا' کی جگہ 'پی' پر اکتفا کرنا کمزوری ہے۔ اسے جگن ناتھ آزاد نے اپنے مضمون "داغ کے اثرات اقبال پر" (رسالہ اقبالیات، لاہور، جولائی ستمبر ۱۹۸۶ء) ص ۴۲ پر دیا ہے۔ انھوں نے اسے مولانا صلاح الدین احمد کی بیاض سے نقل کیا ہے۔ یہ تو رش کاشمیری کی بیاض میں بھی درج تھا۔ آزاد لکھتے ہیں "مولانا صلاح الدین مرحوم جب موڈ

میں ہوتے تھے تو یہ مقطع پڑھ کے زوردار قہقہہ لگایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حیرت ہے کہ اقبال کی غزل کس ابتدا سے چل کے کس انتہا تک پہنچی"

غزل (منسوخ)

دل کو ذوقِ دیدؐ سے جس دم شناسائی ہوئی
آنکھ محشر کے نظارے کی تمنائی ہوئی

سر کے بل راہِ مدینہ میں جو میں چلنے لگا
شوق پر صدقے تمنائے جبیں سائی ہوئی

شوقِ گلزارِ مدینہ دل میں گھر کرنے لگا
خواہش جنت چھپی پھرتی ہے شرمائی ہوئی

چاک ، جب دستِ محبت نے کیا دامانِ میم
حسنِ مخفی سے نگاہوں کو شناسائی ہوئی

میرے اندازِ تپیدن نے اُسے بہکا دیا
جانتی ہے موت اپنے آپ کو آئی ہوئی

ہو گئی شرحِ رموز اتحادِ حسن و عشق
تیری یکتائی ہی آخر میری یکتائی ہوئی

لوگ بدنامِ محبت کہتے ہیں اقبال کو
غازۂ رخسارِ شہرت جس کی رسوائی ہوئی

حاشیہ - روزگارِ فقیر کی اس غزل کا زمانۂ تصنیف معلوم نہیں -

غزل (منسوخ)

بُرا ہوتا ہے عشقِ شعلہ رویانِ ستم گر بھی
یہ وہ آتش ہے جس میں خاک ہو جائے سمندر بھی

محبت میں دلِ مضطر ! جبھی کچھ لطف ملتا ہے
کہ ہو معشوق ظالم بھی جفا جُو بھی ستم گر بھی

پتے کی کہہ رہا ہوں یاد ہو گی تجھ کو اے واعظ !
وہ خلوت اور اس خلوت میں پھر آں کارِ دیگر بھی

کہیں سر رکھ دیا تھا بے خودی میں پائے جاناں پر
وہیں جوڑے کے تاروں میں رہا قسمت کا اختر بھی

شکایت کو میں دوڑوں اور تم جانے نہ دو مجھ کو
مزا آئے جو ہو یہ ماجرا یا رب روزِ محشر بھی

بجا ہے شیخ جی ! سب کچھ مگر میں کس طرح مانوں
اجی حضرت ! مرا دیکھا ہوا ہے آپ کو ش…

سیہ ناموں کو دوزخ کے کسی کونے میں رکھ دیں گے   خدا سے چارہ کر جائیں گے عاصی روزِ محشر بھی
بہ وقتِ ذبح دم اس کا نکل کر آ گیا مجھ میں   تمھارے ہاتھ میں جاں بخش ہو جاتا ہے خنجر بھی
وہ ناکامِ تمنا ہوں، اگر میں ڈوبنے جاؤں   تو اک پانی کے قطرے کے لیے ترسے سمندر بھی
مزا ہے گر جنوں میں بڑھ کے ناخن تیز ہو جائیں   ملیں بہرِ علاجِ جوشِ فرقت ہم کو نشتر بھی
چھپا کر حضرتِ واعظ نے[1] رکھا شیشۂ مے کو   مرے کام آ گئی آخر زمینِ زیرِ منبر بھی

جنابِ داغ کی اقبال! یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی، سخنور بھی

حاشیہ: یہ غزل حیاتِ داغ کی ہے صحیح سنہ معلوم نہیں مقطع سے پہلے کا شعر کچی جگہ ملتا ہے، باقی ۱۱ شعر روزگار ص ۲۷۷ - ۲۷۸ سے لیے گئے ہیں۔

[1] حافظ کے ذیل کے شعر کی طرف اشارہ ہے۔
واعظاں، کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند   چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

غزل (منسوخ)

یہ جیتے ہیں تو مرتے ہیں، جو مرتے ہیں تو جیتے ہیں   نرالی زندگی ہوتی ہے کچھ اللہ کے بندوں کی
بھلا جنت میں واعظ! دخل کیا سامانِ عشرت کو   وہ اک چھوٹی سی بستی ہے کسی کے دردمندوں کی
کسی کو قتل کرتے ہیں، کسی کی کھال اترتی ہے   یہ اُجرت ہے کتابِ عشق کے شیرازہ بندوں کی
ندامت حضرتِ واعظ کی ہوگی دید کے قابل   قیامت میں جو سُن لی تو نے یارب! اپنے بندوں کی
ملامت کر نہ ان کو، پیت کی ریتیں نرالی ہیں   انوکھی سب سے ہوتی ہیں نمازیں دردمندوں کی
خدا جانے چھپی ہے کون سے شعلے کے دامن میں   سپند آسا صدائے رفتہ تیرے دردمندوں کی
پھنسے گا کیا وہ بلبل جو نہ نکلا آشیانے سے   نہیں ہے مجھ کو اے صیاد! پروا تیرے پھندوں کی

نہ یہ دلی کی اُردو ہے، نہ یہ پورب[1] کی بولی ہے
زباں میری ہے اے اقبال! بولی دردمندوں کی

حاشیہ۱ - یہ غزل روزگار ۲۹۵ - ۲۹۴ نیز باقیات ص ۵۸۲ - ۵۸۱ پر ہے جو ظاہرا روزگار ہی سے لی گئی ہوگی۔ محض مقطع باقیات سوم میں ص ۵۰۱ پر بھی ہے۔ غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔

۱ پورب سے مراد لکھنؤ ہے۔

غزل (منسوخ)

نہیں کچھ تذکرے دیدار کے مستوں میں اے واعظ!
کسی کے ذکر کو سن کر تڑپ جانے کی باتیں ہیں

مزے لے لے کے واعظ کیا بیاں کرتا ہے کوثر کو
یہ ذکرِ خلد ہے یارب! کہ میخانے کی باتیں ہیں

مبارک ہو تجھے مستِ حیاتِ جاوداں رہنا
ہماری بزم میں، اے خضر، مر جانے کی باتیں ہیں

انا الحق کہہ کے بے تابانہ سولی پر لٹک جانا
نرالی تیرے دیوانے کی، مستانے کی باتیں ہیں

تو رمزِ عجز کو غافل! عبودیت سمجھ بیٹھا
ارے ناداں، یہ نادانوں کو سمجھانے کی باتیں ہیں

کسی پر جان دیتا ہے بھلا یوں بے غرض کوئی
یہ ساری اے ستم گر! دل کے آ جانے کی باتیں ہیں

بیاں واعظ نے جس دم کی کہانی طور و موسیٰ کی
تو میں سمجھا کہ یہ بھی میرے دیرانے کی باتیں ہیں

شہیدِ جستجو ہے فکرِ انساں بزمِ ہستی میں
یہ کس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی باتیں ہیں!

حاشیہ: یہ روزگار ص ۲۹۵ تا ۲۹۷ پر اور باقیات ص ۵۸۰ - ۵۷۹ پر ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں۔

غزل (منسوخ)

کب ہنسا تھا جو یہ کہتے ہو کہ 'رونا ہوگا'؟
ہو رہے گا، مری قسمت میں جو ہونا ہوگا

خندۂ گل پہ مجھے آج تو ہنس لینے دو
پھر اسی بات پہ رو لوں گا جو رونا ہوگا

ہم کو اقبال! مصیبت میں مزہ ملتا ہے
ہم تو اس بات پہ ہنستے ہیں کہ رونا ہوگا

حاشیہ۔ یہ غزل رخت ص ۱۰۹ اور باقیات ص ۴۵۵ پر ملتی ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں۔

غزل

عجب واعظ کی دیں داری ہے یارب　　عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں　　کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے　　چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے
ہم اپنی درد مندی کا فسانہ　　سنا کرتے ہیں ہے اپنے رازداں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

حاشیہ: اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ بانگ درا میں اس کے وقوع کی بنا پر اسے یہاں جگہ دی گئی ہے۔

ہم نچوڑیں گے دامن

(منسوخ)

سراپا ہوا مثلِ آغوشِ دریا　　نہانے کو اُترا جو وہ رشکِ گلشن
پئے دید کھولیں حبابوں نے آنکھیں　　اٹھائی نظارے کو موجوں نے گردن
اسیرِ خمِ زلف کیونکر نہ ہو خضر　　یہ قامت، یہ عارض، یہ سینہ، یہ جوبن
خمِ زلف موجوں نے اُڑ کر اُڑائے　　غضب ہے، پڑے رہزنوں کو بھی رہزن
ادھر سر حبابوں نے ساحل سے پٹکے　　نہا کر جو نکلا وہ 'دریا سے' پُرفن
ہوئی خوں فشاں، چشمِ گرداب ایسی　　کہ دریا ہوا غیرتِ صحنِ گلشن

جو دستِ حنائی سے دامن نچوڑا
کہا میں نے "اے رو کشِ شمع روشن!
کہیں آگ سے بھی ٹپکتا ہے پانی
بجا ہے جو کہیے تجھے سامری فن
مری چشمِ گریاں کی تجھ کو قسم ہے
صنم چھوڑ دے، ہم نچوڑیں گے دامن"

ستمبر ۱۹۰۱ء

حاشیہ: یہ نظم سرود ص ۸۲ اور باقیات میں ملتی ہے۔ باقیات میں اس کا ماخذ کشمیری گزٹ ستمبر ۱۹۰۱ء درج ہے۔ شروع میں ایک نوٹ ہے کہ اقبال نے ایک دوست کی فرمائش پر یہ نظم آٹھ دس منٹ میں کہی تھی۔

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

معجزِ کلکِ تصوّر ہے، و یا دیواں ہے یہ
یا کوئی تفسیرِ رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ
نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ
نورِ معنی سے دل افروزِ سخن داناں ہے یہ
نقش فریادی ہے تیری شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندّی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

طق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر — محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
اہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر — خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر ۱ میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں — ہو تخیل ۲ کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ے اب کیا ہوگئی ہندوستاں کی سرزمیں! — آہ اے نظارہ آموزِ نگاہ نکتہ بیں

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ، سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

ے جہاں آباد، اے گہوارۂ علم و ہنر! — ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
رّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر — یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

مخزن ستمبر ۱۹۰۱ء

حاشیہ: یہ نظم مخزن ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔
علہ مخزن میں نوٹ ہے "ملک جرمنی میں ایک مقام ہے جہاں گوئٹے شاعر مدفون ہے"
یوسف سلیم چشتی شرحِ بانگ درا میں ص ۲۴۵ پر مزید خبر دیتے ہیں کہ قصبہ ویمر کی آبادی پچاس ہزار ہے یہاں جرمن کے چار نامور ادیب گوئٹے، ہرڈر، شلر اور ویلینڈ رہتے تھے۔

غزل

۱ لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے — بجلیاں بے تاب ہوں جن کو جلانے کے لیے
۲ دیکھ لیتا ہوں جہاں تنکا کوئی چبھتا ہوا م — میں اٹھا لیتا ہوں اپنے آشیانے کے لیے

۳ وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے — میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لیے
۴ جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو — آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لیے
۵ اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت — آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے
۶ ہم صفیرو! تم مری عالی نگاہی دیکھنا — م شاخِ نخلِ طور تاڑی آشیانے کے لیے
۷ دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں — لوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کے لیے
۸ آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و ملت سے مری — ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لیے
۹ قصہ خواں نے کیوں سنا دی داستاں مجھ کو مری — م رہ گیا تھا میں ہی کیا اپنے فسانے کے لیے

۱۰ پاس تھا ناکامیِ صیاد کا اے ہم صفیر! — ورنہ میں اور اڑ کے آتا ایک دانے کے لیے
۱۱ عشق نے مٹی کو مسجودِ ملائک کر دیا — م ورنہ انساں اور فرشتے سر جھکانے کے لیے
۱۲ صبحِ پیدائش[2] یہ کہتا تھا کسی[3] کو دردِ عشق — م آنکھ رونے کے لیے، دل ٹوٹ جانے کے لیے

۱۴ ترک کر دی تھی غزل خوانی، مگر اقبال نے
یہ غزل لکھی ہمایوں[1] کو سنانے کے لیے

نومبر ۱۹۰۱ء

حواشی ۔ یہ غزل مخزن نومبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی ۔ اس کے سات شعر بانگ میں لیے گئے

[1] ہمایوں سے مراد میاں شاہ دین ہمایوں ہیں ۱۸۹۰ء میں ولایت سے بیرسٹری کر کے لوٹے ۔ بعد میں جسٹس ہو گئے ۔ ۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو انتقال ہو گیا ۔ رسالہ ہمایوں لاہور انھیں سے متعلق ہے ۔ ان کے تفصیلی حالات عبداللہ قریشی نے اقبال معاصرین کی نظر میں، میں ص ۱۱۱ تا ۱۱۴ پر دیے ہیں ۔

ابرِ کوہسار

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا — ابرِ کہسار[1] ہوں، گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا[2]، کبھی گلزار ہے مسکن میرا — شہر و ویرانہ[3] مرا، بحر مرا، بن میرا

کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا ناقۂ شاہد رحمت کا حُدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا

بن کے گیسو رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جو آتا ہوں بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں

دل لگی کوہ کے چشموں سے مجھے بھاتی ہے
زندگی اپنی اسی طرح گزر جاتی ہے م

سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں

غنچۂ گل مرے سائے سے چٹک جاتا ہے م اخترِ قسمت گلزار چمک جاتا ہے
میرا ہر قطرہ گلستاں پہ ٹپک جاتا ہے م دلِ بلبل کی طرح گل سے اٹک جاتا ہے

سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں م

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے اور پرندوں کو کیا محوِ ترنم میں نے
سر پہ سبزے کے کھڑے ہو کے کہا قُم میں نے غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے

فیض سے میرے، نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

ہے مجھے دامنِ کہسار میں، سُننے کا مزا م نغمۂ دخترِ دوشیزۂ دہقاں کی صدا
وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اُترنا اِس کا م حشر ڈھاتی ہے یہ آہستہ خرامی کی ادا

سر پہ وہ دودھ کی ٹھلیا کو اٹھاتے آنا
اور تھم تھم کے اترتے ہوئے گاتے آنا م

قدم اپنا جو سوئے شہر و دیار اُٹھتا ہے م شیشۂ خاطرِ محزوں سے غبار اٹھتا ہے
کوئی کہتا ہے کہ وہ ابرِ بہار اُٹھتا ہے م اور کوئی جوشِ طرب میں یہ پکار اٹھتا ہے
تُند و پُر شور و سیہ مست ز کہسار آمد
میکشاں! مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد م

میری عادت میں ہے، اک شور مچاتے آنا م سیرِ کہسار سے طنبور بجاتے آنا
چھیڑ سے باغ کی کلیوں کو ہنساتے آنا م شکوہ ہائے ستمِ مہر مٹاتے آنا
توسنِ باد پہ اڑتا ہوا آتا ہوں میں
گرمیِ مہر کے کشتوں کا مسیحا ہوں میں م

اٹھ گیا موج ہوا سے کبھی دامن جو ذرا م ہو گیا عارضِ خاتونِ فلک بے پردا
وہ ضیا گسترِ عالم، وہ عروسِ زیبا م نام انسان کی بولی میں، قمر ہے جس کا
نظر آتے ہی مگر پردہ نشیں چھپتے ہیں
روئے تاباں کی جھلک دے کے حسیں چھپتے ہیں م

کی ذرا دست درازی جو ہوا نے مجھ پر م چاک دامن سے دمکتے نظر آئے اختر
مجھ سے، چلنے میں نہ ہوگا، کوئی غافل بڑھ کر م گر پڑے ہیں۔ مرے دامن کی گرہ کھل کے گہر
مقصدِ ہر صدفِ قلزمِ زخار ہوں میں
م ابرِ رحمت ہوں، گہر دار، گہر بار ہوں میں

نومبر ۱۹۰۱ء

حواشی۔ یہ نظم مخزن نومبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ بانگ میں لیتے وقت اس کے چند بند حذف کر دیے گئے۔

کلیم الدین احمد کی رائے میں اس نظم پر شیلی کی انگریزی نظم[1] THE CLOUD کا اثر ہے۔ راقم الحروف کو انگریزی اور اُردو نظم میں کوئی مماثلت نہیں دکھائی دی۔

ع[1] خاتونِ فلک سے مراد چاند ہے۔ یہ انگریزی تصوّر ہے کیونکہ وہاں چاند کو مونث مانا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں چاند مذکر ہے، وہ بچوں کا ماموں ہے۔ لوری ہے۔ 'چندا ماما دور کے'

ایک مکڑا اور مکھی

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا — اس راہ سے ہوتا ہے گذر روز تمھارا

لیکن مری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت — بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا

بڑھ کر کوئی شے ملنے ملانے سے نہیں ہے — م — ہو یہ بھی نہ دنیا میں تو کس کام کا جینا

غیروں سے نہ ملیے تو کوئی بات نہیں ہے — اپنوں سے مگر چاہیے یوں کھنچ کے نہ رہنا

ہر طرح سے تیار ہوں خدمت کو تمھاری — م — اوروں کی طرح مجھ کو دکھاوا نہیں آتا

آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری — وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا

مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی — حضرت کسی نادان کو دیجے گا یہ دھوکا

اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اترا

مکڑے نے کہا' واہ فریبی مجھے سمجھے — تم سا کوئی نادان زمانے میں نہ ہوگا

منظور تمھاری مجھے خاطر تھی، وگرنہ — کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا

اڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے — ٹھیرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں برا کیا

کیجے نہیں آرام کہ یہ آپ کا گھر ہے — م — اب وقت ہے کھانے کا نہیں کھائیے کھانا

ڈرتا ہوں کہ دشمن کہیں بیمار نہ ہو جائیں — رہ جائیں نہ پر تھک کے' مجھے ہے یہی کھٹکا

---

[1] اُردو شاعری پر ایک نظر حصّہ دوم ص ۸۸ بحوالہ ڈاکٹر سید حامد حسین : علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں مجلہ سیفیہ بھوپال۔ یادگارِ اقبال نمبر

اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں　　باہر سے نظر آتا ہے، چھوٹی سی یہ کٹیا
لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے　　دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے　　ہر شخص کو ساماں یہ میسّر نہیں آتا
مکھی نے کہا خیر یہ سب ٹھیک ہے لیکن　　میں آپ کے گھر آؤں، یہ امید نہ رکھنا

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ، تو پھر اٹھ نہیں سکتا

مکڑے نے کہا دل میں، سنی بات جو اس کی　　پھانسوں اسے کس طرح، یہ کم بخت ہے دانا
ان باتوں سے قابو میں نہ آئے گی یہ مکھی　م　اب اور کوئی چاہیے دینا اسے چکمہ
سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں　　دیکھو جسے دنیا میں، خوشامد کا ہے بندا
یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے، بڑی بی　　اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رُتبا
ہوتی ہے اسے آپ کی صورت سے محبّت　　ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں　　سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا
پہنائی ہے کیا آپ کو پوشاک سنہری　م　'پر' آپ کے چٹّے ہیں کہ چاندی کا ہے گہنا
یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی!　　پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا
مکھی نے سنی جب یہ خوشامد، تو پسیجی　　بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا
انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں　　سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے　　پاس آئی تو مکڑے نے اُچھل کر اُسے پکڑا
بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی　　آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اُڑایا

لڑکو امرے قصّے کو جو دانا ہو تو سمجھو
م　مکھی کی طرح ہو نہ کہیں حال تمھارا
پھنس جاتے ہیں جو سنتے ہیں تعریف کی باتیں
م　لوگوں کی خوشامد پہ کہیں کان نہ دھرنا

حاشیہ: یہ نظم MARY HOWITT (۱۷۹۹ء-۱۸۸۸ء) کی انگریزی نظم

THE SPIDER AND THE FLY سے ماخوذ ہے۔ اس کا انگریزی متن ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کے ایک مضمون[1] سے لے کر اس کتاب کے آخر میں ضمیمے میں دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین کے مطابق[2] انگریزی نظم سب سے پہلے ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُردو نظم بانگِ درا میں شامل ہے اس کا اور بچوں سے متعلق دوسری نظموں کا زمانہ معلوم نہیں۔ بانگِ درا میں اس کے وقوع کو دیکھتے ہوئے اسے یہاں دیا جا رہا ہے۔

ایک پہاڑ اور گلہری

(ماخوذ از ایمرسن)

بچوں کے لیے

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے　　تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
ذرا سی چیز ہے، اس پر غرور کیا کہنا!　　یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور! کیا کہنا!
خدا کی شان ہے، ناچیز چیز بن بیٹھیں!　　جو بے شعور ہوں، یوں با تمیز بن بیٹھیں
ذرا سے قد پہ تجھے چاہیے نہ اترانا　م　کہ میرے سامنے تیرا گھمنڈ ہے بے جا
مرے طفیل سے پانی ملا ہے دریا کو　م　دبائے بیٹھا ہوں دامن میں دشت و صحرا کو
فلک کی شان سے آنکھیں لگائے بیٹھا ہوں　م　بنوں کو پیٹھ پہ اپنی اٹھائے بیٹھا ہوں
اسے جو چومتی ہیں اُٹھ کے چوٹیاں میری　م　بلائیں لیتا ہے جھک جھک کے آسماں میری
جو برف ہے مرے سر پہ، بدن پہ سبزی ہے　م　ہری قمیص پہ گویا سفید پگڑی ہے

---

[1] ڈاکٹر اکبر حسین قریشی: اقبال کی بعض نظموں کے ماخذ، رسالہ اُردو کراچی جنوری ۱۹۶۶ء ۔ ص ۱۹

[2] ڈاکٹر سید حامد حسین: علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں۔ مجلہ سیفیہ۔ یادگارِ اقبال نمبر ۔ ۸۰ - ۷۹ ۱۹ء
ص ۵۰۔

بڑا، پہاڑ ہوں میں، شان ہے بڑی میری م کسی سے ہو نہیں سکتی برابری میری
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے، تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں، جانور غریب کہاں

کہا یہ سن کے گلہری نے منہ سنبھال ذرا یہ کچی باتیں ہیں دل سے انھیں نکال ذرا
ذرا سی بات ہے، انصاف سے مگر کہنا م یہ زندگی ہے کوئی اس طرح پڑے رہنا!
قدم نہ اٹھے تو جینا ہے موت سے بدتر ہزار عیب سے یہ ایک عیب ہے بڑھ کر
جو میں بڑی نہیں تیری طرح، تو کیا پروا! نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے کوئی بڑا کوئی چھوٹا، یہ اس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے
قدم اُٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں نری بڑائی ہے، خوبی ہے اور کیا تجھ میں؟
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو
قلم بنا کے نہ لاتا اگر مری دُم کا م ہنر کو اپنے، مصوّر بھلا دکھا سکتا؟
جہاں کے باغ کی گویا سنگار ہے ہر چیز م کہ اپنی اپنی جگہ شان دار ہے ہر چیز
نہیں کسی کو حقارت سے دیکھنا اچھا م یہ بات جس نے سمجھ لی وہی رہا اچھا
پہاڑ سن کے گلہری کی بات شرمایا م مثل ہے وہ کہ بڑے بول کا ہے سر نیچا

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

حواشی۔ یہ نظم امریکی شاعر R. W. EMERSON (۱۸۰۳ء-۱۸۸۲ء) کی انگریزی نظم THE MOUNTAIN AND THE SQUIRREL سے ماخوذ ہے۔ اس کا انگریزی متن ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کے مضمون نیز حسن الدین احمد کی کتاب سازِ مغرب حصّہ سوم میں موجود ہے۔ وہاں سے لے کر اس مجموعے کے آخر میں ضمیمے میں دیا گیا ہے۔ انگریزی نظم مختصر ہے۔ پہاڑ تو محض دو لفظ کہتا ہے۔ اردو میں پہاڑ کی زبان سے طولانی لاف گزاف اقبال کی اُپج ہے۔

انگریزی میں گلہری کا قول بھی مختصر ہے۔ انگریزی نظم کے آخر میں نہ پہاڑ شرماتا ہے نہ کوئی اخلاقی نتیجہ نکالا جاتا ہے۔
یہ نظم بانگِ درا میں شامل ہے۔ اس کا بھی زمانہ معلوم نہیں۔

ایک گائے اور بکری

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں — تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں — ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
جن کے پانی میں وہ صفائی تھی — م — نظر آتے تھے تہہ کے کنکر بھی
کیا کہوں میں، اُگا تھا کیا سبزہ — م — کوئی مخمل کا فرش تھا سبزہ
تھے اناروں کے بے شمار درخت — اور پیپل کے سایہ دار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں — طائروں کی صدائیں آتی تھیں
کسی ندی کے پاس اک بکری — چرتے چرتے کہیں سے آ نکلی
جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا — پاس اک گائے کو کھڑے پایا
پہلے جھک کر اسے سلام کیا — پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں؟ — گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں
کٹ رہی ہے بری بھلی اپنی — ہے مصیبت میں زندگی اپنی
جان پر آ بنی ہے۔ کیا کہیے! — اپنی قسمت بُری ہے کیا کہیے!
دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں — رو رہی ہوں بُروں کی جان کو میں
زور چلتا نہیں غریبوں کا — پیش آیا لکھا نصیبوں کا
آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے — اس سے پالا پڑے خدا نہ کرے
دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے — ہوں جو دبلی تو بیچ کھاتا ہے

ھکنڈوں سے غلام کرتا ہے　　کن فریبوں سے رام کرتا ہے
ں کے بچّوں کو پالتی ہوں میں　　دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
لے نیکی کے یہ بُرائی ہے　　میرے اللہ تری دُہائی ہے
س چلے تو کہیں نکل جاؤں　　دودھ مکّھن سے اس کو ترساؤں
بھی آخر خدا کے ہیں بندے　　روز کے ناز اُٹھا نہیں سکتے
غلامی ہمیں نہیں بھاتی　　میں تو اس قید سے ہوں گھبراتی
ں ہمیں قید میں جو رکھتا ہے　　ہم نے کیا جانے، کیا بگاڑا ہے
نا غصّہ کبھی نکالوں گی　　دُم کی چابک سے مار ڈالوں گی
سے کرتا ہے یہ مُوا اَن بَن　　توڑ ڈالوں گی دودھ کے برتن
ہی انصاف سے ذرا کہتا　　آدمی ہے کہ ظلم کا پتلا
ں کے بکری یہ ماجرا سارا　　بولی ، ایسا گلہ نہیں اچھا
شکایت سے منہ کو بند کرو　　ٹیڑھا رستہ نہ تم پسند کرو
ت سچّی ہے سب مزا لگتی　　میں کہوں گی مگر خدا لگتی
براگہ ' یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا　　یہ ہری گھاس اور یہ سایا
نے سہنے کو ہے مکاں ایسا　　خوف سردی کا ہے نہ گرمی کا
سی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں!　　یہ کہاں بے زباں غریب کہاں!
زے آدمی کے دم سے ہیں　　لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
کے دم سے ہے اپنی آبادی　　قید ہم کو بھلی کہ آزادی ؟
ں کے ہوتے خطر نہیں ہم کو　　شیر، چیتے کا ڈر نہیں ہم کو
طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا　　واں کی گزران سے بچائے خدا
یہ احسان ہے بڑا اس کا　　ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا
آرام کی اگر سمجھو　　آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو
ئے سن کر یہ بات شرمائی　　آدمی کے گلے سے پچھتائی

دل میں پر کھا بھلا بُرا اُس نے اور، کچھ سوچ کر، کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

حاشیہ: انگریزی کی مشہور نظم TWINKLE TWINKLE LITTLE STAR کی[1] مصنفہ JANE TAYLOR (۱۷۸۳ تا ۱۸۲۴ء) ہے۔ یہ نظم اسی کی THE COW AND THE ASS سے ماخوذ ہے۔ اس کا انگریزی متن کتاب کے آخر میں ضمیمے میں دیا ہے جو ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کے محولہ سابق مضمون سے ماخوذ ہے۔ اقبال نے گدھے کو بدل کر بکری بنا دیا ہے تاکہ ہندوستانی ماحول کے مطابق ہو جائے اس نظم میں بھی اقبال نے کسی قدر اضافہ کیا ہے۔
بانگ کی اس نظم کا زمانہ معلوم نہیں۔

عله اس مصرع میں چراگاہ کی ہائے ملفوظ زائد ہے اور ساقط ہوتی ہے جو مناسب نہیں۔ قیاس ہے کہ اقبال نے چراگہ لکھا ہوگا جس سے وزن ٹھیک ہو جاتا ہے۔ انھوں نے تیسویں شعر میں 'چراگہہ' لکھا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ پہلے شعر میں بھی چراگہ نہ باندھا ہو۔

عله چابک مذکر ہے لیکن اقبال نے اس نظم میں، نیز اگلی نظم میں، مونث باندھا ہے۔ 'کی' کی جگہ 'کے' چاہیے۔

گھوڑوں کی مجلس

(منسوخ)

اک روز کسی گھوڑے کے دل میں یہ سمائی انسان مری قوم سے کرتا ہے بُرائی

---

[1] ڈاکٹر سید حامد حسین: علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں۔ مجلۂ سیفیہ۔ یادگارِ اقبال نمبر جلد ہفتم ۸۰-۱۹۷۹ء بھوپال ص ۵۲

رکھا ہے مرے بھائیوں کو اس نے جکڑ کر تدبیر ہو ایسی کہ ملے ان کو رہائی
میں قوم کی ذلت نہ کبھی دیکھ سکوں گا اک آگ سی ہے اس نے مرے جی میں لگائی
یہ ٹھان کے جنگل کے رفیقوں کو بلایا سب آئے کہ اس بات میں تھی سب کی بھلائی
حاضر ہوئے بوڑھے بھی بچھیرے بھی جواں بھی دیتے ہوئے انسان کی سختی کی دہائی
پہلے تو ہری گھاس سے کی ان کی تواضع مہمانوں کو پھر بات، جو تھی دل کی، بتائی
اک گھوڑے کو کرسی پہ صدارت کی بٹھا کر سب نے یہ کہا آپ کریں راہنمائی
ہونے لگا گھوڑوں کا بڑی دھوم سے جلسہ دینے لگی اس قوم کی اک شان، دکھائی
کچھ دیر تو ہوتی رہیں آپس میں صلاحیں ہر ایک نے تدبیر رہائی کی بتائی
مجلس سے اُٹھا آخرِ کار ایک بچھیرا اور اُٹھ کے متانت سے زباں اپنی ہلائی
تقریر پہ سو جان سے صدقے تھی فصاحت تھی گھوڑے کی باتوں میں قیامت کی صفائی
بولا کہ مری قوم میں غیرت نہیں باقی کس طرح ہو پھر غیر کے ہاتھوں سے رہائی
جینا جو ہمارا ہے وہ ذلت کا ہے جینا ہم نے تو بزرگوں کی بھی عزت ہے گنوائی
ہم گاڑیاں انسان کی کھینچیں، یہ غضب ہے محنت کریں ہم اور یہ کھا جائے کمائی
سردی سے رہیں ہم تو طویلوں میں ٹھٹھرتے لیٹے یہ حویلی میں، لیے گرم رضائی
گھڑ دوڑ میں ہم اپنا بہاتے ہیں پسینہ جو اس کی بھلائی ہے، وہ ہے اپنی بُرائی
کیا کیسے، مصیبت ہمیں پڑ جاتی ہے کیسی ہو جائے جو ظالم کے قبیلوں میں لڑائی
لوہے کی لگامیں ہیں تو چمڑے کی ہے چابک افسوس کہ غیرت نہ مری قوم کو آئی
روئے کوئی اس قوم کے دکھڑے کو کہاں تک ہم سمجھے ہیں، اے وائے غلامی میں بڑائی

اے قوم! یہ اچھا نہیں ہر روز کا جلنا
زیبا ہے ہمیں قید سے انساں کا نکلنا

تقریر ہوئی ختم تو بیٹھا وہ بچھیرا ہر گھوڑے نے مجلس میں دلیلوں کو سراہا
ہر بات بچھیرے کی سراہی گئی لیکن کچھ کہنے پہ آمادہ تھا اک اور بھی گھوڑا
لاغر تھا بہت گرچہ بڑھاپے کے سبب سے اُٹھا کہ اسے قوم کو تھا راہ پہ لانا

بولا کہ مرے دوست کی باتیں ہیں بہت خوب	پر جوش جوانی نے کیا ہے اُسے اندھا
مانا کہ اسے قوم کی ذلّت نہیں بھاتی	بچّہ ہے، ابھی اس نے زمانہ نہیں دیکھا
ہے زور دیا آپ نے انساں کے ستم پر	تقریر کو ہے خوب مثالوں سے سجایا
سختی سے ہمیں پیش وہ آتا ہے، یہ مانا	سختی میں جو راحت ہو تو سختی ہے گوارا
انسان کے احسان کو سمجھا نہیں تم نے	دیتا ہے طویلوں میں تمھیں وقت پہ دانا
رہنے کو طویلوں میں سمجھتے ہو بُرا تم	جنگل کی رہائش میں ہے سو طرح کا کھٹکا
دن رات وہاں گھات میں رہتے ہیں درندے	پینے کا جو پانی ہے وہ اکثر نہیں ملتا
ہے قید میں انسان کی، راحت ہی سراسر	ہر حال میں ہے اس کی غلامی ہمیں زیبا
دن آتے ہیں ایسے بھی کہ بارش کی کمی سے	ہو گھاس نہ پیدا تو یہ رکھتا ہے ذخیرا
یہ آپ پہنتا ہے جو کم خواب کے کپڑے	زربفت کی جھولوں سے ہے تم کو بھی سجاتا
بیمار جو ہو جاؤ تو کرتا ہے دوا بھی	کرتا ہے ہمارے لیے نقصاں بھی گوارا
گھڑ دوڑ کے گھوڑوں کی جو ہوتی ہے تواضع	آرام وہ حیواں کو میسّر نہیں ہوتا
آرام ہیں لاکھوں ہمیں انسان کے دم سے	میرا تو شکایت پہ کبھی لب نہ کھلے گا
میں نے تو بتا دی ہے تمھیں سب کے بھلے کی	مانے جو نہ کوئی تو مجھے کچھ نہیں پروا
ان باتوں سے حیران سے کچھ رہ گئے گھوڑے	تقریر وہ کی اس نے کہ جادو تھی سراپا

سب مان گئے، دور شکایت ہوئی سب کی
تھی بوڑھے کی تقریر میں تاثیر غضب کی

حاشیہ: ظاہرا یہ نظم طبع زاد ہے جو نظم گائے اور بکری کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ یہ روزگار اور باقیات میں ملتی ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں۔ اسے جانوروں کی دوسری نظموں کے ساتھ جگہ دے دی ہے۔

۱؎ اس نظم میں بھی اقبال نے چابک کو مونث باندھا ہے۔ مذکر صحیح ہے اس لیے "کہا چابک" کے بجائے "کا چابک" ہونا چاہیے۔

شہد کی مکھی

اس پھول پہ بیٹھی، کبھی اس پھول پہ بیٹھی
بتلاؤ تو، کیا ڈھونڈتی ہے شہد کی مکھی؟

کیوں آتی ہے، کیا کام ہے گلزار میں اس کا؟
یہ بات جو سمجھاؤ تو سمجھیں تمھیں دانا

چہکارتے پھرتے ہیں جو گلشن میں پرندے
کیا شہد کی مکھی کی ملاقات ہے ان سے؟

عاشق ہے یہ قمری کی، کہ بلبل پہ ہے شیدا؟
یا کھینچ کے لاتا ہے اسے سیر کا چسکا؟

دل باغ کی کلیوں سے تو اٹکا نہیں اس کا؟
بھاتا ہے اسے ان کے چٹکنے کا تماشا

سبزے سے ہے کچھ کام کہ مطلب ہے صبا سے؟
یا پیار ہے گلشن کے پرندوں کی صدا سے؟

بھاتا ہے اسے پھول پہ بلبل کا چہکنا؟
یا سرو پہ بیٹھے ہوئے قمری کا یہ گانا؟

پیغام کوئی لاتی ہے بلبل کی زبانی؟
یا کہتی ہے یہ پھول کے کانوں میں کہانی؟

کیوں باغ میں آتی ہے، یہ بتلاؤ تو جانیں
کیا کہنے کو آتی ہے، یہ سمجھاؤ تو جانیں

بے وجہ تو آخر کوئی آتا نہیں اس کا
ہشیار ہے مکھی، اسے غافل نہ سمجھنا

بے سود نہیں، باغ میں اس شوق سے اڑنا
کچھ کھیل میں یہ وقت گنواتی نہیں اپنا

کرتی نہیں کچھ کام اگر عقل تمھاری
ہم تم کو بتاتے ہیں، سنو بات ہماری

کہتے ہیں جسے شہد، وہ اک طرح کا رس ہے
آوارہ اسی چیز کی خاطر یہ مگس ہے

رکھا ہے خدا نے اسے پھولوں میں چھپا کر
مکھی اسے لے جاتی ہے، چھتے میں اڑا کر

ہر پھول سے یہ چوستی پھرتی ہے اسی کو
یہ کام بڑا ہے، اسے بے سود نہ جانو

مکھی یہ نہیں ہے، کوئی نعمت ہے خدا کی
ملتا نہ ہمیں شہد، یہ مکھی جو نہ ہوتی

اس شہد کو پھولوں سے اڑاتی ہے یہ مکھی
خود کھاتی ہے، اوروں کو کھلاتی ہے یہ مکھی

انسان کی، یہ چیز غذا بھی ہے، دوا بھی
قوت ہے اگر اس میں، تو ہے اس میں شفا بھی

رکھتے ہو اگر ہوش تو اس بات کو سمجھو
تم شہد کی مکھی کی طرح علم کو ڈھونڈو

یہ علم بھی اک شہد ہے اور شہد بھی ایسا
دنیا میں نہیں شہد کوئی اس سے مصفا

ہر شہد سے، جو شہد ہے میٹھا، وہ یہی ہے　　کرتا ہے جو انسان کو دانا، وہ یہی ہے
یہ عقل کے آئینے کو دیتا ہے صفائی　　یہ شہد ہے انساں کی، وہ مکھّی کی کمائی
سچ سمجھو تو انسان کی عظمت ہے اسی میں　　اس خاک کے پتلے کو سنوار ہے اسی تے
پھولوں کی طرح اپنی کتابوں کو سمجھنا
چسکا ہو اگر تم کو بھی کچھ علم کے رس کا

حاشیہ: روزگار کی اس نظم کا زمانہ معلوم نہیں۔ ظاہرا جانوروں کی دوسری نظموں کے ساتھ ہی کہی گئی ہوگی

بچے کی دعا

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری　　زندگی شمع کی صورت ہو، خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے　　ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
میری خوشبو سے معطر ہو زمانہ سارا　　بن کے بلبل ہو مرے حسن پہ دنیا شیدا
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب!　　علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!
علم دنیا کے چمن میں ہو اگر گل کی طرح　　میں چہکتا رہوں اس پھول پہ بلبل کی طرح
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا　　دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
دکھ اٹھائے مرے ہاتھوں سے نہ جاں دار کوئی　　اے خدا! عمر اسی طرح بسر ہو میری
دکھ بھی آ جائے تو دل ہو نہ پریشاں میرا　　شکر ہر حال میں ہو میری زباں پر تیرا
میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو، اس رہ پہ چلانا مجھ کو

حاشیہ: یہ نظم METILDA BETHAM کی انگریزی نظم A CHILD'S HYMN سے ماخوذ ہے۔ انگریزی متن مجموعے کے آخر میں ضمیمے میں ملاحظہ ہو۔ یہ حسن الدین احمد کی سازِ مغرب حصہ ہشتم سے ماخوذ ہے۔ بانگ درا کی اس نظم کا زمانہ معلوم نہیں اسے بچوں کی نظموں کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے۔

ھمدردی

(ماخوذ از ولیم کوپر)

بچوں کے لیے

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا ۔ بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی ۔ اُڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک ۔ ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
آنکھوں سے ٹپک رہے تھے آنسو ۔ کہتا تھا کہ ہائے اب کروں کیا
پھیلی ہے یہ رات کی سیاہی ۔ رستہ نہیں گھونسلے کا ملتا
خورشید کے ڈوبنے سے پہلے ۔ گھر کو مجھے چاہیے تھا جانا
بچے مرے دیر سے ہیں بھوکے ۔ دے گا انھیں کون جا کے دانا

مرجائیں نہ وہ غریب ڈر کر
گر جائیں نہ گھونسلے سے باہر

سن کر بلبل کی آہ وزاری ۔ جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان ودل سے ۔ کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری ۔ میں راہ میں روشنی کروں گا
روشن ہیں جو پر مرے، تو مجھ کو ۔ آسان ہے راہ کا دکھانا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل ۔ چمکا کے مجھے دیا بنایا
اوروں کے جو کام میں نہ آؤں ۔ کس کام کا پھر مرا ہے جینا؟

بلبل کو، اڑا، یہ کہہ کے جگنو   لے کے اسے گھونسلے میں آیا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ڈاکٹر سید حامد حسین[1] نے لکھا ہے کہ یہ انگریزی شاعر ولیم کوپر کی نظم NIGHTINGALE AND THE GLOW WORM سے متاثر ہے۔ کوپر کا زمانہ ۱۸۰۰-۱۷۳۱ء ہے۔ انگریزی نظم کا متن 'ایک پرندہ اور جگنو' کے سلسلے میں ضمیمے میں دیا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقبال کی نظم ہمدردی کا کوپر کی اس نظم سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔

اقبال کی نظم کا صحیح زمانہ معلوم نہیں۔ بانگ میں اس کے مقام کی مناسبت سے بچوں کی دوسری نظموں کے سلسلے میں دی جارہی ہے۔

ماں کا خواب

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب   بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جارہی ہوں کہیں   اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
کوئی اس سمے کا بیاں کیا کرے   اندھیرا خموشی بغل گیر تھے
سیاہی کا نقشہ تھا ایسا جما   اُجالا کہیں نام کو بھی نہ تھا
ستارے فلک پر چمکتے نہ تھے   کہ ظلمت کے ڈر سے تھے سہمے ہوئے
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال   قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال
یکایک دکھائی دیا چاندنا   ہوا جس سے کچھ کچھ مجھے حوصلہ

---

[1] ڈاکٹر حامد حسین، علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں۔ مجلۂ سیفیہ یادگار اقبال نمبر ص ۶۷،۹۹ بھوپال ۸۰-۱۹۷۹ء

بڑی دور تھی، مجھ سے یہ روشنی م مگر رفتہ رفتہ قریب آ گئی
کہوں کیا جماعت وہ بچوں کی تھی م کہ معصومیت چلتی پھرتی ہوئی
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
زمرّد سی پوشاک پہنے ہوئے دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں خدا جانے، جانا تھا ان کو کہاں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟
جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
جدائی کے صدمے سہوں کس طرح م جو گذری ہے مجھ پر کہوں کس طرح
پریشاں ترے غم میں رہتا ہے دل م عجب طرح کے رنج سہتا ہے دل
اجل سے بھی بدتر ہے جینا مرا م لٹا دن دہاڑے خزینہ مرا
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب دیا اس نے مُنہ پھیر کر یوں جواب
رلاتی ہے تجھ کو جدائی مری نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا 'دیا' پھر دکھا کر یہ کہنے لگا

سمجھتی ہے تو، ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

حاشیہ: یہ نظم W. BARNES کی انگریزی نظم THE MOTHER'S DREAM سے ماخوذ ہے۔ انگریزی نظم حسن الدین احمد کی سازِ مغرب حصّہ سوم سے لے کر ضمیمے میں درج کی جاتی ہے۔ اس نظم کا زمانہ معلوم نہیں۔ بانگ کی ترتیب کے مطابق بچوں کی نظموں کے سلسلے میں درج کر دی گئی ہے رزاق کے مقدمے ص ۹۲ پر اس نظم کا عنوان 'ماں اور بچہ' دیا ہے۔

جہاں تک ہو سکے، نیکی کرو

(بچوں کے لیے)

کہتے ہیں ایک سال نہ بارش ہوئی کہیں
گرمی سے آفتاب کی تپنے لگی زمیں

تھا آسمان پر نہ کہیں ابر کا نشاں
پانی ملا نہ جب تو ہوئیں خشک کھیتیاں

لالے پڑے تھے جان کے ہر جاندار کو
اجڑے چمن، ترستے ترستے بہار کو

مُنھ تک رہی تھی خشک زمیں آسمان کا
امید ساتھ چھوڑ چکی تھی کسان کا

بارش کی کچھ امید نہ تھی اس غریب کو
یہ حال تھا کہ جیسے کوئی سوگوار ہو

اک دن جو اپنے کھیت میں آکر کھڑا ہوا
پودوں کا حال دیکھ کے بے تاب ہو گیا

ہر بار آسماں کی طرف دیکھتا تھا وہ
بارش کے انتظار میں گھبرا رہا تھا وہ

ناگاہ ایک ابر کا ٹکڑا نظر پڑا
لاتی تھی اپنے ساتھ اڑا کر جسے ہوا

پانی کی ایک بوند نے تاکا اِدھر اُدھر
بولی وہ، اس کسان کی حالت کو دیکھ کر

"ویران ہو گئی ہے جو کھیتی غریب کی
ہے آسمان پر نظر اس بدنصیب کی

دل میں یہ آرزو ہے کہ اس کا بھلا کروں
یعنی برس کے کھیت کو اس کے ہرا کروں"

بوندوں نے جب سنی، یہ سہیلی کی گفتگو
ہنس کر دیا جواب کہ "اللہ رے آرزو!

تو اک ذرا سی بوند ہے اتنا بڑا یہ کھیت
تیرے ذرا سے نم سے نہ ہوگا ہرا یہ کھیت

تیری بساط کیا ہے کہ اس کو ہرا کرے
ہو خود جو ہیچ، کیا وہ کسی کا بھلا کرے"

اس بوند نے مگر یہ بگڑ کر دیا جواب
کہہ دی وہ بات، جس نے کیا سب کو لاجواب:

"مانا کہ ایک بوند ہوں، دریا نہیں ہوں میں
قطرہ ذرا سا ہوں کوئی چھینٹا نہیں ہوں میں

مانا کہ میرا نم کوئی دریا کا نم نہیں
ہمت تو میری بحر کی ہمت سے کم نہیں

نیکی کی راہ میں کبھی ہمت نہ ہاریے
مقدور ہو تو عمر اسی میں گزاریے

قربان اپنی جان کروں گی کسان پر
کیا لوں گی میں ٹھہر کے یہاں آسمان پر

نیکی کے کام سے کبھی رکنا نہ چاہیے
اس میں کسی کے ساتھ کی پروا نہ چاہیے

لو میں چلی" یہ کہہ کے روانہ ہوئی وہ بوند
بوندوں کی انجمن میں یگانہ ہوئی وہ بوند

ٹپ دے سے اس کی ناک پہ وہ بوند گر پڑی
سوکھی ہوئی، کسان کے دل کی کلی کھلی
دیکھا سہیلیوں نے تو حیران ہوگئیں
ہمّت کے اس کمال پہ کی سب نے آفریں
بولیں کہ چاہیے نہ سہیلی کو چھوڑنا
اچھا نہیں ہے مُنھ کو رفاقت سے موڑنا
ساتھی کے ساتھ سب کو برسنا ضرور ہے
گر ہم نہ ساتھ دیں تو مروّت سے دور ہے
یہ کہہ کے ایک ساتھ وہ بوندیں رواں ہوئیں
چھینٹا سا بن کے کھیت کے اوپر برس گئیں
قسمت کھلی کسان کی، بگڑی ہوئی بنی
سوکھی ہوئی غریب کی کھیتی ہری ہوئی
پھر سامنے نظر کے بندھا آس کا سماں
تھی آس، آس پاس گیا یاس کا سماں
اجڑا ہوا جو کھیت تھا، آخر ہرا ہوا
سارا یہ ایک بوند کی ہمّت کا کام تھا
دیکھی گئی نہ اس سے مصیبت کسان کی
بے تاب ہو کے کھیت پہ اس کے برس گئی

ننھی سی بوند اور یہ ہمّت، خدا کی شان!
یہ فیض، یہ کرم، یہ مروّت خدا کی شان!

حاشیہ: یہ نظم روزگار ص ۲۷۳ تا ۲۷۶ سے لی گئی ہے۔ ظاہرا وہیں سے لے کر باقیات میں ص ۵۳۷ تا ۵۴۱ پر دی گئی۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں۔

چاند اور شاعر

(بچّوں کے لیے)

(منسوخ)

شاعر

اک رات میرے دل میں جو کچھ آگیا خیال
یوں چودھویں کے چاند سے میں نے کیا سوال
اے چاند! تجھ سے رات کی عزّت ہے لاج ہے
سورج کا راج دن کو، ترا شب کو راج ہے
تو نے یہ آسمان کی محفل سجائی ہے
تو نے زمیں کو نور کی چادر اڑھائی ہے
تو وہ دیا ہے جس سے زمانے میں نور ہے
ہے تو فلک پہ، نور ترا دور دور ہے
پھیکی پڑی ہوئی ہے ستاروں کی روشنی
گویا کہ اس چمن پہ خزاں کی ہوا چلی

تیری چمک کے سامنے شرما گئے ہیں یہ — تیری ہوا بندھی ہے تو مرجھا گئے ہیں یہ
اس وقت تیرے سامنے سورج بھی مات ہے — دولھا ہے تو، نجوم کی محفل برات ہے
پائی ہے چاندنی یہ کہاں سے، بتا مجھے — یہ نور، یہ کمال، کہاں سے ملا تجھے
مجھ کو بھی آرزو ہے کہ ایسا کمال ہو — تیری طرح کمال مرا بے مثال ہو
روشن ہو میرے دم سے زمانہ اسی طرح — دنیا میں اپنا نام نکالوں تری طرح
حاصل کروں کمال، بنوں چودھویں کا چاند — تو ہے فلک کا چاند، بنوں میں زمیں کا چاند
ہر ایک کی نظر میں سماؤں اسی طرح — شہرت کے آسمان پہ چمکوں اسی طرح

چاند

میرا سوال سن کے کہا چاند نے مجھے — لے بھید اپنے نور کا کہتا ہوں میں تجھے
سورج اگر نہ ہو تو گزارا نہیں مرا — مانگا ہوا ہے نور، یہ اپنا نہیں مرا
سورج کے دم سے مجھ کو یہ حاصل کمال ہے — کامل اسی کے نور سے میرا ہلال ہے
پھرتا ہوں روشنی کی تمنا میں رات دن — رہتا ہوں میں کمال کے سودا میں رات دن
مجھ کو اڑائے پھرتی ہے خواہش کمال کی — کر پیروی جہان میں میری مثال کی
بے فائدہ نہ اپنے دنوں کو خراب کر — میری طرح تلاش کوئی آفتاب کر
کہتے ہیں جس کو علم وہ اک آفتاب ہے — یکتا ہے، بے مثال ہے اور لاجواب ہے
ایسے کمال کی ہے تمنا اگر تجھے — تو نور، جا کے، مانگ اسی آفتاب سے
ہے چاند کے کمال کو خطرہ زوال کا — رہتا ہے ہر گھڑی اسے دھڑکا زوال کا
محفوظ اس خطر سے ہنر کا کمال ہے — گھٹنے کا اس کو ڈر ہے نہ خوفِ زوال ہے
دنیا میں زندگی کا نہیں اعتبار کچھ — رہتی ہے اس چمن میں ہمیشہ بہار کچھ!

انساں کو فکر چاہیے ہر دم کمال کی
"کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی"

حاشیہ۔ یہ نظم روزگار ص ۳۷۶ تا ۳۸۰ پر اور باقیات ص ۲۶۴ تا ۲۶۸ پر ہے اس کا زمانہ معلوم نہیں۔

۱؎ سودا میں امالہ ہوکر 'سودے' ہونا چاہیے ۔

محنت

(بچوں کے لیے)

(منسوخ)

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ — جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ
اسی میں ہے عزت خبردار' رہنا — بڑا دکھ ہے دنیا میں بیکار رہنا
اسی سے ہے آبادنگری جہاں کی — یہ دنیا میں بنیاد ہے ہر مکاں کی
بڑائی بشر کو اسی سے ملی ہے — نکمی جو گزرے وہ کیا زندگی ہے
زمانے میں عزت، حکومت یہی ہے — بڑی سب سے دنیا میں دولت یہی ہے
حقیقت جو محنت کی پہچانتے ہیں — اسے کیمیا سے سوا جانتے ہیں
کوئی بڑھ کے محنت سے سونا نہیں ہے — کہ اس زر کو چوری کا کھٹکا نہیں ہے
ہری کھیتیاں جو نظر آ رہی ہیں — ہمیں شان محنت کی دکھلا رہی ہیں
نہیں کرتے دنیا میں نادان محنت — جو سمجھیں تو سونے کی، ہے کان محنت
اسی سے زمانے میں دولت بڑھے گی — جو دولت بڑھے گی تو عزت بڑھے گی
کوئی اس کو سمجھے تو اکسیر ہے یہ — بڑا بن کے رہنے کی تدبیر ہے یہ
یہ کل وہ ہے، چلتے ہیں سب کام جس سے — نکلتا ہے انسان کا نام جس سے
جو محنت نہ ہوتی تجارت نہ ہوتی — کسی قوم کی شان وشوکت نہ ہوتی
سہارا ہمارا تمھارا یہی ہے — اندھیرے گھروں کا اجالا یہی ہے
بڑے کام کی چیز ہے کام کرنا — جہاں کو، اسی کام سے رام کرنا
گڈریوں کو شاہنشہی اس نے دی ہے — کولمبس کو دنیا نئی، اس نے دی ہے
کھڑا ہے یہ سنسار محنت کی کل پر — یہ سب کارخانہ ہے اسی کل کے بل پر
بناتی ہے یہ شہر نگری، بنوں کو — بساتی ہے، اجڑی ہوئی بستیوں کو

جو ہاتھوں سے اپنے کمایا وہ اچھا　　جو ہو اپنی محنت کا پیسہ وہ اچھا
مری جان ! غافل نہ محنت سے رہنا
اگر چاہتے ہو فراغت سے رہنا

حاشیہ : یہ نظم روزگار ص ۳۸۱ تا ۳۸۴ اور باقیات ص ۲۶۱-۲۶۰ پر ہے۔
اس کا زمانہ معلوم نہیں ۔ بچوں کی دوسری نظموں کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے۔

بچوں کے لیے چند نصیحتیں

(منسوخ)

کاٹ لینا ہر کٹھن منزل کا کچھ مشکل نہیں　　اک ذرا انسان میں چلنے کی ہمت چاہیے
مل نہیں سکتی زمانے میں نکموں کو مراد　　کامیابی کی جو ہو خواہش، تو محنت چاہیے
خاک محنت ہو سکے گی ہو نہ جب ہاتھوں میں زور　　تندرستی کے لیے ورزش کی عادت چاہیے
خوش مزاجی سا زمانے میں کوئی جادو نہیں　　ہر کوئی تحسیں کہے، ایسی طبیعت چاہیے
ہنس کے ملنا، رام کر لیتا ہے ہر انسان کو　　سب سے میٹھا بولنے کی تم کو عادت چاہیے
ایک ہی اللہ کے بندے ہیں سب چھوٹے بڑے　　اپنے ہم جنسوں سے دنیا میں محبت چاہیے
ہے برائی سی برائی کام کل پر چھوڑنا　　آج سب کچھ کر کے اٹھو، گر فراغت چاہیے
جو بروں کے پاس بیٹھے گا برا ہو جائے گا　　نیک ہونے کے لیے نیکوں کی صحبت چاہیے
ساتھ والے دیکھنا، تم سے نہ بڑھ جائیں کہیں　　جوش ایسا چاہیے، ایسی حمیت چاہیے
حکمراں ہو، کوئی ہو، اپنا ہو یا بیگانہ ہو　　دی خدا نے جس کو عزت، اس کی عزت چاہیے
دیکھ کر چلنا، کچل جائے نہ چیونٹی راہ میں　　آدمی کو بے زبانوں سے بھی الفت چاہیے
ہے اسی میں بھید عزت کا اگر سمجھے کوئی　　چھوٹے بچوں کو بزرگوں کی اطاعت چاہیے
علم کہتے ہیں جسے، سب سے بڑی دولت ہے یہ　　ڈھونڈ لو اس کو، اگر دنیا میں عزت چاہیے
سب برا کہتے ہیں لڑنے کو بری عادت ہے یہ　　ساتھ کے لڑکے جو ہوں، ان سے رفاقت چاہیے
ہوں جماعت میں شرارت کرنے والے بھی اگر　　دور کی ان سے فقط صاحب سلامت چاہیے

دیکھنا، آپس میں پھر نفرت نہ ہو جائے کہیں
اس قدر حد سے زیادہ بھی نہ ملّت[۲] چاہیے

باپ دادوں کی بڑائی پر نہ اترانا کبھی
سب بڑائی اپنی محنت کی بدولت چاہیے

چاہتے ہو گر کہ سب چھوٹے بڑے عزت کریں
شرم آنکھوں میں، نگاہوں میں مروت چاہیے

بات[۱] اونچی ذات میں بھی کوئی اترانے کی ہے؟
آدمی کو اپنے کاموں کی شرافت چاہیے

گر کتابیں ہو گئیں میلی تو کیا پڑھنے کا لطف
کام کی چیزیں ہیں جو اُن کی حفاظت چاہیے

حاشیہ: یہ نظم سب سے پہلے روزگار ص ۳۸۴ تا ۳۸۸ پر ملتی ہے۔ وہیں سے لے کر باقیات ص ۵۴۲-۴۴ پر درج کی گئی گو ماخذ کا اعتراف نہیں کیا گیا لیکن روزگار میں شعر نمبر ۱۶ کے دوسرے مصرع کے لفظ 'ملّت' کے فٹ نوٹ میں معنی دیے ہیں 'میل ملاپ۔ دوستی'۔ یہی باقیات ص ۵۴۴ کے فٹ نوٹ میں منقول ہیں۔ نظم کی نصائح دل کو لگنے والی ہیں۔

ح۱ اس شعر میں کہا گیا ہے کوئی بھی حکمراں خواہ اپنا (یعنی ہندوستانی) خواہ بیگانہ (دوسرے ملک کا)، چونکہ خدا نے اسے عزت دی ہے اس لیے اس کی عزت کرنی چاہیے۔ اس طرح اس شعر میں انگریز حاکموں کی عزت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ حالی و سرسید کی تقلید ہے۔

ح۲ اس شعر کا ماخذ حالی کی غزل کا ذیل کا مطلع ہے۔

بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

شمع و پروانہ

پروانہ تجھ سے[۱] کرتا ہے اے شمع پیار کیوں؟
یہ جانِ بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟

وہ بات تجھ میں کیا ہے کہ یہ بے قرار ہے،
م جادر ہوائے لذّتِ خوابِ مزار ہے

سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا اسے — آدابِ عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے؟
کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا — پھونکا ہوا ہے کیا تری برقِ نگاہ کا؟
آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا؟ — شعلے میں تیرے زندگیِ جاوداں ہے کیا؟
غم خانۂ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو — اس تفتہ دل کا نخلِ تمنّا ہرا نہ ہو
بے اختیار سوز سے تیری بھڑک اٹھا م قسمت کا اپنی بن کے ستارہ چمک اٹھا
گویا ترے حضور میں اس کی نماز ہے — ننھے سے دل میں لذّتِ سوز و گداز ہے
کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسنِ قدیم ہے — چھوٹا سا طور تو، یہ ذرا سا کلیم ہے
تھوڑی سی روشنی پہ فدا ہو رہا ہے یہ م اک نور ہے کہ جس میں فنا ہو رہا ہے یہ
پروانہ کیا ہے، اک دلِ ایذا طلب ہے یہ م عینِ وصال و سوزِ جدائی، غضب ہے یہ

پروانہ اور ذوقِ تماشائے روشنی
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

حاشیہ۔ یہ نظم خدنگِ نظر جنوری ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے یہ ادارتی نوٹ تھا: "اس نمبر میں ہم شمع و پروانہ کے عنوان سے مسٹر محمد اقبال ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج کی ایک نوتصنیف نظم شائع کرتے ہیں جو پروفیسر صاحب نے ہمارے اصرار پر نہایت ہی عجلت میں تصنیف فرمائی ہے تاہم ان اشعار سے ان کی فن و زباں دانی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔"[1]

بعد میں نظم مخزن اپریل ۱۹۰۲ میں شائع ہوئی۔

خفتگانِ خاک سے استفسار

۱ مہرِ روشن چھپ گیا اٹھّی نقابِ روئے شام — شانۂ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام
۲ یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے — محفلِ قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے

---

[1] عتیق صدیقی: جادوگرِ ہندی نژاد ص ۳۱

۳ کر رہا ہے آسماں جادو، لبِ گفتار پر   ساحرِ شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر

۴ کھیت سے آتا ہے دہقاں، منہ میں کچھ گاتا ہوا   م   پائے گرد آلود دیتے ہیں مسافت کا پتا

۵ کام دھندا ہو چکا، اب نیند ہے، آرام ہے   م   ہائے وہ آغازِ محنت جس کا یہ انجام ہے

۶ رات کی آمد ہے، مرغانِ ہوا خاموش ہیں   م   ابتدا و انتہا آپس میں ہم آغوش ہیں

۷ شورشِ گفتارِ انساں کی صدا آتی نہیں   م   وہ صدائے نغمۂ گوش آشنا آتی نہیں

۸ غوطہ زن دریائے خاموشی میں ہے موجِ ہوا   ہاں، مگر اک دور سے آتی ہے آوازِ درا

۹ دل، کہ ہے بے تابیِ الفت میں دنیا سے نفور   کھینچے لاتا ہے مجھے ہنگامۂ عالم سے دور

۱۰ منظرِ حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشینِ خفتگانِ کنجِ تنہائی ہوں میں

۱۱ تھم ذرا بے تابیِ دل! بیٹھ جانے دے مجھے   اور اس بستی پہ چار آنسو گرانے دے مجھے

۱۲ اے عدم کے رہنے والو! تم جو یوں خاموش ہو   م   مے وہ کیسی ہے، نشے میں جس کے تم مدہوش ہو

۱۳ اے مئے غفلت کے سرمستو! کہاں رہتے ہو تم   کچھ کہو اس دیس کی آخر، جہاں رہتے ہو تم

۱۴ وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی؟   اور پیکارِ عناصر کا تماشا ہے کوئی؟

۱۵ وہ ولایت بھی ہمارے دیس کی صورت ہے کیا؟   م   شب وہاں کی کیا ہے؟ صبح و شام کی رنگت ہے کیا؟

۱۶ آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا؟   اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟

۱۷ دل میں ہوتے ہیں اسی صورت سے پیدا ولولے؟   م   اس ولایت میں بھی کیا مجبور کہتے ہیں اسے؟

۱۸ واں بھی جل مرتا ہے سوزِ شمع پر پروانہ کیا؟   اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا؟

۱۹ یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل   شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل؟

۲۰ رشتہ و پیوند یاں کے جان کا آزار ہیں   اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں؟

۲۱ واں بھی آزارِ غریبی سے کبھی روتے ہیں کیا؟   م   اس ولایت میں بھی دل ٹوٹے ہوتے ہیں کیا؟

۲۲ یہ خوشامد اس ولایت کا بھی کیا دستور ہے؟   م   واں بھی کیا سنگِ ریا سے شیشۂ دل چور ہے؟

۲۳ واں کی عزت بھی، حکومت بھی حباب آسا ہے کیا؟   م   واں بھی یہ دولت ہی پیمانہ شرافت کا ہے کیا؟

۲۴ آہ، اس کشور میں تو جوہر کی عزت کچھ نہیں   م   واں کی نگری میں بھی اس موتی کی قیمت کچھ نہیں؟

٢٥ اس جہاں میں اک معیشت اور تشویش[١٠] افتادہ ہے — روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟

١٢٦ خرمنِ[١١] دہقاں کو ہے بجلی کا ڈر ایسا ہی کیا؟ م — اس جہاں میں ہے تبسم پُر خطر ایسا ہی کیا؟

٢٦ب کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے، خرمن بھی ہے؟ — قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے؟

٢٧ تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟ — خشت و گل[١٢] کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے؟

٢٨ واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا؟ — امتیازِ ملّت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟

٢٩ واں بھی کیا فریادِ بلبل پر چمن روتا نہیں ؟
اس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں ؟

٣٠ باغ ہے فردوس[١٣] یا اک منزلِ آرام ہے؟ — یا رخِ بے پردۂ حسنِ ازل کا نام ہے؟

٣١ کیا جہنّم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے؟ — آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصدِ تادیب ہے؟

٣٢ کیا عوض رفتار[١٤] کے اس دیس میں پرواز ہے؟ — موت کہتے ہیں جسے[١٥] اہلِ زمیں، کیا راز ہے؟

٣٣ اس جدائی میں نہفتہ وصل کا ساماں ہے کیا؟ م — چشمِ بستہ، سرمۂ گوہر پئے انساں ہے کیا؟

٣٤ اس نگر کی طرح کیا واں بھی ہے رونا موت کا؟ م — کیا وہاں کی زندگی کو بھی ہے کھٹکا موت کا؟

٣٥ اضطرابِ دل کا ساماں، یاں کی ہست و بود ہے — علمِ انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے؟

٣٦ یاں تو چلمن کی جھلک سے اور بڑھ جاتا ہے شوق م — کیا وہاں پر جلوۂ بے پردہ دکھلاتا ہے شوق؟

٣٧ حسن و خوبی ہو کے بے پردہ نظر آتے ہیں کیا؟ م — اس جہاں میں عشق کے ارماں نکل جاتے ہیں کیا؟

٣٨ دید سے تسکین پاتا ہے دلِ مہجور بھی؟ — لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی؟

١٣٩ کیا دلِ[١٦] انساں کو واں بھی ذوقِ استفہام ہے؟ م — کیا وہاں بھی جستجو میں روح کو آرام ہے؟

٣٩ب جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟ — واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا؟

٤٠ بے[١٧] نشاں ہے جس کی ہستی، وہ اسی ہستی[١٨] میں ہے م — جس کو کہتے ہیں بلندی وہ اسی پستی میں ہے

٤١ ہم جسے کہتے ہیں ہستی، وہ ہے کیا تصویرِ[١٩] حسن ؟ م — ہے صداقت بھی، سعادت[٢٠] بھی وہاں تفسیرِ حسن[٢١]

٤٢ آہ وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟ — یا محبت کی تجلّی سے سراپا نور ہے؟

٤٣ تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

فروری ١٩٠٢ء

حواشی: یہ نظم مخزن فروری ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ بانگ میں شامل کرتے وقت بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔

ع۱ ۱۹۰۲ء میں کسی نے تنقید ہمدرد کے نام سے اقبال کی شاعری پر کچھ اعتراضات کیے تھے جن کا جواب اقبال نے مخزن لاہور بابت اکتوبر ۱۹۰۲ء میں دیا تھا۔ ان کی تفصیل محمد عبداللہ قریشی نے اپنے ایک مضمون[۱] میں دی ہے۔ اس شعر پر بھی اعتراض تھا کہ 'سو افتاد' کی جگہ جمع کا صیغہ 'سو افتادیں' ہونا چاہیے تھا۔ اقبال نے اپنی صفائی اور تائید میں اساتذہ کی کئی سندیں پیش کیں۔ مخزن میں اشاعت کے بعد انھوں نے اس نظم کے چند اشعار حذف کر کے کسی رسالے میں چھپوائے ہوں گے جہاں سے رزّاق کی کلیاتِ اقبال میں منقول ہوئے۔ ان میں سے اس شعر کو بھی حذف کر دیا لیکن بعد میں بانگ میں شامل کر لیا۔

ع۲ معنی کے لحاظ سے یہ شعر حشو اور بدرنگ معلوم ہوتا ہے۔ پہلے مصرع میں دوسرے 'ہستی' کے بجائے 'بستی' رہا ہوگا۔ دوسرے مصرع میں 'پستی' کا لفظ 'قبرستان' کے لیے رہا ہوگا۔ دوسری دنیا کے لیے 'پستی' کا لفظ نہیں آسکتا۔ اس شعر سے پہلے اور بعد میں دوسری دنیا کا ذکر سوالیہ لہجے میں ہے۔ بیچ میں قبرستان کے بارے میں یہ بیانیہ شعر کہاں سے آدھمکا۔ کہیں یہ شعر اس طرح تو نہیں:

بے نشاں ہے جس کی ہستی، وہ اسی بستی میں ہے؟
جس کو کہتے ہیں بلندی، وہ اسی بستی میں ہے؟

اس طرح شعر کا اطلاق بھی عالم بالا کے ساتھ ہو جائے گا۔

---

۱ محمد عبداللہ قریشی: اقبال کے ادبی معرکے۔ رسالہ نقوش ادبی معرکے نمبر (۲) ص ۲۲۳۔ شمارہ ۱۲۷ ستمبر ۱۹۸۱ء۔ اصل تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اقبال کا مضمون 'اردو زبان پنجاب میں' مشمولہ 'اقبال کے نثری افکار' مرتبہ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل۔ مارچ ۱۹۷۷ء دلی ص ۳۳ تا ۴۹

خیر مقدم

(منسوخ)

لاٹ صاحب اور ڈائرکٹر تعلیم کے خیر مقدم کا قصیدہ

زہے نشاطِ فراواں کہ اخترِ تقدیر چمک رہا ہے ابھر کر مثالِ مہرِ منیر
کیا ہے آنکھ نے ممدوح منتخب ایسا صفت سے جس کی، زبانِ قلم میں ہے تاثیر
خوشا نصیب وہ گوہر ہے آج زینتِ بزم کہ جس کی شان سے ہے آبروئے تاج و سریر
وہ کون؟ زیب دہ تختِ صوبۂ پنجاب کہ جس کے ہاتھ نے کی قصرِ عدل کی تعمیر
عجب معاملہ ہے کچھ، ولایتِ دل کا کہ اک نگاہ سے ہوتا ہے یہ نگر تسخیر
حضور زینتِ محفل ہیں، ناز ہے ہم کو جھلک رہی ہے نصیبوں میں سبزیِ کشمیر
مزے سے سوتا ہے بے خوف، دیدۂ عالم کہ تیرے عہد کا ہے خواب بھی نکو تعبیر
بدل کے امن کے باعث ہے اصطلاحِ زباں بجائے نالۂ زنجیر، نغمۂ زنجیر
کوئی جو غور سے دیکھے تو امن کی ہے بہار یہ درس گاہ، یہ محفل، یہ شان، یہ تعمیر
جو بزم اپنی ہے، طاعت کے رنگ میں رنگیں تو درس گاہ، رموزِ وفا کی ہے تفسیر
اسی اصول کو ہم کیمیا سمجھتے ہیں نہیں ہے غیرِ اطاعت، جہان میں اکسیر
مدد، جہان میں کرتے ہیں آپ ہم اپنی غریب دل کے ہیں لیکن مزاج کے ہیں امیر
مگر حضور نے ہم پہ کیا ہے وہ احساں کہ جس کے ذوق سے شیریں ہوا لبِ تقریر
وہ لوگ ہم ہیں کہ نیکی کو یاد رکھتے ہیں اسی سبب سے زمانے میں اپنی ہے توقیر
دعا نکلتی ہے دل سے، حضور شاد رہیں رہیں جہان میں عظمت طرازِ تاج و سریر
عجب طرح کا نظارہ ہے اپنی محفل میں کہ جس کے حسن پہ نازاں ہے خامۂ تحریر
ہوئے ہیں رونقِ محفل جناب ولیم بل ضیائے مہر کی صورت ہے جن کی ہر تدبیر
یہ علم و فضل کی آنکھوں کا نور ہیں واللہ انھیں کی ذات سے حاصل ہے مہر کو تنویر
خدا انھیں بھی زمانے میں شاد کام رکھے یہ وہ ہیں، دہر میں جن کا نہیں عدیل و نظیر

قمر کے گرد ستارے ہیں، ہم عناں کیا ہیں — ہے جس طرح کا شہنشہ، اسی طرح کے وزیر
خوشا نصیب کہ یہ ہم رہِ حضور آئے — ہماری بزم کی یک بار بڑھ گئی توقیر
بڑھے جہاں میں اقبال ان مشیروں کا
کہ ان کی ذات سراپا ہے عدل کی تصویر

۲۲ فروری ۱۹۰۲ء

حواشی: انجمن حمایتِ اسلام لاہور کا سترھواں اجلاس ۲۱ تا ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء اسلامیہ کالج لاہور میں ہوا۔ سنیچر ۲۲ فروری کو دن کے جلسے کی صدارت خان بہادر برکت علی خاں پنشنر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے کی۔ اس جلسے میں لفٹننٹ گورنر پنجاب سر ولیم میکورتھ ینگ اور ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ولیم بل بھی آئے تھے۔ یہ قصیدہ بنیادی حیثیت سے گورنر کی مدح میں ہے جس کے آخر میں ڈائرکٹر تعلیم کی شان میں بھی تین شعر چپکا دیے ہیں۔
یہ قصیدہ ذوق کے مشہور قصیدے ع زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر۔ کی زمین میں ہے۔
[1] درس گاہ سے مراد اسلامیہ کالج لاہور ہے جہاں انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا تھا۔

دین و دنیا

(منسوخ)

دہلی دروازے[1] کی جانب ایک دن جاتا تھا میں — شام کو گھر بیٹھے رہنا قابلِ الزام ہے
خضر صورت مولوی صاحب کھڑے تھے اک وہاں[2] — ہم مسلمانوں میں ایسی مولویت عام ہے
وعظ کہتے تھے "کوئی مسلم نہ انگریزی پڑھے — کفر ہے آغاز اس بولی کا، کفر انجام ہے"
میں نے یہ[3] سن کر کیا ان کو مخاطب اس طرح — آپ کا ہونا بھی، اپنی[4] گردشِ ایام ہے
کیوں مسلمانوں کی کشتی کو الٹ دیتے نہیں؟ — آپ کے دل میں جو اتنی کاوشِ انجام ہے
کفر کی تعریف میں کہتے ہیں، انگریزی ہے شرط — آپ کی منطق بھی، حضرت! قابلِ انعام ہے
پھر اسی پر اکتفا کرتے نہیں، کہتے ہیں یہ — مذہب منصور ہے، مقبول خاص و عام ہے
واہ[5] کیا کہنا ہے! کیا تاثیر ہے! کیا وعظ ہے — آپ کی ہر بات گویا بمبئی کا آم ہے

ادّعائے حبِّ دیں ہے آپ کو اس وعظ پر
ایسی حُبّ کو لام کی تشدید سے سلّام ہے

مسلموں کو فکرِ دیں ہو، فکرِ دنیا کچھ نہ ہو
کچّے حنظل کی طرح یہ بھی خیالِ خام ہے

بندہ پرور! اب تو ہم چالوں میں آنے کے نہیں
آپ کی دیں داریوں کا راز طشت از بام ہے

خوب قرآں کو بنایا دامِ تزویر آپ نے
کامیابی کیوں نہ ہو، حضرت! یہ خاصا دام ہے

صدقے جاؤں فہم پر، دنیا نہیں دیں سے الگ
یہ تو اک پابندیِ احکامِ دیں کا نام ہے

بندہ پرور! بندگی اپنی یہیں سے ہو قبول
وعظ اب ایسا، صدائے مرغِ بے ہنگام ہے

ان سے پوچھو، ہند ہی کیا رہ گیا ہے آپ کو
اور بھی تو دیس ہیں آخر، جہاں آرام ہے

باندھیے بستر کہ ان وعظوں کی خاطر سامنے
انڈمین ہے، چین ہے، جاپان ہے آسام ہے

جب کہا حضرت! اکہ ہیں اب ڈھنگ ہمدردی کے اور
دین کی تائید انگریزی پڑھوں کا کام ہے

جوش میں کیا آئے، اک سوڈے کی بوتل کھل گئی
گالیوں کے بس سے منھ ان کا چھلکتا جام ہے

ایسے دینداروں سے تنگ آئے ہیں، آخر کیا کریں
آج سنتے ہیں کہ حسیٹ جی کے ہاں لیلام ہے

آپ کی تعریف لکھنی ہے قلم کو اس طرح
جس طرح گھوڑے کے حق میں سنکھیا بادام ہے

موچی دروازے میں ہیں فخرِ اطبائے زماں
ان سے امیدِ شفا، لیکن خیالِ خام ہے

بیچتے ہیں برف کی قلفی دسمبر میں، چہ خوش!
ایسے دیں داروں کا سر بے عین و قاف و لام ہے

نظم چھپواتے جو صدیقی پریس میں میں گیا
مطبعِ مطبوع ہے، مشہورِ خاص و عام ہے

ہیں یہاں اک دوست کالج کے زمانے سے مرے
آپ کے دم سے پریس کی عزت و اکرام ہے

نام محی الدین ہے، کرتے ہیں وہ احیائے دیں
آپ کا، دینی کتابوں کی اشاعت کام ہے

میں نے یہ پوچھا کہ حضرت! آپ کو فرصت تو ہے
نظم چھپوانی ہے مجھ کو، اک ذرا سا کام ہے

دُکھ نہ جائے، دیکھنا، شاعر کا دل انکار سے
یہ وہ تلخی ہے کہ مثلِ تلخیِ دشنام ہے

آج کل لوگوں کو ہے انکار کی عادت بہت
نام بے چارے حسینوں کا یونہی بدنام ہے

ہنس کے فرمانے لگے، یہ انجمن کا کام ہے
انجمن کا کام کیا ہے، خدمتِ اسلام ہے

ہم کریں اس کام کو، سو کام اپنے چھوڑ کر
آپ کیا سمجھے ہیں حضرت! یہ بھی کوئی کام ہے

چھاپ دینا نظم کا، مجھ پر گراں کوئی نہیں
ہو اگر فرصت نہ مجھ کو، اور سے چھپوا لے دل
نظم ہے آخر کوئی طاعون کا ٹیکہ نہیں
بات یہ چھوٹی سی ہے لیکن مروّت کو تو دیکھ
یہ مروّت ہو عزیزوں کی نگاہوں میں اگر
اس کہانی کے بیاں سے تھی غرض اک اور ہی
اس طرح دنیا کا بندہ بھی نہ ہونا چاہیے
چاہیے، ہر کام میں ہو دیں کی خدمت کا پاس
روح ہے جب تک بدن میں، عشق ہم جنسوں سے ہو
ہے دماغوں کی لطافت، کچھ اسی کا سوز و ساز
سر جھکائے ایک دن جاتا تھا ٹکسالی[25] کو میں
آ رہا تھا میرے پیچھے کوئی یہ کہتا ہوا
بابو جی! درویش ہوں میں، ہو چکا آٹا مرا
علمِ[27] دیں کا شوق ہے، دنیا سے کچھ مطلب نہیں
گاؤں سے یاں کھینچ لایا ہے مجھے پڑھنے کا شوق
یہ کہا اور جھٹ دکھا دی اک پرانی سی کتاب
میں نے یہ سن کر کہا رکھتے ہوئے دل سے اسے
خوار ہے تو جیسے اسٹیشن پہ ہو بلٹی کا مال
نیچری مجھ کو سمجھ کر ہو گئے کافور آپ
الغرض دیں ہو تو اس کے ساتھ کچھ دنیا بھی ہو
دیں[28]، دنیا کا محافظ ہے اگر سمجھے کوئی
یوں تو اس دنیائے دوں میں سیکڑوں امراض ہیں
چندہ جب لینے گئے، کہلا دیا " بیمار ہیں

خدمتِ دیں، اپنے دل کو جامۂ احرام ہے
ہو نا اتنا بھی تو جھوٹا دعویِ اسلام ہے
چھاپنا چاہے جو کوئی، دس منٹ کا کام ہے
حق تو یہ ہے جوشِ[26] ہمدردی اسی کا نام ہے
پھر وہی ہم ہیں، وہی شوکت، وہی اسلام ہے
میرے ہر مصرع میں مخفی صنعتِ ایہام ہے
ایسی دنیا ہو تو نورالدین گنگا رام ہے
حضرتِ مدفونِ یثرب کا یہی پیغام ہے
عشق بھی اک مذہب اسلام ہی کا نام ہے
عشق اس دنیا کی انگیٹھی[12] میں عودِ خام ہے
دائیں بائیں گھورنے سے آنکھ کو کیا کام ہے
آہ! یہ دنیا سراپا مایۂ آلام ہے
فکر ہے فردا کی اور دل ہے کہ بے آرام ہے
دالِ دل کو اٹنے، دالِ دیں سے ادغام ہے
علمِ دیں کے ساتھ اپنے دل کو نسبت تام ہے
میں نے یہ سمجھا، کوئی ڈگری ہے یا اسٹام[29] ہے
واہ کیا نیت ہے، کیا اوقات، کیا اسلام ہے
تیری دیں داری کا، یہ ذلت ہی کیا انجام ہے

آج کل سچی نصیحت کا یہی انعام[30] ہے
ورنہ روزِ روشنِ اسلام کی پھر شام ہے
جیسے بچے کے گلے میں ناخنِ[31] نشتر غام ہے
پر بخیلوں کے لیے چندہ بھی اک سرسام ہے
ٹل گئے جس دم، کہا، پہلے سے کچھ آرام ہے

ذکر جب اقبالؔ کا آیا تو یوں اُٹھا کوئی
رہتا ہے بھاٹی میں، اک دیوانۂ اصنام ہے

۲۲ فروری ۱۹۰۲ء

حواشی ۔ یہ نظم بھی انجمن حمایت اسلام لاہور کے سترھویں جلسے میں ۲۲ فروری کو پڑھی گئی ۔ دن میں انھوں نے گورنر اور ڈائرکٹر تعلیمات کی شان میں قصیدہ پڑھا تھا ۔ اسی رات[1] خان بہادر حاجی شیخ خدا بخش ڈسٹرکٹ جج گورداسپور کی صدارت میں پانچواں اجلاس منعقد ہوا ۔ دو نشستیں ۲۱ فروری کو ہوئی ہوں گی اور تین ۲۲ فروری کو اس طرح ۲۲ فروری کی رات کو پانچواں اجلاس ہوا ۔ اس میں اقبال نے اپنے مخصوص ترنم میں یہ نظم پڑھی۔ نوادرِ اقبال میں انجمن کی ۲۲ فروری کی روداد سے نقل کیا ہے ۔

" اس نظم سے بعض صاحبوں کو محض ان کی اپنی خوش فہمی کی وجہ سے کچھ بدگمانی اور ناراضی سی پیدا ہوئی حالاں کہ اس نظم میں چند واقعات کا ذکر ہے جو شیخ صاحب کو پیش آئے ۔ تاہم شیخ صاحب نے نہایت دوراندیشی اور دانائی سے اس بدگمانی کو دوسرے دن رفع کر دیا جس سے سب صاحب خوش ہو گئے "[2]

سچ تو یہ ہے کہ یہ نظم اقبال کے مرتبے سے گری ہوئی ہے ۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں وہ 'نالۂ یتیم' اور 'ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے' جیسی نظمیں پڑھ چکے تھے ۔ ۱۹۰۲ء میں دن کے جلسے میں گورنر کی قصیدہ خوانی اور رات کو ایسی تمسخرانہ نظم ۔ اس میں بھرتی کے الفاظ اور تصنع آمیز قافیے تک لانے پڑے ۔

ع۱ لاہور شہر میں کئی دروازے ہیں جن کی تفصیل نقوش لاہور نمبر[3] میں دی ہے ۔ دہلی دروازہ لاہور کے مشرق میں دہلی کی طرف ہے ۔ یہ ریلوے اسٹیشن کے پاس ہے ۔

ع۲ انڈمان کو انڈمن لکھ کر بروزنِ 'انڈمن' باندھا ہے ۔

---

[1] عبداللطیف اعظمی : اقبال' دانائے راز ص ۲۱۸

[2] روئیداد انجمن ص ۲۷ ۔ ۲۸ بحوالہ سرود و نوادر ص ۱۶۳

[3] حافظ عباداللہ فاروقی : دروازے ۔ نقوش لاہور نمبر۔ شمارہ ۹۲۔ فروری ۱۹۶۲ء ۔ ص ۶۵۵ تا ۶۵۹

ع۳ باقیات کے مختلف مجموعوں میں نوٹ کے مطابق جمسیٹ جی ایک پارسی تھا جس کا نیلام گھر اس زمانے میں بہت مشہور تھا۔ انگریزی میں بعض ناموں کے آخری د کو کبھی کبھی ٹ سے لکھا جاتا ہے مثلاً چیمبرس ڈکشنری کے مطابق 'محمدؐ' کے قدیم ہجے MAHOMET تھے۔ انگریزی کی ایک کہاوت MOUNTAIN COMING TO MAHOMET میں یہ ہجے موجود ہیں۔ تاشقند کو انگریزی میں TASHKENT لکھا جاتا ہے۔ ہندوستانی بحری افواج کے سابق سربراہ خورشید جی کے نام کو انگریزی میں د کے بجائے ٹ پر ختم کیا جاتا تھا۔ اسی طرح جمسیٹ تخریب ہے جمشید کی۔ اقبال نے اس لفظ میں 'ے' کو حذف کر کے جم + سٹ باندھا ہے۔ 'لیلام' 'نیلام' کا دیہاتی تلفظ ہے۔

ع۴ مجھے اس میں شبہ ہے کہ بادام گھوڑے کے لیے زہر کا اثر رکھتا ہے۔ مشہور ہے کہ گھوڑے کو ٹھنڈ لگ گئی ہو تو صرف ڈیڑھ بادام کھلانے سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ڈیڑھ کی مقدار ایک ٹوٹکا ہو سکتی ہے۔

ع۵ موچی دروازہ۔ نقوش لاہور کے مطابق اس کا اصلی نام 'موتی دروازہ' تھا جو اکبری عہد کے ایک جمعدار کے نام پر تھا۔ سکھوں کے عہد میں موچی دروازہ کہلایا۔ انگریزی عہد میں اسے ڈھا دیا گیا۔

ع۶ موچی دروازے میں اقبال کے دوست زبدۃ الحکما حکیم غلام نبی مشہور طبیب تھے۔ تبرکات کے مطابق یہ انھیں پر چوٹ تھی۔ اقبال نے اسے غلط قرار دیا۔ نقوش لاہور نمبر میں ان کے حالات ص ۸۱۹ پر دیئے ہیں۔ ان کی چالیس کے قریب تالیفات ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں انتقال ہوا۔ ع۷ ع و قاف دلام = عقل

ع۸ پریس کی 'ے' گرا کر اسے 'پرس' باندھا گیا ہے جو اچھا نہیں لگتا۔

ع۹ نام اور محی الدین کے بیچ ایک 'م' زائد ہے۔ مصرع جب موزوں ہو سکتا ہے کہ 'محی' کی ح کو ساکن کر کے پڑھا جائے۔

ع۱۰ تبرکاتِ اقبال میں ذکرِ اقبال سے نقل کیا ہے۔
"چوں کہ اس قطعہ میں بعض غلط قسم کے مولویوں کو کھری کھری سنائی تھیں اس لیے

مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار) نے اس قطعہ کو چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے
متعلق بھی ایک شعر میں اشارہ تھا۔

آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت
نام محبوبانِ عالم کا یوں ہی بدنام ہے

بعد میں 'محبوبان عالم' کی جگہ 'بے چارے حسینوں' کر دیا گیا۔ لیکن اگر ایسا ہوا ہے تو
اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سب اشعار ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء کو پڑھے جانے والے متن میں
نہیں ہوں گے بلکہ بعد کا اضافہ ہوں گے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صدیقی پریس میں طباعت
سے متعلق اشعار بھی جلسے کے بعد بڑھائے گئے ہوں گے یا مطبوعہ قطعے میں الگ سے
شامل کر کے سنائے گئے ہوں گے۔

ع۱۱؎ یہ قطعہ بغیر مطلع کا ہے لیکن درمیان میں مطلع آگیا ہے۔ میں نے اس سے قبل فصل کرنے
والی چھوٹی لکیر ڈال دی ہے۔

ع۱۲؎ اقبال نے 'انگیٹھی' کو 'ن' کے اعلان کے ساتھ بروزنِ مفعولن باندھا ہے۔ صحیح بروزن
فعولن ہے۔

ع۱۳؎ نقوش کے مضمون کے مطابق ٹکسالی دروازہ لاہور کے غربی جانب ہے۔ شاہی عہد
میں اس دروازے کے اندر ٹکسال کی عمارت تھی۔ اب طوائفوں کا چکلہ ہے جسے بٹی
ہیرا منڈی کہتے ہیں۔

ع۱۴؎ اقبال بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ یہ دروازہ لاہور کے مغرب کی طرف۔
ایک زمانے میں یہاں 'بھاٹ فرقہ' رہتا تھا جن کے نام پر اسے بھاٹی دروازہ کہا۔ !
میں انگریزوں نے پرانا دروازہ گرا کر اس کی جگہ انگریزی قطع کا دروازہ بنوایا۔

اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو

(منسوخ)

ہم سخن ہونے کو ہے معمار سے تعمیر آج — آئینے کو ہے سکندر سے سرِ تقریر آ

نقش نے نقاش کو اپنا مخاطب کر لیا ———— شوخیِ تحریر سے گویا ہوئی تصویر آج
سن کے کیا کہتی ہے، دیکھیں بادِ عنبر بارِ صبح ———— لب کشا ہونے کو ہے اک غنچۂ دلگیر آج
دیکھیے گل کس طرح کہتا ہے احوالِ خزاں ———— مانگ کر لایا ہے بلبل سے، لبِ تقریر آج
عشق ہر صورت سے ہے آمادۂ تزئینِ حسن ———— ہے پرِ پروانہ سے کارِ لبِ گل گیر آج
گرمیِ فریاد کی آتش گدازی دیکھنا ———— شمع کے اشکوں میں ہے لپٹی ہوئی تنویر آج
آہ میں یارب! وہ کیا اندازِ معشوقانہ تھا ———— جوشِ لذت میں فدا ہو ہو گئی تاثیر آج
عقد سے کھل جانے کو ہیں مثلِ دہانِ روزہ دار ———— ہے ہلالِ عید اپنا ناخنِ تدبیر آج
دیکھیے، اس سحر کا ہوتا ہے کس کس پر اثر! ———— ہے دُخانِ شمعِ محفل سرمۂ تسخیر آج
زینتِ محفل ہیں فرہادانِ شیریں عطا ———— اس محل میں ہے رواں بہنے کو جوئے شیر آج

صبر را از منزلِ دل پا بجولاں کردہ ام
گیسوئے مقصود را آخر پریشاں کردہ ام

آج ہم حالِ دلِ درد آشنا کہنے کو ہیں ———— اس بھری محفل میں اپنا ماجرا کہنے کو ہیں
ہر نفس پیچیدہ ہے مانندِ دودِ شمعِ طور ———— داستانِ دل کشِ مہر و وفا کہنے کو ہیں
دیکھیے محفل میں تڑپاتا ہے کس کس کو یہ شور ———— مرثیہ اپنے دلِ گم گشتہ کا کہنے کو ہیں
بوئے گل لپٹی ہوئی ہو غنچۂ منقار میں ———— ورنہ مرغانِ چمن، رنگیں نوا، کہنے کو ہیں
تجھ کو اے شوقِ جراحت! دیں تسلی کس طرح؟ ———— آہ یہ تیرِ نظر بھی 'بے خطا' کہنے کو ہیں
قصۂ مطلب طویل و دفترِ تقریر تنگ ———— خود بخود کوئی سمجھ جائے کہ کیا کہنے کو ہیں
محفلِ عشرت میں ہے، کیا جانیے، کس کا انتظار؟ ———— آج ہر آہٹ کو ہم آوازِ پا کہنے کو ہیں
ہے سوئے منزل رواں ہونے کو اپنا کارواں ———— ہم صریرِ خامہ کو بانگِ درا کہنے کو ہیں
ہے گہرباری پہ مائل، تو حوالے دستِ کرم! ———— ہم تجھے ابرِ سخا، بحرِ عطا کہنے کو ہیں
خود بخود منھ سے نکل جانا بھی اچھا ہے مگر ———— دم تو لے، آخر تجھے اے مدعا! کہنے کو ہیں

باز اعجازِ مسیحا را ہویدا کردہ ام
پیکرے را با زبانِ خامہ گویا کردہ ام

ابر بن کر تم جو اس گلشن پہ گوہر بار ہو ———— بختِ سبزے کا مثالِ وعدۂ بیدار ہو

میں صدف، تم ابرِ نیساں میں گلستاں تم بہار — مزرعِ نوخیز میں، تم ابرِ دریا بار ہو
میں نتیجہ، اک حدیثِ امّیِ یثرب کا ہوں — تم اسی امّی کی امّت کے علم بردار ہو
اک مہِ نو، آسمانِ علم و حکمت پر ہوں میں — تم بھی اک فوجِ ہلالی کے سپہ سالار ہو
نام لیوا، اک دیارِ علم و حکمت کا ہوں میں — اور تم اگلے زمانوں کے وہی انصار ہو
یاں کبھی بادِ خزاں کا رنگ جم سکتا نہیں — میں مسلمانوں کا گلشن، تم مری دیوار ہو
تم اگر چاہو تو اس گلشن کے ایسے بھاگ ہوں — ہر کلی، گل ہو کے، اس کی زینتِ دستار ہو
رہنے والے، انتخابِ ہفت کشور کے ہو تم — کیوں نہ اس گلشن کی نکہت، رو کشِ تاتار ہو
میری دیواروں کو چھو جائے جو اکسیرِ عطا — خاک بھی میری مثالِ گوہرِ شہوار ہو
دیکھ اے ذوقِ خریداری! یہ موقع ہے کہیں — حسنِ یوسف سے نہ خالی مصر کا بازار ہو

یوسفِ علم استم و پنجاب کنعانِ من است
از دمیدِ صبحِ حکمت، چاک، دامانِ من است

مجھ میں وہ جادو ہے روحوں کو بنا سکتا ہوں میں — قوم کے بگڑے ہوؤں کو پھر بنا سکتا ہوں میں
عید ہوں میں اے نگاہِ چشمِ نظارہ! تری — شاہدِ مقصود کا پردہ اٹھا سکتا ہوں میں
طیرِ حکمت، باغِ دنیا میں ہوں اے صیاد میں — دام، تو سونے کا بنوا لے تو آ سکتا ہوں میں
طوسی و رازی و سینا و غزالی و ظہیر — آہ، وہ دلکش مرقع پھر دکھا سکتا ہوں میں
آئیں اڑ اڑ کر پتنگے مصر و روم و شام سے — شمع اک، پنجاب میں ایسی جلا سکتا ہوں میں
آزما کر تم ذرا دیکھو مرے اعجاز کو — ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ دکھا سکتا ہوں میں
گوش برآواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے — وہ صدا پھر اس زمانے کو سنا سکتا ہوں میں
ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو — پھر وہی محفل زمانے کو دکھا سکتا ہوں میں
گھر کسی کا جن کی ضو سے، غیرتِ مشرق بنے — اس انوکھی شان کے موتی لٹا سکتا ہوں میں
کارواں سمجھے اگر خضرِ رہِ ہمت مجھے — منزلِ مقصود کا رستہ دکھا سکتا ہوں میں

از خمِ حکمت بروں کردم شرابِ ناب را
[illegible] را

بن گیا ہے دست سائل دامنِ گلزار کیا؟
باغ پر چھایا ہوا ہے ابرِ گوہر بار کیا؟

کچھ ہوا ایسی چلے یارب کہ گلشن خیز ہوں
خار کیا، گل کی کلی کیا غنچۂ منقار کیا؟

حسن خود منت کشِ چشمِ تماشائی ہوا
اب نہیں دنیا میں باقی طالبِ دیدار کیا؟

اک جہاں آیا ہے گلگشتِ چمن کے واسطے
باغباں باہر نہ پھینکے گا چمن کے خار کیا؟

زندگی اپنی، زمانے میں تمھارے دم سے ہے
ہے خطِ دستِ کرم، میرے نفس کا تار کیا؟

ہاں، جسے چھونا ہو دامانِ ثریا کو کبھی
ایک دو اینٹوں سے اٹھ سکتی ہے وہ دیوار کیا؟

تیغ کے بھی دن کبھی تھے، اب قلم کا دور ہے
بن گئی کشور کشا یہ کاٹھ کی تلوار کیا؟

خوبیِ قسمت سے پہنچا علم کا یوسف یہاں
ورنہ کیا پنجاب اور پنجاب کا بازار کیا؟

مجھ سے وابستہ نہیں کیا آبروِ پنجاب کی؟
تیر کی صورت نہیں ہیں طعنۂ اغیار کیا؟

آرزوئے دل کو بھی کہنا کوئی دشوار ہے؟
کام خاموشی سے تجھ کو، اے لبِ اظہار کیا؟

گوش را جویائے آوازِ غریباں کردہ
شانہ را مائل بہ گیسوئے پریشاں کردہ

کیوں نہ دیوانے ہوں لب سوزِ نہاں کے واسطے
ڈھونڈ کر محفل نکالی داستاں کے واسطے

اس بھری محفل میں اپنا رازِ دل کہتا ہوں میں
باغ ہی زیبا ہے بلبل کی فغاں کے واسطے

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داں کے واسطے

جس نے پایا اپنی محنت سے زمانے میں فروغ
ہے وہی اخترِ جبینِ کہکشاں کے واسطے

باغباں کا ڈر کہیں، خطرہ کہیں صیاد کا
مشکلیں ہوتی ہیں سو، اک آشیاں کے واسطے

خضر، ہمت کا، رفیقِ راہِ منزل ہو اگر
گلستاں تیرے لیے، تو گلستاں کے واسطے

زندگی وہ چاہیے دنیا کی زینت جس سے ہو
شمع روشن بن کے رہ بزمِ جہاں کے واسطے

تشنہ لب کے پاس جاتا ہے کبھی اٹھ کر کنواں؟
رخت کب منزل نے باندھا کارواں کے واسطے

گلشنِ عالم میں وہ دل کش نظارہ ڈھونڈتا
آنکھ کو فرصت نہ ہو خوابِ گراں کے واسطے

پوشیدہ ہے بے آرامی محنت میں کچھ
جا رہا ہے تو کہاں، آرامِ جاں کے واسطے؟

روشن از نورِ مہِ حکمت شبستانِ من است
کاں دُرِ گم گشتۂ مومن بہ دامانِ من است

ہاں رگِ ہمت کو اپنی جوش میں لائے کوئی / عشقِ اخواں کا اثر دنیا کو دکھلائے کوئی
جوشِ ہمدردی میں پنہاں دولتِ ایماں ہے بس / نقشۂ خیرالقرون آنکھوں کو دکھلائے کوئی
ہے پریشاں بادِ ناکامی سے گیسوئے مراد / شانۂ دستِ عطا سے اس کو سلجھائے کوئی
بہرِ استقبال استادہ ہے ہر گل کی کلی / اس چمن میں صورتِ بادِ صبا آئے کوئی
یہ گل و گلزار صدقہ اُمّیِ یثرب کا ہے / دیکھنا اے باغباں! غنچہ نہ مرجھائے کوئی
مدّعا کو یہ سکھایا شورشِ فریاد نے / خود بخود میری طرح منھ سے نکل آئے کوئی
کہہ گئی ذوقِ کرم کو، شوخیِ حسنِ طلب / ہاتھ سے عاشق کا دل بن کر نکل جائے کوئی
کہ چھٹا دریا رواں ہونے کو ہے پنجاب میں / ابر کی صورت لٹے، اٹھ کر برس جائے کوئی
تاک میں بیٹھی ہوئی ہے شوخیِ دستِ طلب / دیکھیے، اس بزم سے بچ کر کہاں جائے کوئی
فکرِ دیں کے ساتھ رکھنا فکرِ دنیا بھی ضرور / ہیں بہت دشمن، کہیں دھوکا نہ کھا جائے کوئی

خویش را مسلم ہمی گویند و با ما کار نیست
رشتۂ تسبیحِ شاں جز رشتۂ زنّار نیست

علم کا محبوب رونق بخشِ کاشانہ تو ہو / انجمن اپنی مثالِ بزمِ جانانہ تو ہو
پھر سماں بندھ جائے گا غرناطہ و بغداد کا / پھر ذرا بھولا ہوا، تازہ وہ افسانہ تو ہو
بزم میں شوقِ مئے حکمت ہوا پیدا اگر / مَے بھی بٹ جائے گی، پہلے فکرِ پیمانہ تو ہو
یہ نظامیہ سلامت ہے تو پھر سعدی بہت / پر ذرا ویسا منور اپنا کاشانہ تو ہو
یادگارِ فاتحانِ ہند و اندلس ہو تمھیں / شان، شاہانہ نہ ہو، میری، امیرانہ تو ہو
پایمالی ہے جہاں میں ترکِ حکمت کی سزا / اس چمن سے مثلِ سبزہ کوئی بیگانہ تو ہو
وہ غنی ہے، علم کی دولت بھی کرتا ہے عطا / ہاں مگر پہلے روشِ تیری، گدایانہ تو ہو
آنکھ کو بیدار کر دیتی ہے یہ دیوانگی / کوئی اس حسنِ جہاں آرا کا دیوانہ تو ہو
رام کر لینا زمانے کا ترے ہاتھوں میں ہے / زندگی تیری جہاں میں دلربایانہ تو ہو

جل کے مرجانا چراغِ علم پر مشکل نہیں پہلے تیرے دل میں پیدا نورِ پروانہ تو ہو

اے کہ حرفِ اطلبوا[1] لو کان بالسین گفتہٖ
گوہرِ حکمت بہ تارِ جانِ امت سفتہٖ

اے کہ بردلہا رموزِ عشق آساں کردہٖ سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہٖ
اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو خاکِ یثرب را تجلی گاہِ عرفاں کردہٖ
اے کہ ذاتِ تو نہاں در پردۂ عینِ عرب روئے خود را در نقابِ میم پنہاں کردہٖ
اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہٖ
اے کہ ہم نام خدا، بابِ دیارِ علم تو اُمتیے بودی و حکمت را نمایاں کردہٖ
آتشِ الفت بہ دامانِ ربوبیت زدی عالمے را صورتِ آئینہ حیراں کردہٖ
فیضِ تو دشت عرب را مطلعِ انظار ساخت خاکِ ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردہٖ
دل نہ نالد در فراقِ ما سوائے نورِ تو خشک چوبے را ز ہجرِ خویش گریاں کردہٖ
کل فرستادن بہ بحرِ بیکراں می زیبدش خطرہ بے مایہ را ہم دستِ طوفاں کردہٖ
بے عمل را لطفِ تو لا تقنطوا آموختہ بس کہ وا بر ہر کسے بابِ دبستاں کردہٖ

ہاں دعا کن بہر ما اے مایۂ ایمانِ ما
پُر شود از گوہرِ حکمت سرِ دامانِ ما

۲۴ فروری ۱۹۰۲ء

حواشی۔ اقبال نے انجمنِ حمایت اسلام کے سترھویں سالانہ اجلاس میں ۲۳ فروری بروز اتوار دوسرے اجلاس میں یہ نظم پڑھی۔ جلسے کی صدارت میاں نظام الدین سب جج، راولپنڈی نے کی۔ جلسہ اسلامیہ کالج میں منعقد ہوا۔ نظم کے اختتام پر صدر نے کہا:
"شیخ صاحب کی تعریف جس قدر کی جائے کم ہے۔ آپ پنجاب کے ملک الشعرا ہیں"[1]

---

[1] اقتباس از روئیدادِ انجمن بحوالۂ نوادرِ اقبال ص ۱۳۸

اس نظم سے سامعین اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کی کاپیاں دس دس روپیے میں خرید لیں۔ معلوم نہیں کس طرح آئینۂ ایام اقبال میں سرودِ رفتہ کے حوالے سے اس نظم کی تاریخ ۱۵ ستمبر ۱۹۰۱ء لکھی ہے حالانکہ سرودِ رفتہ ص ۳۰ پر اس کی تاریخ ۲۴ فروری ۱۹۰۲ء ہی دی ہے۔

سلہ مصرع کے معنی ہیں 'مرغانِ چمن صرف کہنے بھر کو رنگیں نوا ہیں'

سلہ۲ اقبال نے پہلی بار 'بانگِ درا' کی ترکیب اس نظم میں استعمال کی ہے جو ۲۲ سال بعد ان کے مجموعے کا عنوان بنی۔

سلہ۳ سرود کے مطابق اشارہ ہے اس حدیث کی طرف اطلبو العلم ولوکان بالصین۔
علم ڈھونڈو اگرچہ وہ چین میں ہو

سلہ۴ سرود میں اس کی تصریح یوں ہے۔
"اس کے لکھنے کی ضرورت میرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے بروزیت کی بنا پر ہوئی یعنی کہتے ہیں کہ تیرے بعد نبوت کا دعویٰ ہر لحاظ سے شرک فی النبوت ہے خواہ اس کا مفہوم کوئی ہو یعنی ظلّی اور بروزی نبوت بھی اس سے باہر نہیں" (ص ۳۷)

سلہ۵ حضرت علی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ 'علی' خدا کے ناموں میں سے ایک ہے نیز حدیث انا مدینۃ العلم و علی بابھا۔ (سرود ص ۳۷)

غزل
(منسوخ)

دل کی بستی عجیب بستی ہے — لوٹنے[۱] والے کو ترستی ہے
ہو قناعت جو زندگی کا اصول — تنگ دستی، فراخ دستی ہے
جنسِ دل ہے جہان میں کم یاب — پھر بھی یہ شئے غضب کی سستی ہے

سلہ نسیم فاطمہ: آئینۂ ایام اقبال۔ ص ۱۷۔ کراچی ۱۹۷۷ء

تابِ اظہار عشق نے لے لی   گفتگو کو زباں ترستی ہے
ذکرِ جامِ طہور، وعظ کا[2] واعظ   مۓ پرستی کی مۓ پرستی ہے
شعر بھی اک شراب ہے اے دل!   ہوشیاری، اسی[3] کی مستی ہے
ہم فنا ہو کے بھی فنا نہ ہوئے   نیستی اک طرح کی ہستی ہے
آنکھ کو کیا نظر نہیں آتا   ابر کی طرح مۓ[5] برستی ہے

دیکھیے کیا سلوک ہو اقبال
مجرمِ جرم بت پرستی ہے   مارچ ۱۹۰۲ء

حاشیہ - یہ نظم مخزن مارچ ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔

عقل و دل

خضر سے چھپ کے مر رہا ہوں میں   م   تشنہ کامِ مۓ فنا ہوں میں
ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل   م   خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں
کانپ اٹھتا ہے ذکرِ مرہم پر   م   وہ دلِ درد آشنا ہوں میں
تنکے چن چن کے باغِ الفت کے   م   آشیانہ بنا رہا ہوں میں
گلِ پژمردۂ چمن ہوں مگر   م   رونقِ خانۂ صبا ہوں میں
کارواں سے نکل گیا آگے   م   مثلِ آوازۂ[1] درا ہوں میں
دستِ واعظ سے آج بن کے نماز   م   کس ادا سے قضا ہوا ہوں میں
مجھ سے بے زار ہے دلِ زاہد   م   دیدۂ حور کی حیا ہوں میں
ہے زباں مائلِ ترانۂ شوق   م   سننے والے کو دیکھتا ہوں میں
میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر[2]   م   رمزِ وحدت سے آشنا ہوں میں
پردۂ میم میں رہے کوئی   م   اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں
سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ   م   کیا مرا شوق اور کیا ہوں میں
میں کسی کو برا کہوں، توبہ   م   ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

جام ٹوٹا ہوا ہوں میں، لیکن م مے حق سے بھرا ہوا ہوں میں
ایک دانے پہ ہے نظر تیری م اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
تو جدائی پہ جان دیتا ہے م وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے م اس عبادت کو کیا سترا ہوں میں
بت پرستی تو ایک مذہب ہے م کفر غفلت کو جانتا ہوں میں
مرگ اغیار پر خوشی ہے تجھے م اور آنسو بہا رہا ہوں میں
میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو م تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گزر فلک پہ مرا دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
علم پلتا ہے میری گودی میں م رازِ ہستی سے آشنا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسرِ کتابِ ہستی کی مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
تو مثری ہمسری کرے، تو بہ! م دیدۂ ہست کی ضیا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے پر مجھے بھی تو دیکھ، کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
میرے دم سے جہان بستا ہے م اس اندھیرے میں چاندنا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بہ پا طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا ۔۔۔ عرش رب جلیل کا ہوں میں
گلشن طور ہے بہار مری ۔۔۔ قطرۂ بحر آشنا ہوں میں
تو ہے وابستۂ زمان و مکان ۔۔۔ اور اس قید سے رہا ہوں میں
ہاے یہ دل ہو میرے پہلو میں ۔۔۔ تو یہ سمجھے کہ دہریا ہوں میں
اہل دل کو بگاڑنے سے مطلب؟ ۔۔۔ سب بزرگوں کی خاک پا ہوں میں

فیض، اقبال ہے اسی در کا
بندۂ شاہ لافتیٰ ہوں میں

مئی ۱۹۰۲ء

حواشی ۔ یہ نظم مخزن مئی ۱۹۰۲ء میں اس عنوان سے شائع ہوئی ۔

خط منظوم

(پیغام بیعت کے جواب میں)

اسی عنوان سے پنجۂ فولاد لاہور ۱۴ جولائی ۱۹۰۲ء جلد ۲ شمارہ ۲۷ میں شائع ہوئی۔
سرود رفتہ ص ۱۰۳ پر نوٹ ہے ۔
"یقینی طور پر معلوم نہیں کہ یہ پیغام کس طرف سے آیا تھا لیکن قرینہ یہ ہے کہ یہ پیغام قادیانی جماعت کی طرف سے ملا تھا ۔ اس کی جانب کچھ اشارے خود نظم میں ہیں ۔ ایک قابل غور امر یہ ہے کہ اس خط کے جواب میں اسی بحر اور اسی زمین میں ایک نظم سیّد حامد شاہ نے لکھی تھی جو قادیانی جماعت کے ممتاز رکن تھے ۔ اس کا آخری شعر یہ ہے ۔

کیوں نہ ہو خاک پا مرا اقبال ۔۔۔ حامد نائب خدا ہوں میں"

میرے پیش نظر جو قلمی کلام اقبال ہے اس میں ذیلی عنوان یہ ہے :

(بہ جواب دعوت بیعت مرزا)

اس سے یہ واضح ہوگیا کہ یہ دعوت بیعت مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف سے تھی ۔ اس نظم کی مزید تفصیل محمد عبداللہ قریشی نے اپنی کتاب "معاصرین اقبال کی

نظر میں" کے ص ۲۴۴ تا ۲۴۱ پر دی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد قادیانی ہو گئے تھے۔ اقبال پر بھی حامد سیالکوٹی کی معرفت ڈورے ڈالے جارہے تھے۔ اقبال کی نظم ہفتہ وار 'الحکم' قادیان بابت ۱۰، ۱۷، ۲۴ فروری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب کے مرید حامد سیالکوٹی نے ایک طویل اور نہایت سخت نظم لکھی جس میں اقبال کے کئی شعروں پر طنز تھا۔ اس میں مندرجۂ بالا جوابی شعر یوں تھا :

میرا پابوس کیوں نہ ہو اقبال ۔ حامدِ نائبِ خدا ہوں میں

عجیب بات ہے کہ اقبال کی نظم میں بیعت کے جواب کا کوئی مضمون نہیں۔ شاید پہلے بند کے بعض اشعار کا تعلق پیغامِ بیعت والے خط کے مطالب سے ہو مثلاً شعر ۱۰، ۱۳، ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۰۔ دوسرے بند کے آخری شعر سے پہلے کے دو شعر بھی صفائی کے طور پر پیش کیے گئے ہیں نظم میں براہِ راست جوابیہ انداز نہیں۔ اس کے علاوہ نظم بالکل دو لخت ہے۔ پہلے اور دوسرے بند میں کوئی مضبوط رشتہ نہیں۔

علہ : اسلامیہ کالج کا خطاب والی نظم میں پہلی بار بانگِ درا کی ترکیب دکھائی دی تھی۔ اس نظم میں آوازۂ درا کی ترکیب ہے جس کے وہی معنی ہیں

ع‍۲ہ 'چاندنا' بمعنی روشنی اقبال نے کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ ادبی اُردو میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ میرے وطن ضلع بجنور، یو۔پی میں عورتیں بولتی تھیں۔ میں نے اپنی ماں سے کئی بار سنا ہے۔

آفتابِ صبح

اے چراغِ آسماں! اے آفتابِ صبح دم! ۔ راستہ تیرا نہیں شرمندۂ نقشِ قدم
ابر میں چھپنا ترا، لاتا ہے دل پر ابرِ غم ۔ یہ ادا چشمِ تماشائی پہ کرتی ہے ستم

تو وہ مطلع ہے سرِ دیوانِ عالم کے لیے
خامۂ قدرت نے آبِ زر سے لکھا ہے جسے ۔

ہائے کس حسنِ جہاں آرائی ہے تجھ میں جھلک؛ م خیرہ ہو جاتی ہے تیرے نور سے چشمِ فلک
روح پرور ہے تجلّی تیری اے چشمِ ملک! م ملتی جلتی ہے چراغِ طور سے تیری چمک
خانۂ دل نور سے معمور ہو جائے مرا
نقطۂ دل تخمِ نخلِ طور ہو جائے م

شورشِ مے خانۂ امکاں سے بالاتر ہے تو زینتِ بزمِ فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو
ہو دُرِ گوشِ عروسِ صبح وہ گوہر ہے تو جس پہ سیمائے افق نازاں ہو وہ زیور ہے تو
صفحۂ ایّام سے داغِ مدادِ شب مٹا
آسماں سے نقشِ باطل کی طرح کوکب مٹا

حسن تیرا جب ہوا بامِ فلک سے جلوہ گر آنکھ سے اڑتا ہے یک دم خواب کی مے کا اثر
نور سے معمور ہو جاتا ہے دامانِ نظر کھولتی ہے چشمِ ظاہر کو ضیا تیری مگر
ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
چشمِ باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیے

شوقِ آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے زندگی بھر قیدِ زنجیرِ تعلّق میں رہے
زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کے لیے آرزو ہے کچھ اسی چشمِ تماشا کی مجھے
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
امتیازِ ملّت و آئیں سے دل آزاد ہو

بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں نوعِ انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں
دیدۂ باطن پہ رازِ نظمِ قدرت ہو عیاں ہو شناسائے فلک شمعِ تخیّل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے
حسنِ عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

صدمہ آ جائے ہوا سے گل کی پتّی کو اگر اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر
دل میں ہو سوزِ محبّت کا وہ چھوٹا سا شرر نور سے جس کے ملے رازِ حقیقت کی خبر

شاہدِ قدرت کا آئینہ ہو، دل میرا نہ ہو
سر میں جز ہمدردیِ انساں کوئی سودا نہ ہو

تو اگر زحمت کشِ ہنگامۂ عالم نہیں
یہ فضیلت کا نشاں اے نیرِ اعظم نہیں
اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں
ہمسرِ یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں

نورِ مسجودِ ملک گرمِ تماشا ہی رہا
اور تو منت پذیرِ صبحِ فردا ہی رہا

آرزو نورِ حقیقت کی ہمارے دل میں ہے
لیلیٔ ذوقِ طلب کا گھر اسی محمل میں ہے
کس قدر لذت کشودِ عقدۂ مشکل میں ہے
لطفِ صد حاصل ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

دردِ استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں

حاشیہ: یہ نظم سب سے پہلے خدنگِ نظر لکھنؤ مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی[1] اس وقت اس کا عنوان آفتابِ سحر تھا۔

[2] جوش ملسیانی نے اپنی کتاب اقبال کی خامیاں (ص ۳۵) میں اعتراض کیا کہ اس پہلے شعر کے پہلے مصرع میں 'ہوا' ماضی ہے، دوسرے میں 'اُڑتا ہے' حال ہے، عدم تقابل کا عیب ہو گیا ہے۔ اس کے ازالے کے لیے وہ دوسرے مصرع کی یہ تجویز کرتے ہیں ع اُڑ گیا آنکھوں سے یکدم خواب کی مے کا اثر

غزل

(منسوخ)

بلا کشانِ محبت کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا خطِ لوحِ سرِ مزار ہوں
فنا ہوئے یہ بھی گویا وفا شعار ہوں میں
جو مٹ گیا تو حسینوں کا اعتبار ہوں

---

[1] بحوالہ عتیق صدیقی: اقبال جادوگر ہندی نژاد۔ ص ۳۱

کبھی نہ گوشِ سماعت سے شرمسار ہوں میں
وہ راز ہوں کہ زمانے پہ آشکار ہوں میں

نگاہ سے نہ کہیں صبح کو اتر جاؤں
شبِ وصال کسی کے گلے کا ہار ہوں میں

نسیمِ صبح نہ چھیڑے مجھے کہ دامن سے
کسی کے ہاتھ کا جھاڑا ہوا غبار ہوں میں

نشے میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ
وہ اپنا وعظ کہے جائے، ہوشیار ہوں میں

تمھاری شوخ نگاہی نے پڑھ کے کیا پھونکا
قرار بھی مجھے آئے تو بے قرار ہوں میں

تڑپ[1] کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کو جھکا کر گنہ گار ہوں میں

کسی طرح سے مری بام تک رسائی ہو
فغانِ خاک نشینانِ کوئے یار ہوں میں

رہی نہ زہد میں اقبال! وہ پرانی بات
کسی کے ہجر میں جینے سے شرمسار ہوں میں

حاشیہ: اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ ابتدائی دور کی معلوم ہوتی ہے۔

[1] یاد کیجیے وہ مشہور شعر

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

صدائے درد

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا! تو مجھے

اے ہمالہ! تو چھپا لے اپنے دامن میں مجھے
ہے غضب کی بے کلی اپنے نشیمن میں مجھے

مدتیں گزری ہیں مجھ کو رنج و غم سہتے ہوئے
شرم سی آئی ہے اب اس کو وطن کہتے ہوئے

آہ ویرانی ہے پنہاں یاں کی ہر تعمیر میں
آشیاں! اور اس گلستانِ خزاں تاثیر میں؟

آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا؟ یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

لذّتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
۹ اختلاطِ موجۂ ساحل سے گھبراتا ہوں میں

۱۰ دانۂ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں — ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں!
۱۱ حسن ہو کیا خود نما، جب کوئی مائل ہی نہ ہو — شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو!
۱۲ ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں؟ — میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں؟

کب زباں کھولی ہماری لذّتِ گفتار نے
۱۳ پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

۱۴ پھر بلا لے مجھ کو اے صحرائے وسطِ ایشیا! م آہ اس بستی میں اب میرا گزارا ہو چکا
۱۵ یا لے چل مجھ کو پھر اے کشتیِ موجِ اٹک! م اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک
۱۶ ہاں سلام آخری اے مولدِ گوتم! تجھے م اب فضا تیری نظر آتی ہے نامحرم مجھے
۱۷ الوداع اے سیرگاہِ شیخِ شیراز! الوداع م اے دیارِ بالمیکِ نکتہ پرداز! الوداع
۱۸ الوداع اے مدفنِ ہجویریِ اعجاز دم! م رخصت اے آرام گاہِ شنکرِ جادو رقم!
۱۹ الوداع اے سرزمینِ نانکِ شیریں بیاں م رخصت اے آرام گاہِ چشتیِ عیسیٰ نشاں
۲۰ رمزِ الفت سے مرے اہلِ غافل ہوئے م کارزارِ عرصۂ ہستی کے نا قابل ہوئے
۲۱ اپنی اصلیت سے ناواقف ہیں کیا انساں ہیں یہ! م غیروں کو سمجھتے ہیں، عجب ناداں ہیں یہ
۲۲ جس کا اک مدت سے دھڑکا تھا وہ دن آنے کو ہے م صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے
۲۳ دل حزیں ہے جاں رہینِ رنجِ بے اندازہ ہے م آہ اک دفتر تھا اپنا، وہ بھی بے شیرازہ ہے
۲۴ امتیازِ قوم و ملت پر مٹے جاتے ہیں یہ م اور اس الجھی ہوئی گتھی کو الجھاتے ہیں
۲۵ ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی م کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
۲۶ روح کا جوبن نکھرتا ہے اسی تدبیر سے م آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے
۲۷ رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں م خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں
۲۸ وصلِ محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی م اک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تفسیریں سبھی

ایک ہی مٹے[1] سے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے[2]

۲۹ یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے؟[3] جون ۱۹۰۲ء

حواشی: یہ نظم اولاً مخزن جون ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اشعار نمبر ۲۴ تا ۲۷ قابلِ توجہ ہیں جن میں صریحاً قوم کو مذہب پر ترجیح دی ہے۔

ع۱ جیسا کہ "یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے" کے سلسلے میں لکھا گیا، اگست ۱۹۰۲ء کے اردوئے معلی میں کسی نے تنقیدِ ہمدرد کے فرضی نام سے اقبال کے کلام پر کچھ اعتراضات کیے[1]۔ اقبال نے اُن کا جواب اپنے مضمون "اردو زبان پنجاب میں" شائع شدہ مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء میں دیا۔ زیرِ نظر شعر پر اعتراض تھا کہ اس کے قافیوں میں ایطائے خفی ہے۔ اقبال نے اساتذہ کے یہاں سے مثالیں دے کر ثابت کیا ایطائے خفی جائز رہی ہے۔ اقبال کا مضمون عبدالغفار شکیل کے مرتبہ اقبال کے نثری افکار میں شامل ہے۔

ع۲ اس شعر پر تنقیدِ ہمدرد کا اعتراض تھا کہ 'ہوا آنا' محاورہ نہیں۔ اقبال نے اساتذہ کے یہاں سے 'ہوا آنے' کی سند پیش کیں۔

ع۳ عبدالرزاق کی کلیاتِ اقبال میں اس مصرع کا قدیم متن یہ ہے۔

ع ہاں سلام اے مولدِ بوزاسفِ گوتم تجھے

اکبر حسین قریشی نے تلمیحات و اشاراتِ اقبال ص ۲۴۸ پر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ا، ص ۷۰-۶۹۷ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بوذاسف گوتم بدھ کا نام ہے۔ بعض کے خیال میں یہ مذہبِ صابی کا بانی تھا۔ ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پا ندے گورنر اڑیسہ نے خدا بخش لیکچر میں لکھا ہے کہ عرب و ایران میں گوتم کے لقب بودھستو کو بوزاسف کہتے تھے۔

(ISLAM AND NATIONAL INTEGRATION P.8)

میرے استفسار پر انھوں نے اس کی دو اسناد دیں:

۱۔ مولوی ضیاء الدین، پروفیسر فارسی و اردو، وشو بھارتی، شانتی نکیتن، مضمون "بودھ مذہب اور اسلام" مشمولہ وشو وانی، بودھ کلچر نمبر، مئی ۱۹۴۲ء

۲۔ تاریخ بخارا مرتبہ C. SCHEFER، ۱۸۹۲ء ص ۱۹-۱۸

---

[1] ڈاکٹر حیدری کے مطابق حسرت موہانی اس قلمی نام سے اپنے رسالے اردوئے معلی میں اقبال کے کلام پر اعتراض کرتے تھے (حیدری، اقبال کا سفرِ لکھنؤ، حقیقت یا افسانہ۔ ہماری زبان بابت ۱۵ مئی ۱۹۸۰ء)

۷۴ شیخِ شیراز سے مراد سعدی شیرازی ہیں جن کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ہندوستان آئے تھے۔

۷۵ شیخ ابوالحسن علی بن عثمان الجلابی معروف بہ داتا گنج بخش ہجویری، غزنی کے محلہ ہجویر کے رہنے والے تھے[1]۔ اسی کی مناسبت سے ہجویری کہلائے۔ وہاں سے لاہور چلے آئے۔ ان کا انتقال ۴۶۵ھ میں ہوا۔ لاہور میں بھاٹی دروازے کے قریب مزار ہے۔ ان کی تصنیف کشف المحجوب مشہور ہے۔

۷۶ ویدانت اور اپنشد کے مشہور عالم آدی شنکر آچاریہ

۷۷ چشتی سے مراد خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہیں۔

غزل (منسوخ)

ہے کلیجہ فگار ہونے کو
دامنِ لالہ زار ہونے کو

کیا ادا تھی یہ جاں نثاری میں
تھے وہ مجھ پر نثار ہونے کو

جستجوئے قفس ہے یہ کس لیے
خوب سمجھے شکار ہونے کو

عشق وہ چیز ہے کہ جس میں قرار
چاہیے بے قرار ہونے کو

یارِ جانی کہیں نہیں ملتا
یوں تو ہوتے ہیں یار ہونے کو

لالہ اور داغِ دل! بہانہ ہے
دل جلوں میں شمار ہونے کو

زخم اور سوزنِ رفو، توبہ!
کھل گیا بستہ کار ہونے کو

پیس ڈالا ہے آسماں نے مجھے
کس کی رہ کا غبار ہونے کو

وعدہ کرتے ہوئے نہ رک جاؤ
ہے مجھے اعتبار ہونے کو

---

[1] حضرت علی ہجویری، نقوش لاہور نمبر شمارہ ۹۲، فروری ۱۹۶۲ء۔ ص ۱۵۹ تا ۱۶۱

ان سے پوچھا کہ کون چھپتا ہے؟ ہم چھپے آشکار ہونے کو
ہم نے اقبال عشق بازی کی
پی یہ مے ہوشیار ہونے کو

جون ۱۹۰۲ء

حاشیہ: یہ غزل مخزن جون ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی

ماتمِ پسر

(منسوخ)

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا — وہ خورشیدِ روشن نہاں ہو گیا
بیاباں، ہماری سرا بن گئی — مسافر وطن کو رواں ہو گیا
گیا اڑ کے وہ بلبلِ خوش نوا — چمن پائمالِ خزاں ہو گیا
نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار — نظر سے جو وہ گل نہاں ہو گیا
گیا کارواں اور میں راہ میں — غبارِ رہِ کارواں ہو گیا
گرا کٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر — مرے صبر کا امتحاں ہو گیا
بڑھا اور اک دشمنِ جاں ستاں — دھواں آہ کا آسماں ہو گیا
ستم اس غضب کا خزاں نے کیا — بیاباں، مرا بوستاں ہو گیا
ہوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے — کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہو گیا
کسی نوجواں کی جدائی میں قد — جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا
جدائی میں نالاں ہو بلبل نہ کیوں — وہ گل زیبِ باغِ جناں ہو گیا
وہ سرخی ہے اشکِ شفق رنگ میں — حریفِ مئے ارغواں ہو گیا
بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں — وہی نذرِ برقِ تپاں ہو گیا
کروں ضبط اے ہم نشیں کس طرح — کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہو گیا
غضب ہے غلام حسن کا فراق — کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہو گیا

دیا یہ حُزن کے وہ غم فلک نے اسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہو گیا

جولائی ۱۹۰۲ء

حاشیہ: یہ نظم مخزن جولائی ۱۹۰۲ء میں چھپی۔ اس کے ساتھ جو نوٹ تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بارہ مولہ کشمیر کے رئیس خواجہ عبدالصمد ککڑو متخلص بہ مقبل کا بیٹا خواجہ غلام حسن انتقال کر گیا۔ خواجہ عبدالصمد فارسی کے شاعر تھے لیکن غم کے سبب فرزند کا مرثیہ نہ کہہ سکے۔ اقبال نے ان کی طرف سے مرحوم کا مرثیہ لکھ دیا۔

آفتاب

(ترجمہ گایتری)

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم، یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستیِ ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی، نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اول و آخر ضیا تری

اگست ۱۹۰۲ء

حاشیہ: یہ نظم مخزن اگست ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے اقبال کا ایک تمہیدی

نوٹ تھا جو رختِ سفر طبع دوم اور باقیاتِ اقبال طبع سوم میں موجود ہے۔ وہاں سے لے کر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں۔ یہ دعا اعترافِ عبودیت کی صورت میں گویا ان تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظامِ عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدہ سے اوّل اوّل انسانِ ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علمِ ملل و النحل کے عالموں کے لیے انتہا درجہ کا ضروری ہے کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کی ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے اور جس کو براہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ محققینِ السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونس مرحوم کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ زبانِ سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر" استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے "اللّٰہ نورُ السّمٰوٰتِ وَ الارض" اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا" علیٰ ہذا القیاس۔ افلاطونِ الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران کے قدیم انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں دقت اور بھی بڑھ

گئی ہے کیوں کہ اصل آواز کی موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعرا ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن میں حروف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمہ کی بنیاد اس سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نرائن اُپنشد میں گایتری مذکورہ کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو جیپ مین نے پوپ کا ترجمۂ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گایتری نہیں ہے۔

محمد اقبال"

گایتری منتر چاروں ویدوں میں ملتا ہے۔ مثلاً رگ وید کے تیسرے منڈل کے ۶۲ ویں بھجن کے دسویں اشلوک میں اور اسی طرح بقیہ تینوں ویدوں میں بھی۔ یہ سنسکرت سے قبل کی ویدک بھاشا یا ویدک سنسکرت میں ہے۔ اس کا متن یہ ہے۔

OM	اوم
BHUR BH' VAH SWAH	بھُر بھُوَیہ سُوَیہ
TAT SAVI'' UR VARENIAM	تت سَوِیتُر وَرینیم
BHARGO DEVASYA DHIMAHI	بھرگو دیوَسیہ دھی مہی
DHIYO YO NAH PRACHODAYAT	دھیو یونیہ پرچوُدیات

یہ گایتری چھند (بحر) میں ہے اس لیے اسے گایتری منتر کہتے ہیں۔ اس میں سوِیتر (یا ساوِتری) بھگوان سے پرارتھنا ہے اس لیے اسے ساوترِ (آخریں نصف ی) منتر بھی کہتے ہیں۔ اس کے معنی اگر سورج لیے جائیں تو منتر بہت سطحی ہو جائے گا۔ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب سنسکار ودھی ص ۹۰۔۹۲ میں اس کے معنی "سورج وغیرہ جملہ انوار کو منور کرنے والا" لکھے ہیں۔ ولکنس نے لکھا ہے

t is supposed that Savitri refers to the sum which is invisible;
whilst Surya refers to the sun visible

اے ایل بھاشم کے مفہوم کا ذکر آگے آئے گا۔ اُس نے اپنی کتاب کے ص ۹۳ پر اس کے معنی تحریک وترغیب دینے والا THE STIMULATOR لکھے ہیں۔ خود اقبال نے اپنے نوٹ میں درست لکھا ہے۔

" اصل میں اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسبِ ضیا کرتا ہے۔"

کلام اقبال کے قلمی مجموعے بیاضِ عماد میں اس نظم کا عنوان " آفتابِ حقیقت" دیا ہے جو زیادہ درست تھا۔ معلوم نہیں اقبال نے اسے محض آفتاب کہہ کر کیوں غلط فہمی کا سامان کر دیا۔ ذیل میں اس منتر کے معنی لکھے جاتے ہیں۔ یہ واضح ہو کہ سنسکرت اور ویدک بھاشا میں ایک لفظ کے کئی معانی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اس منتر کے مفہوم پر اتفاق نہیں۔ بعضوں نے اس کے لفظی معنی لکھنے پر اس کی تفسیر کو ترجیح دی ہے جہاں لفظوں کے مجازی معنی اور نہ جانے کیا کیا متعلقات واوصاف بڑھا دیے ہیں۔ 'اوم' ایشور کا صوتی علامتی نام ہے۔ اسے ایشور، پرمیشور، بھگوان، برہم وغیرہ کہنے سے کسی ایک صفت کا بیان ہوتا ہے جس سے معنی محدود ہو جاتے ہیں۔ اس کے تدارک کے لیے دو اصوات کا مجموعہ اُوم طے کیا گیا۔ قرآن میں ا ل م بھی ایسا ہی صوتی علامتی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ اکثر منتروں کو اوم سے شروع کیا جاتا ہے۔

بھُر بھُوَیہ سُوَیہ کو بعض علما اس منتر کا جزو مانتے ہیں بعض نہیں مانتے۔ ان الفاظ کے معانی میں بہت اختلاف ملتا ہے۔ ذیل میں تین معانی دیے جاتے ہیں۔ پہلے کالم میں سوامی دیانند سرسوتی کی کتاب سنسکار ودھی کے مطابق معانی ہیں۔ دوسرے کالم میں ڈاکٹر ستیہ ورت کی کتاب 'ویدک سنسکرتی کا سندیش ص ۱۶۰۔ دلی سے اور تیسرے کالم میں اپنی یونیورسٹی کے ایک استاد تیج رام شرما ایم اے سنسکرت، شاستری سے لے کر درج ہیں۔

بھُر ۔ پرانوں کا پران یعنی روح الارواح ۔ BEING ۔ زمین

1 W.U WILKINS · HINDU MYTHOLOGY, VEDIC AND PURANIC P 30 INDOLOGICAL BOOK HOUSE, VARANASI, REPRINT 1972.

بھویہ ۔ سب دکھوں سے چھڑانے والا ۔ Becoming ۔ خلا (آکاش)
سُوَیہ ۔ سب دکھوں سکھوں کا ذمے دار ۔ Bliss ۔ عرش
بقیہ لفظوں کے معنی یہ ہیں ۔

تت ۔ وہ سوتیر ۔ منبع انوار ورنیئم ۔ ارفع ، بہترین ، شریشٹھ
بھرگو ۔ انوار کا جگمگٹ دیوسیہ ۔ الوہی دھی مہی ۔ ہمیں عقل دے
یا ہم دھیان کرتے ہیں دھیو یونہ ۔ ہماری فہم
پرچودیات ۔ تحریک دے ، جلا کر دے ، بیدار کر دے ۔
میرے نزدیک اس منتر کے یہ معنی ہوئے ۔
اوم ، زمین ، خلا اور عرش کے مالک ! سب سے ارفع منبع انوار ! الوہی انور کے جگمگٹ !
ہم تیرا دھیان کرتے ہیں (یا ہمیں فہم دے) تو ہماری فہم کو تحریک اور ولولہ دے ۔
تین انگریزی کتابوں سے اس کے معنی دیکھیے ۔

1 0 that glory of Savitri, mortexecellent

The effulgence of the Divine
Let us meditate upon
May it inspire us with understanding

Hindu World

2. Let us think on the lovely splendour of the god Savitri,
What he may inspire our minds.

A.L. BHASHAM

3. Let us meditate on the excellent glory of the Divine Vivifier May He enlighten (as stimulate) our understandings.

W J WILKINS

---

1. Hindu World Vol.1 ALLEN and UNWIN, LONDON
یہ کتاب ڈکشنری کی شکل میں ہے ۔ مندرجہ معانی گایتری منتر کے تحت دیے ہیں ۔
2. A.L. BHASHAM. THE WONDER that was India - FONTANE P 163
3. W.J. WILKINS : HINDU MYTHOLOGY P.30.

مندرجہ بالا تحریر کے بیشتر حصے کے لیے میں ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مشکور ہوں ۔ سوامی دیانند سرسوتی، تین انگریزی کتابوں کے تراجم نیز اقبال کی نظم کے ماخذ کے بارے میں انھیں سے مواد حاصل ہوا ۔

واضح ہو کہ ان تینوں میں سے کسی نے بھُرؔ بھُوؔیہ سویہ کو اپنی تشریح میں جگہ نہیں دی ۔

یوسف سلیم چشتی نے شرحِ بانگ درا میں اس کا مفہوم بہت مناسب لکھا ہے ۔

وہ جو ساری کائنات کا خالق ہے، وہی اس لائق ہے کہ اس کا ذکر اور دھیان کیا جائے جو ساری چمکیلی اشیاء کا خزانہ ہے اور نور کا منبع ہے، ہم اسی کا دھیان کرتے ہیں (اور اس سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ) وہ ہماری عقل کو راہ راست پر چلائے (تاکہ ہم نیکی پر عمل کر سکیں)

اقبال نے اس نثر کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس کی شرح کو نظم کیا ہے۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی نے مجھے اپنے مکتوب مورخہ ۲۹/ مارچ ۱۹۸۲ء میں لکھا کہ اقبال نے میکس مولر کی تفسیر کا ترجمہ کیا ہے۔ میکس مولر نے سوریہ نارائن اُپنشد کا حوالہ دیا ہے جب کہ اس کا صحیح نام محض سوریہ اُپنشد ہے۔ اقبال نے نظم کے ساتھ لکھے شذرات میں سوریہ نرائن اپنشد لکھا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا ماخذ میکس مولر ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظم میں بہت سے حشویات ہیں خصوصاً آخری تین شعر بالکل غیر ضروری ہیں۔ اقبال سَوِیتر کے صحیح معنی سمجھتے تھے اس کے باوجود آفتاب حقیقت کو آفتاب کر دیا جس کی وجہ سے لاہور کے مولانا دیدار علی شاہ خطیب نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے لکھا

" اندریں صورت یزداں اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے "

؎۱ جوش ملسیانی نے "اقبال کی خامیاں" میں اعتراض کیا ہے کہ 'جاندار' فارسی ترکیب کا جزو ہے اس لیے اس میں اعلانِ نون نامناسب ہے (ص ۲۴)

شکریۂ انگشتری

(منسوخ)

آپ نے مجھ کو جو بھیجی ارمغاں انگشتری — دے رہی ہے مہر و الفت کا نشاں انگشتری
زینتِ دستِ حنا مالیدۂ جاناں ہوئی — ہے مثالِ عاشقاں آتش بجاں انگشتری
تو سراپا آیتے از سورۂ قرآن فیض — وقفِ مطلق اے سراجِ مہرباں انگشتری
میرے ہاتھوں سے اسے پہنے اگر وہ دل رُبا — ہو رموزِ بے دلی کی ترجماں انگشتری
ہو نہ برق افگن کہیں اے طائرِ رنگِ حنا! — تاکتی رہتی ہے تیرا آشیاں انگشتری

ساغرِ مے میں پڑا انگشتِ ساقی کا جو عکس　　بن گئی گردابۂ آبِ رواں انگشتری

ہوں بہ تبدیلِ قوافی فارسی میں نغمہ خواں
ہند سے جاتی ہے سوئے اصفہاں انگشتری

یارم از کشمیر[1] فرستادست چار انگشتری　　چار در صورت، بمعنی صد ہزار انگشتری
چار را اگر صد ہزار آوردہ ام، اینک دلیل　　شد قبولِ دستِ یارم ہر چہار انگشتری
داغ داغ از موجِ مینا کاریش جوشِ بہار　　می دہد چوں غنچۂ گل بوئے یار انگشتری
درلہا[2] ور آمد و چشمِ تماشا شد تمام　　بود در کشمیر چشمِ انتظار انگشتری
یار را ساغر بکف، انگشتری در دستِ یار　　حلقہ اش خمیازۂ دستِ خمار انگشتری
ما اسیرِ حلقہ اش، او خود اسیرِ دستِ دوست　　اللہ اللہ دام و صیاد و شکار انگشتری
خاتمِ دستِ سلیماں، حلقہ در گوشِ وے ست　　اے عجب! انگشتری را جاں نثار انگشتری
وہ[3] چہ بخشاید بہ دستِ آں نگارِ سیم تن　　ماند گر زیں پیشتر سربستہ کار انگشتری
من دلِ گم گشتہ خود را کجا جویم سراغ؟　　دزدیِ دزدِ حنا را پردہ دار انگشتری
رازدارِ دزد، ہم دزدست در بازارِ حسن　　چشمکِ دزدِ حنا را، رازدار انگشتری
ہم دو با ہم ساختند و نقدِ دل ہا می برند　　پختہ مغز انگشتِ جاناں، پختہ کار انگشتری
نوبہارِ دل فریب، انگشتری در دستِ یار　　بوسہ بر دستش زند، لیل و نہار انگشتری
بوالہوس از انگشتری نغزِ اطاعت یاد گیر　　می نہد سر بر خطِ فرمانِ یار انگشتری
ماہِ نو قالب تہی کرد ست از حسرت بہ چرخ　　جلوہ فرما شد چو در انگشتِ یار انگشتری
ارمغانم سلکِ گوہرہاست، یعنی ایں غزل　　کز سراجم نور ہا آمد چہار انگشتری

گشت اے اقبال! مقبولِ امیرِ ملکِ حسن
کردوا[4]، ما را گرہ، آخر زکار، انگشتری

حواشی۔ منشی سراج الدین کشمیر ریزیڈنسی میں میر منشی تھے اور اقبال کے دوست
۱۹۴۰ء میں انتقال ہوا۔ اقبال نے ان سے چار انگوٹھیاں منگائی تھیں۔ ان کی رسید

طور پر یہ نظم لکھ کر بھیجی۔ سراج الدین کی بیاض میں اقبال کا خط اور نظم خود علّامہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں جہاں سے لے کر اقبال نامہ حصّۂ اوّل ص ۱۷-۱۶ میں شامل کیے گئے۔ نظم کے ساتھ کا خط یہ ہے۔

ڈیر سراج

دو تین روز سے طبیعت بسبب دورۂ درد کے علیل ہے۔ یہ چند شعر قلم برداشتہ آپ کے شکریے میں عرض کرتا ہوں۔ میرا ارمغاں یہی ہے۔ اسی کو قبول کر کے مجھے مشکور کیجیے۔ چاہیں تو پیشانی پر چند اُردو سطور لکھ کر مخزن میں بھیج دیجیے۔ والسلام

آپ کا اقبال ۱۹۰۲

از لاہور

یہ خط اور نظم باقیات طبعِ سوم میں شامل ہے جس میں اقبال نامہ کا کوئی ذکر نہیں معلوم نہیں یہ مرتّبِ اقبال نامہ کی دریافت ہے کہ مرتّبِ باقیات کی؟

ےلہ اقبال کی صراحت کے مطابق لہاور لاہور کا دوسرا نام ہے جسے امیر خسرو نے قرآن السعدین میں استعمال کیا ہے۔

غزل

(منسوخ)

عاشقِ دیدارِ محشر کا تمنّائی ہوا ؎۱ | وہ سمجھتے ہیں کہ جرمِ ناشکیبائی ہوا
غیر سے غافل ہوا میں اے نمودِ حسنِ یار! | عرصۂ محشر میں پیدا کنجِ تنہائی ہوا
میری بینائی ہی شاید مانعِ دیدار تھی | بند جب آنکھیں ہوئیں تیرا تماشائی ہوا
ہائے میری بدنصیبی، وائے ناکامی مری | پاؤں جب ٹوٹے تو شوقِ دشت پیمائی ہوا
میں تو اس عاشق کے ذوقِ جستجو پر مر مٹا ؎۲ | 'ما عرفنا' کہہ کے جو تیرا تمنائی ہوا
تجھ میں کیا اے عشق! وہ اندازِ معشوقانہ تھا! | حسن خود 'لولاک' کہہ کر تیرا شیدائی ہوا ؎۳
دیکھ ناداں! امتیازِ شمع و پروانہ ؎۴ نہ کر | حسن بن کر عشق اپنا آپ سودائی ہوا

اب مری شہرت کی سوجھی ہے انھیں دیکھے کوئی — پستی کے میں جس دم غبارِ کوئے رسوائی ہوا

بغضِ اصحابِ ثلاثہ[1] سے نہیں اقبال کو
دق مگر اک خارجی[2] سے آکے مولائی ہوا

اکتوبر ۱۹۰۲ء

حاشیہ۔ یہ غزل اکتوبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔

[1] اصحابِ ثلاثہ سے مراد پہلے تین خلفا ہیں۔

[2] فرہنگ آصفیہ میں خارجی کے یہ معنی لکھے ہیں
مسلمانوں کا وہ فرقہ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ برحق نہیں مانتا اور ان سے باغی ہو کر لڑا (جلد دوم ص ۱۰۴)
'مولا' حضرت علی کا لقب ہے۔ 'مولائی': حضرت علی سے عقیدت رکھنے والا۔ رزاق میں یہ مقطع حذف ہے۔ کیا بربنائے عقیدہ؟ بیاض میں ص ۱۱۱ الف پر پوری غزل لکھ کر پنسل سے مقطع کو کاٹ دیا ہے۔

غزل

(منسوخ)

کس شعلہ رو کا دل میں میرے گزر ہوا ہے — اس سرزمیں کا یارب! ہر ذرہ طور کیوں ہے؟

کھاتا ہے تجھ کو اے دل! بس کا غمِ جدائی؟ — تو بے قرار کیوں ہے؟ تو ناصبور کیوں ہے؟

ساقی وہ کون سا تھا جس نے یہ مے پلادی — صبحِ ازل کو پی تھی، اب تک سرور کیوں ہے؟

تیرے ہی دم قدم سے چمکا نصیب ورنہ — یہ خاک خاک کیوں ہے؟ وہ کوہ طور کیوں ہے؟

حبل الورید سے بھی نزدیک، یوں ترسنا — او پاس رہنے والے! آنکھوں سے دور کیوں ہے؟

میں مشتِ خاک، مجھ میں گوہر نہاں ہے کیسا؟
حیرت ہے مجھ کو یارب! ظلمت میں نور کیوں ہے؟

حاشیہ۔ اس نامکمل غزل کے یہ چھ اشعار سب سے پہلے روزگار ص ۲۷۴ پر دیے گئے۔

اس کے بعد، غالباً وہیں سے لے کر، باقیات ص ۵۸۹ پر درج کیے گئے ۔ ان کا زمانہ معلوم نہیں ۔ ان کا رنگ دیکھ کر اندازے سے یہاں رکھ دیا گیا ہے ۔

شمع

بزمِ جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع! دردمند   فریاد در گرہ، صفتِ دانۂ سپند
دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں تجھے   اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے

ہو شمعِ بزمِ عیش کہ شمعِ مزار تو
ہر حال اشکِ غم سے رہی ہم کنار تو

ان اشک باریوں میں طہارت کا راز ہے   کیسا وضو ہے یہ کہ سراپا نماز ہے؟
یک بیں تری نظر صفتِ عاشقانِ راز   میری نگاہ مایۂ آشوبِ امتیاز
کعبے میں، بت کدے میں ہے یکساں تری ضیا   میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا
ایذا پسند ہے دلِ اندوہگیں ترا   کیا تجھ پہ رازِ غم کدۂ دہر کھل گیا

ہے شان آہ کی ترے دودِ سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں
از مہر تا بہ ذرہ دلِ و دل ہے آئنہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

جلتی ہے تو کہ برقِ تجلی سے دور ہے   بے درد، تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے
سمجھے کہ خامشی ہے مآلِ ضیائے شمع   اے وائے گفتگوئے لبِ بے صدائے شمع
خورشیدِ شب ہے جلوۂ ظلمت رُبا ترا   تجھ کو بھی ہے خبر کہ یہ ہے چاندنا ترا
تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں   بینا ہے اور سوزِ دروں پر نظر نہیں
میں جوشِ اضطراب سے سیماب وار بھی   آگاہِ اضطرابِ دلِ بے قرار بھی

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا

یہ آگہی مری، مجھے رکھتی ہے بے قرار خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتش کدے ہزار
جلتی اسی شرار سے ہے شمعِ ماسوا م ساماں طرازِ ظلمتِ شب ہے یہ چاندنا
یہ امتیازِ رفعت و پستی اسی سے ہے گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے

بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی
اصلِ کشاکشِ من و تو ہے یہ آگہی
آزاد دستبردِ بقا و فنا ہوں میں
کشتہ ہو یہ شرار تو، کیا جانئے کیا ہوں میں م

صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق آوازِ کُن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق
یہ حکم تھا کہ گلشنِ کُن کی بہار دیکھ ایک آنکھ لے کے، خوابِ پریشاں ہزار دیکھ
مجھ سے خبر نہ پوچھ حباب وجود کی شامِ فراق، صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں غربت کے غم کدے کو وطن جانتا ہوں میں
جوں نَے کمندِ نالۂ دل میں اسیر ہوں م فرقتِ نیستاں کی، سراپا نفیر ہوں

یادِ وطن فسردگیِ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی، کبھی ذوقِ طلب بنی

اے شمع! انتہائے فریبِ خیال دیکھ مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ
مضموں فراق کا ہوں، ثریا نشاں ہوں میں آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں ہوں میں
باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود
گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے بندش اگرچہ سست ہے مضموں بلند ہے
چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے
یہ سلسلہ زمان و مکاں کا، کمند ہے طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
محمود اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے م کیا غفلت آفریں یہ مئے خانہ ساز ہے
دنیا کہ وہمِ غیر میں، ہوں میں پھنسا ہوا م آذر، خلیل ہے بتِ پندار کا ہوا

صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب نہ ہو رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں
دل خار زارِ کم نگہی میں اُلجھ نہ جائے
ڈرتا ہوں کوئی میری فغاں کو سمجھ نہ جائے م

دسمبر ۱۹۰۲ء

حواشی۔ یہ نظم مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اقبال کے دوست[1] نیرنگ کی نظم شمعِ مزار خدنگِ نظر لکھنو بابت جنوری ۱۹۰۳ء میں چھپی

ع۱ یہ شعر غالب کا ہے
ع۲ چاندنا بمعنی روشنی عورتوں کا روزمرہ ہے، کتابی زبان میں نہیں ملتا۔

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا ایسا سکوت، جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گزاروں دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
پتوں کا ہو نظارہ میری کتاب خوانی م دفتر ہو معرفت کا جو گل کھلا ہوا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا، سبزے کا ہو بچھونا شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو

---

[1] عبداللہ قریشی: معاصرینِ اقبال کی نظر میں ص ۵۸

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دُلھن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

یوں وادیوں میں آکر ٹھہرے شفق کی سرخی م
جیسے کسی گلی میں کوئی شکستہ پا ہو

پچھم کو جا رہا ہو کچھ اس ادا سے سورج م
جیسے کوئی کسی کے دامن کو کھینچتا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید اُن کی، میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو، کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہم نوا ہوں، وہ میرا ہم نوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

ظلمت جھلک رہی ہو اس طرح چاندنے میں م
جوں آنکھ میں سحر کی سرمہ لگا ہوا ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

دل کھول کر بہا دوں اپنے وطن پہ آنسو م
سرسبز جن کی نم سے بوٹا اُمید کا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

سمجھیں مرے سخن کو ہندوستان والے م
موزوں ہو گئے ہیں نالے سخن نہیں ہے

شمشاد گل کا بیری، گل یاسمن کا دشمن م
ہو آشیاں کے قابل، یہ وہ چمن نہیں ہے

اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر م
میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے

وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت م
ساقی نہیں وہ باقی وہ انجمن نہیں ہے

در محفلے کہ یاراں شرب مدام کردند
نوبت بہ ما[13] چو آمد آتش بجام کردند

حاشیہ۔ نظم مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ بانگ میں چھاپتے وقت دوسرا بند شاید اس لیے حذف کیا گیا کہ اس میں مختلف ملتوں کی ہم آہنگی پر زور دیا گیا ہے جو اقبال کے بعد کے موقف کے منافی تھا۔ کلیم الدین احمد[1] کے مطابق یہ سیمول راجرس کی نظم 'A WISH' سے متاثر ہے۔ انگریزی متن ضمیمے میں ملاحظہ ہو۔

[13] یاد کیجیے فارسی کا یہ شعر
برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفترے ست معرفتِ کردگار

غزل

گلزارِ ہست و بود نہ دیوانہ وار دیکھ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار[14] دیکھ دم دے نہ جائے ہستیِ ناپائدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار[15] دیکھ
کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگزر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

حواشی۔ یہ غزل بانگ درا اور قلمی کلام میں ہے چونکہ بانگِ درا میں اس سے اگلی غزل تکرار کیا تھی، مخزن جون ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ بالا 'دیکھ' ردیف کی غزل اس سے پہلے کی ہوگی لیکن اس کی پختگی اس عقیدے کے منافی ہے۔ یہ واضح ہو کہ بانگِ درا میں ہر جگہ کلام تاریخی ترتیب سے درج نہیں

---

[1] اردو شاعری پر ایک نظر حصہ دوم میں ۱۹۹، ۱۰۰ بحوالہ ڈاکٹر سید حامد حسین مجلہ سیفیہ یادگارِ اقبال نمبر ص ۳۰۔ راجرس کی نظم کے متن کے لیے ڈاکٹر حامد حسین کا ممنون ہوں۔

کیا گیا۔ ہوسکتا ہے اقبال نے اس غزل کا نقشِ اول جون ۱۹۰۱ء میں یا اس سے پہلے تیار کیا ہو۔ بعد میں اسے ترقی دے کر موجودہ شکل دے دی۔ نقشِ اوّل موجود نہیں ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ چار شعر انتخاب ہیں۔ پوری غزل میں زیادہ اشعار رہے ہوں گے۔

یہ اشعار سب سے پہلے کہاں شائع ہوئے، معلوم نہیں۔ کسی رسالے میں چھپے ضرور ہوں گے جہاں سے قلمی کلام کے مرتّب نے نقل کیے۔

ح۱ جوش ملسیانی نے "اقبال کی خامیاں" میں اعتراض کیا ہے کہ اس مصرع کی ردیف معنوی حیثیت سے بے کار ہے (ص ۳۵)

ح۲ جوش ملسیانی نے اعتراض کیا ہے "کسی کا انتظار ہوا کرتا ہے نہ کہ میرا انتظار" (ص ۸) ان کی مراد یہ ہے کہ 'میرے انتظار کرنے کی کیفیت' کے معنی میں محض 'مرا انتظار' ناکافی ہے۔

گلِ پژمردہ

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ! تجھ کو گل کہوں ۔۔۔ کس طرح تجھ کو تمنائے دلِ بلبل کہوں
ہم سفر، آخر تری بو کی تری رنگت ہوئی ۔۔۔ ہائے کیا تاراج تیرے حسن کی دولت ہوئی
بلبلِ نالاں نہ پہچانے، اگر دیکھے تجھے ۔۔۔ ہو پشیماں عشق پڑا اپنے جو پہچانے تجھے
تھی کبھی موجِ صبا، گہوارۂ جنباں ترا ۔۔۔ نام تھا صحنِ گلستاں میں گلِ خند[illegible]

تیرے احساں کا، نسیمِ صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطّار تھا

سرگراں سی اب شعاعِ مہرِ تاباں تجھ سے ہے ۔۔۔ آہ وہ بادِ سحر بھی اب [illegible]
دیدۂ گلچیں کو اب تیری ادا بھاتی نہیں ۔۔۔ لال جوڑا اب شفق بھی [illegible]

شاخ تیری بارِ بلبل سے نہ اب خم کھائے گی م آب گوہر سے نہ اب شبنم تجھے نہلائے گی

آہ وہ تتلی، وہ اک معصومیت اُڑتی ہوئی م تھک کے اب 'پرواز سے تجھ پر نہ بیٹھے گی کبھی

وہ ذرا سا جانور، دل دادۂ آوارگی م کھینچتی تھی سوئے گلشن جس کو شیرینی تری

گرچہ تھا صحنِ چمن میں عاشقِ شیدا ترا م اب تجھے دیکھے تو بھاگے الحذر کہتا ہوا

میری آنکھوں کو مگر اے گل بھلا لگتا ہے تو م آتی ہے مجھ کو تری پژمردگی سے اپنی بُو

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا ہے نہاں تیری اداسی میں دلِ ویراں مرا

ہے مرے سینے میں بھی پوشیدہ زخم بے رفو م داغ بن کر رہ اسی اجڑے ہوئے گلشن میں تو

لب مرا ہے بلبلِ رنگیں نوا تیرے لیے م میری ٹھنڈی آہ ہے بادِ صبا تیرے لیے

میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو خواب' میری زندگی تھی، جس کی ہے تعبیر تو

ہم[1] چو نے از نیستانِ خود حکایت می کنم

بشنو اے گل! از جدائی ہا شکایت می کنم

حاشیہ۱ - اس نظم کا صحیح زمانہ معلوم نہیں۔ بانگ میں اس کے مقام کی بنا پر اسے یہاں جگہ دی ہے۔ کے۔ اے وحید کی انگریزی کتابیاتِ اقبال (ص ٦) کے مطابق یہ نظم ایک مجموعہ 'تصویرِ مناظر' لاہور میں ص ۲۷ پر شامل ہے۔

[1] یہ شعر مثنوی مولانا روم کے اس مشہور ترین شعر سے ماخوذ ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند از جدائی ہا [illegible]

سید کی لوحِ تربت

اے کہ [illegible] بن کے میری قبر پر آیا

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس [illegible]

اس چمن کے نغمہ [illegible]

جنوری ۱۹۰۳ء

ـ کی نظر سے گزر چکی ہے۔

ـ ں ہیت میں ہے۔ شاید اسی وجہ

یہ وہ نظارہ ہے، یاں ہر گل سراپا دیدہ ہے م اپنے گلشن کی زمیں میں باغباں خوابیدہ ہے

سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں   ترکِ دنیا، قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا، فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں   چھپ کے ہے بیٹھا ہوا، ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے   دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
دیکھ اپنوں میں نہ پیدا ہو کہیں بیگانگی م چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی
دین کے پردے میں تو دنیا کا سودائی نہ ہو م آڑ میں مذہب کی شوقِ عزت افزائی نہ ہو
گالیاں دینا کسی کو، دین کی خدمت نہیں م یہ تعصب کوئی مفتاحِ درِ جنت نہیں

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں، ان فسانوں کو نہ چھیڑ
راہ بر کو قافلے کے ساتھ رہنا چاہیے
کیا چلے گا کارواں جب رہنما پیچھے رہے م

ہو شرابِ حبِّ قومی میں اگر سرشار تو م ہو نہ اپنی عزت افزائی کی تجھ کو آرزو
قافلہ جب تک پہنچ جائے نہ منزل کے قریں م رہنما ہوتے ہیں جو رستے میں دم لیتے نہیں
کیا مزا رکھتی ہے ابنائے وطن کی فکر بھی م اس میں کچھ ہوتی نہیں اپنے کفن کی فکر بھی
دیکھ آوازِ ملامت سے نہ گھبرانا ذرا م عشق کے شعلے کو بھڑکاتی ہے یہ بن کر ہوا
وہ شجر ہے عشقِ اخواں، زندگی ہے جس کا پھل م قوم کے عاشق کو چھو سکتا نہیں دستِ اجل
عالمِ عقبیٰ میں ہے سب سے بڑی عزت یہی م عشقِ اخواں میں اگر مطعون ہو جائے کہیں
عشق ہر صورت میں تسکینِ دلِ ناشاد ہے م پڑ کہیں نالہ، کہیں شیون، کہیں فریاد ہے
خود بخود منہ سے نکل جاتی ہے، ایسی نے ہے یہ م شیشۂ دل سے اچھل جاتی ہے، ایسی مے ہے یہ

چوں زمینائے محبت خوردہ بودم بادہ
تا ثریا رفت ایں قوم بخاک افتادہ م

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا	ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے	نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
اپنے حق کے مانگنے میں رکھ ادب مدِ نظر م	چاہیے سائل کو آدابِ طلب مدِ نظر
معنیٔ رمزِ اطاعت کی نہ ہو جس کو خبر م	چاہیے دنیا کو اس ناداں کی صحبت سے حذر

آب چوں در روغن افتد، نالہ خیزد از چراغ
صحبتِ ناجنس باشد باعثِ آزارہا م

بندۂ مومن کا دل بیمِ ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم	شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو	ہو نہ جائے، دیکھنا! تیری صدا بے آبرو
چاہیے ہو باعثِ آرامِ جاں، شاعر کی لَے م	لاج اس جزوِ نبوت کی ترے ہاتھوں میں ہے
دیکھ اے جادو بیاں! تو نے اگر پروا نہ کی م	آبرو گر جائے گی اس گوہرِ یک دانہ کی

از شرابِ حبِ ہم جنسانِ خود مستانہ باش
شعلۂ شمعِ وطن را صورتِ پروانہ باش م

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

جنوری ۱۹۰۲ء

حاشیہ۱ - یہ نظم مخزن جنوری ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی جو راقم الحروف کی نظر سے گزر چکی ہے۔
۲ - یہ فارسی شعر غیر مقفّٰی ہے حالاں کہ پوری نظم مثنوی کی بیت میں ہے۔ شاید اسی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔

غزل

(منسوخ)

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم
بن کر خیالِ غیر ترے دل میں آئیں ہم

اچھی کہی، شکایتِ جور و جفا کی بھی
اتنی سی بات کے لیے محشر میں جائیں ہم

اے صدمۂ فراق! نہ کر ہم سے چھیڑ چھاڑ
تو کس کا ناز ہے کہ تجھے بھی اٹھائیں ہم؟

پوچھیں گے آج سرمۂ دنبالہ دار سے
کس طرح سے کسی کی نظر میں سمائیں ہم؟

ہر چیز منع تو ہے، بس اے طبیبِ عشق!
لیکن بڑھے جو ضعف، تو غش بھی نہ کھائیں ہم؟

دشمن شبِ فراق میں ہے اپنا آپ ہی
آ جائے موت اپنی تو گنگا نہائیں ہم

ڈرتے تھے جس کے واسطے، وہ بات اب کہاں؟
تو ایک اب کہے تو تجھے سو سنائیں ہم

اقبال! شعر کے لیے فرصت ضرور ہے
اس فکرِ امتحاں میں غزل کیا سنائیں ہم

جنوری ۱۹۰۳ء

اس غزل کے پہلے پانچ شعر مخزن جنوری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئے اور راقم الحروف کی نظر سے گزرے۔ عابدہ سلطانہ سوز اپنے مضمون[1] میں سہواً انھیں مخزن جنوری ۱۹۰۲ء میں دکھاتی ہیں۔ باقیات طبع سوم ص ۳۹۷ میں بھی مخزن ۱۹۰۳ء لکھا ہے۔

غزل

کیا کہوں، اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا؟
اور اسیرِ حلقۂ دام ہوا کیونکر ہوا؟

جائے حیرت ہے، برا سارے زمانے کا ہوں میں
مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا؟

کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر
کیا خبر ہے تجھ کو اے دل! فیصلہ کیونکر ہوا؟

ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی، اک مدعا
مرغِ دل، دامِ تمنّا سے رہا کیونکر ہوا؟

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا، صبر آزما کیونکر ہوا؟

حسنِ کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں، خود نما کیونکر ہوا؟

موت کی ظلمت میں ہے پنہاں شرابِ زندگی
مر گیا ہوں یوں تو میں، لیکن فنا کیونکر ہوا؟

موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے دردِ فراق!
چارہ گر دیوانہ ہے، میں لادوا کیونکر ہوا؟

---

[1] عابدہ سلطانہ سوز: اقبال اور مخزن۔ رسالہ برگِ گل کراچی۔ اقبال نمبر ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۸۸

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت! کہ گل ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا؟
پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیونکر ہوا؟
میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی کیا بتاؤں، ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا؟

یوں تو مرتے ہو ہنسی ٹھٹھے پہ اے اقبال! تم
۲ دل تمھارا اس قدر درد آشنا کیونکر ہوا؟

فروری ۱۹۰۳ء

حاشیہ- یہ غزل خدنگِ نظر فروری ۱۹۰۳ء نیز مخزن فروری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔
باقیاتِ اقبال طبعِ سوم ص ۲۹۹ پر اس کے دو منسوخ اشعار قطعہ کے عنوان سے دیے ہیں اور ان کا ماخذ مخزن فروری ۱۹۰۲ء دیا ہے۔

عله جوش ملسیانی نے اپنی کتاب "اقبال کی خامیاں" ص ۹۴ پر اعتراض کیا ہے کہ دکھانے دیکھنے، کے بجائے 'دیکھنے' 'دکھانے' چاہیے۔

عله جوش ملسیانی "اقبال کی خامیاں" ص ۸ پر اس شعر کے مصرعِ ثانی پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مرض لا دوا ہوتا ہے مگر یہاں مریض لا دوا ہو گیا ہے - امیر مینائی فرماتے ہیں۔
اے مسیحا! میرے دشمن ہوں شفا سے ناامید تو سلامت، درد میرا لا دوا کیونکر ہوا"
اقبال نے امیر مینائی کے مضمون پر ترقی دی ہے۔

ابرِ گہر بار

یا

فریادِ اُمت

(منسوخ)

(بہ شمولِ متداول نظم 'دل')

دل میں جو کچھ ہے، نہ لب پر اسے لاؤں کیونکر؟ ہو چھپانے کی نہ جو بات، چھپاؤں کیونکر؟
شوقِ نظارہ یہ کہتا ہے، قیامت آئے پھر میں نالوں سے قیامت نہ اٹھاؤں کیونکر؟

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ
پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیونکر!
صدمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ!
یہ بھی اک ناز ہے تیرا نہ اٹھاؤں کیونکر!
زندگی تجھ سے ہے اے نارِ محبت میری
اشکِ غم سے ترے شعلوں کو بجھاؤں کیونکر!
تجھ میں سو نغمے ہیں اے تارِ ربابِ ہستی
زخمۂ عشق[ہ۲] سے تجھ کو نہ بجاؤں کیونکر!
ضبط کی تاب، نہ یارائے خموشی مجھ کو
ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیونکر!

بات ہے راز کی پر منہ سے نکل جائے گی
یہ مئے کہنۂ خُم دل سے اچھل جائے گی

آسماں مجھ کو بجھا دے جو فروزاں ہوں میں
صورت شمع سرِ گورِ غریباں ہوں میں
ہوں وہ بیمار جو ہو فکرِ مداوا مجھ کو
درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں
دیکھنا، تو مری صورت پہ نہ جانا، گل چیں
دیکھے کو صفتِ نو گل خنداں ہوں میں
موت سمجھا ہوں مگر زندگیِ فانی کو
نام آجائے جو اس کا تو گریزاں ہوں میں
دور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جیتا ہوں
یہ بھی جینا ہے کوئی جس سے پشیماں ہوں میں
کنجِ عزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر
یہ وہی چیز ہے جس چیز[ہ۲] پہ نازاں ہوں میں
داغِ دل مہر کی صورت ہے نمایاں لیکن
ہے اسے شوق ابھی اور نمایاں ہوں میں
ضبط کی، جا کے سنا، اور کسی کو ناصح!
اشک بڑھ چڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہوں میں
ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں
رند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رند مجھے
سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں
زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلماں ہوں میں
کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں
ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے، نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں
دیکھ اے چشمِ عدو! مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

مزرعِ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
درد قربان ہوں جس دل پہ، وہ ہے دل میرا

قصۂ دار و رسن، بازیِ طفلانۂ دل — متداول — التجائے اَرِنی، سرخیِ افسانۂ دل
یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی — " — جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل
ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب — " — جل گئی مزرعِ ہستی تو اگا دانۂ دل
حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا — " — تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
عرش کا ہے، کبھی کعبے کا ہے دھوکا اس پر — " — کس کی منزل ہے الٰہی! مرا کاشانۂ دل
کچھ اسی کو ہے مزہ دہر میں آزادی کا — منسوخ — جو ہوا قیدیِ زنجیرِ پری خانۂ دل
اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا — متداول — دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل
تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اس کو — " — رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل
ہائے، کیا جانیے، اس گھر کا مکیں کیسا ہو! — منسوخ — ہوں جو منصور سے، دربانِ درِ خانۂ دل
خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے — متداول — وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رِہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے — متداول

آتی ہے اپنی سمجھ اور یہ مائل ہو کر — آنکھ کھل جاتی ہے انسان کی بے دل ہو کر
لوگ سودا کو یہ کہتے ہیں، برا ہوتا ہے — عقل آئی مجھے، پابندِ سلاسل ہو کر
آرزو کا کبھی رونا، کبھی اپنا ماتم — اس سے پوچھے کوئی، کیا دل نے لیا دل ہو کر
میری ہستی ہی تو تھی میری نظر کا پردہ — اٹھ گیا بزم سے میں، پردۂ محفل ہو کر
عینِ ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا — حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر
خلق معقول ہے، محسوس ہے خالق اے دل — دیکھ ناداں! ذرا آپ سے غافل ہو کر
طور پر تو نے جو، اے حضرتِ موسیٰ! دیکھا — وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہو کر
کیا کہوں بے خودیِ شوق میں لذت کیا ہے — تو نے دیکھا نہیں زاہد! کبھی غافل ہو کر
راہِ الفت میں رواں ہوں، کبھی افتادہ ہوں — موج ہو کر، کبھی خاکِ لبِ ساحل ہو کر
دمِ خنجر میں دمِ ذبح سما جاتا ہوں — جوہرِ آئنۂ خنجرِ قاتل ہو کر
وہ مسافر ہوں، چلے جب نہ پتا منزل کا — خود بھی مٹ جاؤں نشانِ رہِ منزل ہو کر

ہے فروغِ دوجہاں داغِ محبت کی ضیا — چاند یوہ ہے کہ گھٹتا نہیں کامل ہو کر
دیدۂ شوق کو دیدار نہ ہو، کیا معنی — آئے محفل میں جو دیدار کے قابل ہو کر
عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی! توبہ — دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہو کر
مئے عرفاں سے مرا کاسۂ دل بھر جائے — میں بھی نکلا ہوں تری راہ میں سائل ہو کر

المددؐ، سیدِ مکی، مدنی العربی!
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

لاکھ ساماں ہے، اک بے سروساماں ہونا — مجھ کو جمعیتِ خاطر ہے، پریشاں ہونا
تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں — آدمیؐ کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا
دل جو بربادِ محبت ہوا، آباد ہوا — سازِ تعمیر تھا اس قصرؐ کو، ویراں ہونا
علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجھ کو — لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا
کبھی یثربؐ میں اویسِ قرنی سے چھپنا — کبھی برقِ نگہِ موسیِ عمراں ہونا
قابِ قوسین بھی، دعویٰ بھی عبودیت کا — کبھی چلمن کوؐ اٹھانا، کبھی پنہاں ہونا
لطف دیتا ہے مجھے، مٹ کے تری الفت میں — ہمہ تن شوقِ ہوائے عربستاں ہونا
یہی اسلام ہے میرا، یہی ایماں میرا — تیرے نظارۂ رخسار سے حیراں ہونا

خندۂ صبحِ تمنائے براہیم استی
چہرہ پرداز بہ حسرت کدۂ میم استی

حشر میں ابرِ شفاعت کا گہربار آیا — دیکھ اے جنسِ عمل! تیرا خریدار آیا
پیرہنؐ عشق کا جب حسنِ ازل نے پہنا — بن کے، یثرب میں، وہ آپ اپنا خریدار آیا
میں گیا حشر میں جس دم تو صدا یوں آئی — دیکھنا، دیکھنا، وہ کافرِ دیں دار آیا
لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے — ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا
جوشِ سودائے محبت میں گریباں اپنا — میں نے دیکھا، تو نہ ہاتھوں میں کوئی تار آیا
عشق کی راہ میں اک سیر تھی ہر منزل پر — نجد کا دشت، کہیں، مصر کا بازار آیا

میں نے سو گلشنِ جنّت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

لیں شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا
عرقِ شرم میں ڈوبا جو گنہ گار آیا

وہ مری شرمِ گنہ اور وہ سفارش تیری
ہائے اس پیار پہ کیا کیا نہ مجھے پیار آیا

ہے ترے عشق کا مے خانہ عجب مے خانہ
یعنی ہشیار گیا، اور میں سرشار آیا

ما عرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری
قابِ قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

لے چلا بحرِ محبت کا تلاطم مجھ کو
کشتیِ نوح ہے، ہر موجۂ قلزم مجھ کو

حسن تیرا ﷺ مری آنکھوں میں سمایا جب سے
تیر لگتی ہے شعاعِ مہ و انجم مجھ کو

تیرے قربان، میں اے ساقیِ مے خانۂ عشق
میں نے اک جام لیا، تو نے دیے خم مجھ کو

خاک ہو کر، یہ ملا اوج تری الفت میں
"کہ فرشتوں نے لیا بہرِ تیمم مجھ کو"

گرد آسا، سرِ دامن سے لگا پھرتا ہوں میں
حشر کے روز بھلا دو نہ کہیں تم مجھ کو

کوئی دیکھے تو ترے عاشقِ شیدا کا مزاج
حور سے کہتا ہے، چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو

موت آ جائے، جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اٹھوں جو مسیحا بھی کہے قم مجھ کو

صفتِ نوکِ سرِ خار، شبِ فرقت میں
چبھ رہی ہے نگہِ دیدۂ انجم مجھ کو

خوف رہتا ہے یہ ہر دم کہ رہِ یثرب[13] سے
طور کی سمت نہ لے جائے توہّم مجھ کو

تو نے آنکھوں کے اشارے سے تھپکیں کر دی
شورِ محشر ہوا غلبانگِ ترنم مجھ کو

اپنا مطلب مجھے کہنا ہے مگر تیرے ﷺ حضور
چھوٹ جائے نہ کہیں تابِ تکلم مجھ کو

ہے ابھی اُمتِ مرحوم کا رونا باقی
دیکھ اے بے خودیِ شوق! نہ کر گم مجھ کو

ہمہ حسرت ہوں، سراپا غمِ بربادی ہوں
ستمِ دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

اے کہ تھا نوح کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیم کو آتش میں بھروسا تیرا

اے کہ مشعل تھا ترا ظلمتِ عالم میں وجود
اور نورِ نگہِ عرش تھا سایا تیرا

اے کہ پرتو ہے ترے ہاتھ کا، مہتاب کا نور — چاند بھی چاند بنا، پا کے اشارا تیرا
گرچہ پوشیدہ حسن ترا پردوں میں — ہے عیاں معنیِ لولاک سے پایا تیرا
ناز تھا حضرتِ موسیٰ کو یدِ بیضا پر — سو تجلی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا
چشمِ ہستی صفتِ دیدۂ اعمیٰ ہوتی — دیدۂ کُن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا
مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر — غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

کیا کہوں اُمتِ مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

حال اُمت کا برا ہو کہ بھلا، کہتے ہیں — صفتِ آئنہ، جو کچھ ہے، صفا کہتے ہیں
واعظوں میں یہ تکبر کہ الٰہی توبہ — اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں
ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا — ہاں مگر وعظ میں دنیا کو برا کہتے ہیں
غیر بھی ہو تو اسے چاہیے اچھا کہنا — پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو برا کہتے ہیں
فرقہ بندی کی ہوا تیرے گلستاں میں چلی — یہ وہ ناداں ہیں، اسے بادِ صبا کہتے ہیں
شاہدِ قوم ہوا، خنجرِ بیکار سے خوں — ہائے غفلت، یہ اسے رنگِ حنا کہتے ہیں
آہ جس بات سے ہو فتنۂ محشر پیدا — یہ وہ بندے ہیں، اسے فتنہ رُبا کہتے ہیں
ہو نہ اے قافلہ سالار! یہ امت تیری — کارواں ہند میں ہے کوئی لٹا، کہتے ہیں
جن کی دیں داری میں ہو آرزوئے زر پنہاں — آ کے دھوکے میں، انھیں راہ نما کہتے ہیں
لاکھ اقوام کو دنیا میں اُجاڑا اس نے — یہ تعصب کو مگر گھر کا دیا کہتے ہیں
خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں — مرض الموت ہے جو اس کو دوا کہتے ہیں
یہ نصاریٰ کا خدا اور وہ علی شیعوں کا — ہائے کس ڈھنگ سے اچھوں کو برا کہتے ہیں
مقصد لحمک لحمی یہ کھلی ان کی زباں — یہ تو اک راہ سے تجھ کو بھی برا کہتے ہیں
تیرے یاروں کا جو یہ حال ہوا اے شافعِ حشر! — میرے جیسوں کو تو، کیا جانیے کیا کہتے ہیں
بغضِ للہ کے پردے میں عداوت ذاتی — دین کی آڑ میں، کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں
جن کا یہ دیں ہو کہ اپنوں سے کریں ترکِ سلام — ایسے بندوں کو، یہ بندے "صَلَحا" کہتے ہیں

قوم کے عشق میں ہو نکر کفن بھی نہ جسے — یہ اسے بندۂ بے دام ہوا کہتے ہیں
یہ دوا، صفحۂ ہستی سے نہ مٹ جانا ہو — درد[16] کے حد سے گزرنے کو دوا کہتے ہیں

وصل ہو لیلیٰ مقصود سے کیونکر اپنا
اخترِ سوختۂ قیس ہے اختر اپنا

امرا جو ہیں، وہ سنتے نہیں اپنا کہنا — سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا
ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا — ورنہ آتا تھا ہمیں حرفِ[20] تمنا کہنا
دردمندوں کا کہیں حال چھپا رہتا ہے — اپنی خاموشی بھی تھی ایک طرح کا کہنا
شکوہ منت کشِ لب ہے، کبھی منت کشِ چشم — میرا 'کہنا' جو ہے 'رونا'، تو ہے 'رونا' کہنا
قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے — یہ اگر راہ پہ آجائیں تو پھر کیا کہنا
بادۂ عیش میں سرمست رہا کرتے ہیں — یادِ فرماں[21] نہ ترا اور نہ خدا کا کہنا
ہم نے سو بار کہا 'قوم کی حالت ہے بری' — پر سمجھتے نہیں یہ لوگ ہمارا کہنا
جو مرے دل میں ہے، کہہ دوں تو کوئی کہہ دے گا — منہ پہ ہوتا نہیں ان لوگوں کو 'اچھا' کہنا
ہم کہیں کچھ، تو کہیں[22] جائیں، انھیں کیا پروا — 'کوئی' کہہ دے تو اثر کرتا ہے کیا کیا 'کہنا'
ان کی محفل میں ہے کچھ بار انھیں لوگوں کو — جن کو آتا ہو سرِ بزم لطیفہ کہنا

دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو تو برہم ہو کر
فقر تھا فخر ترا، شاہِ دو عالم ہو کر

اس مصیبت میں ہے اک تو ہی سہارا اپنا — تنگ آکر لبِ فریاد ہوا وا اپنا
ایسی[23] حالت میں بھی امید نہ ٹوٹی اپنی — نام لیوا[24] ہیں ترے، تجھ پہ ہے دعویٰ اپنا
فرقہ بندی سے کیا راہ نماؤں نے خراب — ہائے ان مالیوں نے باغ اُجاڑا اپنا
ہم تو مٹ جائیں گے معمورۂ ہستی سے مگر — صبر ان راہ نماؤں پہ پڑے گا، اپنا
تیری سرکار میں اپنوں کا گلہ کیا کیجے — ہو ہی جاتا ہے مصیبت میں، پرایا اپنا
دیکھا[25] نوح کی کشتی کے بچانے والے — آیا گردابِ حوادث میں سفینا اپنا
ہم نے سو[26] راہ اخوت کی نکالی لیکن — نہ تو اپنا ہوا اپنا، نہ پرایا اپنا

اس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ سنے ۔۔۔ اور ہم کس سے کہیں، جا کے، فسانا اپنا؟
ہاں برس، ابرِ کرم! دیر نہیں ہے اچھی ۔۔۔ کہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہونا اپنا
لطف یہ ہے کہ پھلے قوم کی کھیتی اس سے ۔۔۔ ورنہ ہونے کو تو آنسو بھی ہے دریا اپنا
اب جو ہے ابرِ مصیبت کا دھواں دھار آیا ۔۔۔ ڈھونڈتا پھرتا ہے تجھ کو دلِ شیدا اپنا
یوں تو پوشیدہ نہ تھی تجھ سے ہماری حالت ۔۔۔ ہم نے گھبرا کے مگر تذکرہ چھیڑا اپنا
زندگی تجھ سے ہے اے فخرِ براہیم! اپنی ۔۔۔ کر دعا حق سے کہ مشکل ہوا جینا اپنا
ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی ۔۔۔ ہے انھیں لوگوں کی ہمت یہ بھروسا اپنا

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنا تجھ سے

قوم کو جس سے شفا ہو، وہ دوا کون سی ہے؟ ۔۔۔ یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے؟
جس کی تاثیر سے ہو عزتِ دین و دنیا ۔۔۔ ہائے اے شافعِ محشر! وہ دوا کون سی ہے؟
جس کی تاثیر سے یک جان ہو امت ساری ۔۔۔ ہاں بتا دے ہمیں، وہ طرزِ وفا کون سی ہے؟
جس کے ہر قطرے میں تاثیر ہو یک رنگی کی ۔۔۔ ہاں بتا دے وہ مئے ہوش رُبا کون سی ہے؟
قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا ۔۔۔ ناقہ وہ کیا ہے؟ وہ آوازِ درا کون سی ہے؟
اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی ۔۔۔ جس سے دل قوم کا پگھلے وہ صدا کون سی ہے؟
سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں، مگر ۔۔۔ اپنی امید یہاں تیرے سوا کون سی ہے؟
اپنی کھیتی ہے اجڑ جانے کو، اے ابرِ کرم! ۔۔۔ تجھ کو جو کھینچ کے لائے وہ ہوا کون سی ہے؟
ہے نہاں جن کی گدائی میں امیری سب کی ۔۔۔ آج دنیا میں وہ بزمِ فقرا کون سی ہے؟
تیرے قرباں کہ دکھائی ہے یہ محفل تو نے ۔۔۔ میں نے پوچھا جو "اخوت کی بنا کون سی ہے؟"

راہ اس محفلِ رنگیں کی دکھا دے سب کو
اور اس بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو

یکم مارچ ۱۹۰۳ء

حواشی - یہ نظم انجمنِ حمایتِ اسلام کے اٹھارویں اجلاس میں یکم مارچ ۱۹۰۳ء کو سہ پہر کے

جلسے میں پڑھی۔ جلسے کی صدارت خان بہادر غلام احمد خاں مشیرِ مال ریاست جموں و کشمیر نے کی۔ اس وقت نظم کا عنوان تھا:

"ابرِ گہربار یعنی نعتِ عاشقانۂ جنابِ سرورِ کائنات و فریادِ امّت بر آستانۂ آں ذاتِ بابرکات"

یہ نظم سب سے پہلے ہفت روزہ 'وطن' لاہور میں شائع ہوئی ۶ مارچ، ۲۰ مارچ اور ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء۔ یہ تینوں شمارے راقم الحروف کے مطالعے میں رہ چکے ہیں۔ وطن لاہور ۱۹۰۲ء میں مولوی انشا اللہ خاں نے جاری کیا۔ ۱۹۰۷ء میں یہ روزنامہ ہوا۔ زمیندار کا ریلا آیا تو وطن کچھ عرصہ بعد پھر ہفت روزہ بن گیا۔ ۱۹۳۰ء میں انشا اللہ خاں انتقال کر گئے اور ۱۹۳۵ء میں وطن بند ہو گیا۔ اخبار 'وطن' کی یہ تفصیل نقوش کے[۸] لاہور نمبر بابت فروری ۱۹۶۲ء سے لی گئی ہے۔

بہت ممکن ہے یہ نظم انجمن حمایتِ اسلام کی روداد میں بھی چھپی ہو۔ ۱۹۱۳ء میں لاہور سے دو ناشر دل[۹] شیخ مبارک علی اور مرغوب بخشی (؟) نے الگ الگ فریادِ امت کے نام سے شائع کی۔

بعض مرتبین کو اس نظم کی تاریخ کے بارے میں تسامح ہوا ہے۔ نوادرِ اقبال میں ص ۴۸ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ یہ نظم ۱۹۰۰ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔ رختِ سفر طبعِ اوّل[۱۰] میں اس کی تاریخ مارچ ۱۹۰۴ء دی تھی۔ طبعِ ثانی ۱۹۷۷ء میں ص ۵۶ پر "غالباً ۱۹۰۴ء" لکھی ہے۔

---

[۸] عبدالسلام خورشید، اردو صحافت۔ نقوش، لاہور نمبر، شمارہ ۹۲۔ فروری ۱۹۶۲ء ص ۸۴۹

[۹] رفیع الدین ہاشمی: کتابیاتِ اقبال ص ۱۴

[۱۰] رختِ سفر طبع اوّل ۱۹۵۲ء بحوالہ عبدالقوی دسنوی: اقبال انیسویں صدی میں ص ۴۴

عبداللہ قریشی[1] نے اپنے ایک مضمون میں ۱۹۰۱ء لکھا ہے۔ عبدالقوی دسنوی نے اپنی کتاب 'اقبال[2] انیسویں صدی میں' میں کئی حضرات کے بیانات درج کرنے کے بعد اس نظم کی تاریخ ۱۹۰۰ء مانی ہے جو صحیح نہیں۔ وطن میں اس کی اشاعت کے پیشِ نظر اس کی صحیح تاریخ یکم مارچ ۱۹۰۳ء ہی ہے جو سرودِ رفتہ اور باقیاتِ طبعِ سوم میں بھی دی ہے۔

گو یہ نظم منسوخ ہے لیکن اس کا تیسرا بند 'دل' کے عنوان سے بانگِ درا میں لیا گیا۔ اس بند کے بھی دو اشعار منسوخ ٹھہرے اور بانگ میں نہیں لیے گئے۔

عـ۱ اقبال نامہ ص ۱۰۱ پر ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تجویز کیا تھا کہ اس مصرع میں 'جو تھی' کی جگہ 'تو تھی' ہونا چاہیے۔ اقبال نے ان کے نام خط میں لکھا ہے کہ انھوں نے 'تو' ہی لکھا تھا۔ 'وطن' میں سہوِ کتابت سے 'جو' چھپ گیا۔

عـ۲ یہ فارسی شعر قدسی کی مشہور نعت کا ہے۔ قدسی نے 'مرحبا' لکھا تھا جسے اقبال نے 'الحذر' میں بدل دیا۔

عـ۳ یہ مصرع غالب کے ذیل کے مطلع کا ہے۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

عـ۴ اویسِ قرنی عاشقِ رسول تھے۔ یمن کے رہنے والے تھے۔ اپنی ضعیف والدہ کی خدمت و نگہداشت کی وجہ سے رسول کو نہ دیکھ سکے۔ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جو جنگ ہوئی اس میں ۳۷ھ میں شہید ہوئے۔

عـ۵ دوسرا مصرع داغ کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

دیکھ لے وادیِ ایمن مجھے وہ خاک ہوں میں — کہ فرشتوں نے لیا بہرِ تیمم مجھ کو[3]

عـ۶ حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اس مصرع میں 'جیبھ' کے لفظ پر اعتراض کیا تھا[4]۔ اقبال نے ۲۵ مئی ۱۹۰۳ء کے خط میں ان سے اتفاق کیا۔

عـ۷ غالب کا مصرع ہے ع درد کا حد سے گزرنا ہے دور ہو جانا

سـ۱ قریشی: اقبال اور انجمن کشمیری مسلماناں، مشمولہ ادبی دنیا لاہور، اقبال نمبر، دورِ ششم ص ۱۹۶ بحوالہ عبدالقوی دسنوی: اقبال انیسویں صدی میں ص ۴۴

سـ۲ ص ۴۴ اور ص ۵۹

سـ۳ بہ حوالہ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی: تلمیحات و اشاراتِ اقبال ص ۳۱۹

سـ۴ بہ حوالہ جگن ناتھ آزاد: اقبال کی اپنے کلام پر نظرِ ثانی۔ نقوشِ اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۲۳۶

پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ ۔۔۔ وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
وہ ساتھ سب کے اڑنا وہ سیر آسماں کی ۔۔۔ م ۔۔۔ وہ باغ کی بہاریں، وہ سب کا مل کے گانا
پتوں کا ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی میں ۔۔۔ م ۔۔۔ ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی ۔۔۔ اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر، آتا ہے یاد جس دم ۔۔۔ شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت ۔۔۔ آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا
تڑپا رہی ہے مجھ کو رہ رہ کے یاد اس کی ۔۔۔ م ۔۔۔ تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آب و دانہ

اس قید کا الٰہی ! دکھڑا کسے سناؤں،
ڈر ہے یہی قفس میں، میں غم سے مر نہ جاؤں ۔۔۔ م
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی، اے کاش میرے بس میں

کیا بدنصیب ہوں میں، گھر کو ترس رہا ہوں ۔۔۔ ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار، کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں ۔۔۔ میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں ۔۔۔ م ۔۔۔ میں دل جلا اکیلا دکھ میں کراہتا ہوں

(آتی نہیں صدائیں ان کی مرے قفس میں ۔۔۔ م
ہوتی مری رہائی، اے کاش! میرے بس میں)
اس قید کا الٰہی! دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں، میں غم سے مر نہ جاؤں

ارمان ہے یہ جی میں اڑ کر چمن کو جاؤں ۔۔۔ م ۔۔۔ ٹہنی پہ گل کی بیٹھوں، آزاد ہو کے گاؤں
بیری کی شاخ پر ہو ویسا ہی پھر بسیرا ۔۔۔ م ۔۔۔ اس اجڑے گھونسلے کو پھر جا کے میں بساؤں

چگتا پھروں چمن میں دانے ذرا ذرا سے ‌ م ‌ ساتھی جو ہیں پرانے، ان سے ملوں ملاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی
اڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہوگیا ہے ‌ دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے ‌ دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد جس نے رہ کر دن اپنے ہوں گذارے ‌ م ‌ اس کو بھلا خبر کیا، یہ قید کیا بلا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زبان ہوں قیدی، تو چھوڑ کر دعا لے

مارچ ۱۹۰۳ء

حواشی ۔ اقبال نامہ حصہ اول میں اقبال کے خط بنام منشی سراج الدین مورخہ ۱۱/مارچ ۱۹۰۳ء میں لکھا ہے کہ خط میں نظم 'بلبل کی فریاد' مکمل شامل ہے افسوس کہ اقبال نامے میں خط کے ساتھ نظم نہیں دی۔ اس خط میں اقبال نے 'بلبل کی فریاد' کے بارے میں لکھا ہے ۔

مندرجہ بالا نظم کی بندش ملاحظہ فرمایئے۔ چونکہ بچوں کے لیے ہے، اس واسطے اضافت اور اور دقتِ مضمون سے خالی ہے۔ علاوہ ازیں فریاد کرنے والا آخر پرندہ ہے"۔

(بحوالۂ معاصرین اقبال کی نظر میں ۔ ص ۴۰۴)

یہ بیان نظم پرندے کی فریاد پر بالکل چسپاں ہوتا ہے۔ اس نظم میں کہیں بھی فارسی اضافت نہیں۔ پرندے کی فریاد مخزن فروری ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔ قیاس غالب یہ ہے کہ یہی نظم ۱۹۰۳ء کی بلبل کی فریاد ہے۔ اقبال نے اس زمانے میں بچوں کے لیے نظمیں لکھیں جن سے کئی نظمیں انگریزی سے، بالخصوص کوپر سے لیں۔

ڈاکٹر سید حامد حسین لکھتے ہیں کہ یہ اٹھارویں صدی کے انگریزی شاعر ولیم کوپر کی نظم
ON A GOLD PINCH STARVED TO DEATH IN HIS CAGE سے
ماخوذ ہے۔ اس کا انگریزی متن ضمیمے میں ملاحظہ ہو۔ حامد حسین نے اپنے ذیل کے مضمون میں اس ۸ اسطری

نظم کا اردو ترجمہ بھی دیا ہے۔

علامہ اقبال کی بعض منسوخ نظمیں مشمولہ مجلۂ سیفیہ' یادگارِ اقبال، جلد ہفتم ۱۹۸۰ - ۱۹۷۹ سیفیہ کالج بھوپال ص ۷۰ تا ۷۲،

لہ اس مصرع میں 'دکھے' کو تشدید کے ساتھ 'دکّھے' پڑھا جائے تبھی یہ مصرع موزوں ہوگا۔ چنانچہ بانگِ درا اشاعت دوم میں ص ۲۸۲ پر اس لفظ پر تشدید بنائی ہوئی ہے۔ صحیح تلفظ غیر مشدد ہے۔

غزل

(منسوخ)

لڑکپن کے ہیں دن، صورت کسی کی بھولی بھولی ہے
زباں میٹھی ہے، لب ہنستے ہیں، پیاری پیاری بولی ہے

ترا، اے سیل دریائے محبت! منہ تکوں کب تک؟
مری کشتی جو تھی، آپ اپنے ہاتھوں سے ڈبو لی ہے

کوئی شوخی تو دیکھے، جب ذرا رونا تھما میرا
کہا بے درد نے 'کیوں آپ نے مالا پرو لی ہے'؟

جفا جو کہہ دیا میں نے، مگر تم نے برا مانا
خفا کیوں ہو گئے؟ یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے

شبِ فرقت تصور تھا، مرا اعجاز تھا، کیا تھا
تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

وہ میری جستجو میں پھر رہے ہیں، خیر ہو یارب!
پتا میرا بتانے کو، قیامت ساتھ ہو لی ہے

سنا ہے آج جنت میں بڑی رونق کا جلسہ ہے
ترے کشتے کا ہے نیلام اور حوروں کی بولی ہے

تماشائی کوئی آئینۂ ہستی میں ہے اپنا
مزا ہے حسن نے اے دل! کتابِ عشق کھولی ہے

سمجھ سکتا نہ تھا کوئی مجھے اس بزمِ ہستی میں
گرہ تھی زندگی میری، اجل نے آکے کھولی ہے

جگت ایشر ہے تو، ہر آتما کو پیت ہے تیری
صنم خانے کی یارب! کیسی پیاری پیاری بولی ہے

ہمیں یادِ وطن! کیا پیش آتا ہے، خدا جانے
بھلا تو، کس لیے غربت زدوں کے ساتھ ہو لی ہے!

تغیر روز کا، کچھ دید کے قابل نہ تھا، نرگس!
بتا پھر کس کے نظارے کو تو نے آنکھ کھولی ہے

تبسم چاکِ جیبِ گل، ترنم، نالۂ بلبل
یہ بے مہروں کی باتیں ہیں، یہ بے دردوں کی بولی ہے

مہ و خورشید و انجم دوڑتے ہیں ساتھ ساتھ اس کے
فلک کیا ہے کسی معشوقِ بے پروا کی ڈولی ہے

یہ ہوگی شوخ، اے صیاد! مدت کی اسیری سے
نیا قیدی ہوں میں، آواز میری بھولی بھولی ہے

لہو کی بوندیاں، لالے کی کلیاں بن کے پھوٹی ہیں ۔۔۔ مگر زیرِ زمیں کھیلی، ترے کشتوں نے ہولی ہے
دیارِ عشق میں واماندگی رفتار ہے، اے دل! ۔۔۔ جسے کہتے ہیں خاموشی، وہ اِس بستی کی بولی ہے
گماں تجھ پر ہوا تھا کیا دلِ بلبل کی چوری کا؟ ۔۔۔ صبا نے غنچۂ گل! کیوں گرہ تیری ٹٹولی ہے!

گلِ مضموں سے اے اقبال! یہ سہرا ہے ناصر کا
غزل تیری، غزل کیا ہے، کسی گلچیں کی جھولی ہے

اپریل ۱۹۰۳ء

حواشی:۔ یہ غزل مخزن اپریل ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی اور راقم الحروف کی نظر سے گزر چکی ہے۔ مشفق خواجہ نے اقبال از احمد دین ص ۲۶۲ پر اس کا ماخذ مخزن مئی ۱۹۰۳ء لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے پٹنے سے اور عبدالصمد خاں نے کلکتے سے تصدیق کی کہ یہ اپریل ۱۹۰۳ء کے شمارے میں ہے۔ مخزن میں ایک نوٹ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیالکوٹ کے رئیس آغا محمد باقر خاں قزلباش آنریری مجسٹریٹ کے بیٹے محمد ناصر خاں کے ختنے کا غسلِ صحت تھا۔ اس موقع پر اقبال بھی موجود تھے۔ کسی نے ایک مصرعِ طرح دیا جس پر یہ غزل ہوئی۔

[1] امیر مینائی کا مصرع ہے ع "یہ آزادوں کی باتیں ہیں، یہ ان کی بولی ٹھولی ہے"۔ صنم خانۂ عشق ص ۲۱۹۔ لاہور ۱۳۴۰ھ

[2] یہ مصرع امیر مینائی کے مصرع سے ماخوذ ہے ع غزل کیا ہے، یہ پھولوں سے بھری گلچیں کی جھولی ہے (ایضاً)

غزل

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ۔۔۔ ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت ۔۔۔ اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر ۔۔۔ ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حُسن ۔۔۔ دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

عذرآفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

چھپتی نہیں ہے یہ نگہِ شوق، ہم نشیں!
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا، طور پر کلیم
م
مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

سو سو امید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر
م
مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

دے کر جھلک سی، آپ تو پردے میں ہو رہے
م
اور کہہ گئے نگاہ کو، ڈھونڈا کرے کوئی

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

بولے بھی سن کے قصۂ ہجراں، تو یہ کہا
م
کی دل لگی تو یہ بھی گوارا کرے کوئی

ہم جانتے ہیں، میم کے پردے میں کون ہے
م
ہاں بھیدیوں سے منہ نہ چھپایا کرے کوئی

صبحِ ازل یہ دردِ محبت نے دی صدا
م
مجھ کو بھی ساتھ حسن کے پیدا کرے کوئی

محفل ہو، شغلِ مے ہو، شبِ ماہتاب ہو
م
اور میں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی

کھل جائیں، کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

اقبال! عشق نے مرے سب بل دیے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی
م

لِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
م
اس مختصر سی عمر میں اب کیا کرے کوئی

اپریل ۱۹۰۳ء

حواشی :۔ یہ غزل مخزن اپریل ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۱ ۔ ۲۰ پر اقبال
یک خط مورخہ ۱۱/ مارچ ۱۹۰۳ء منشی سراج الدین کے نام ہے۔ اس میں لکھتے ہیں' ابرِ گہربار
وع کرنے سے پیشتر میں نے اس خیال سے کہ کوئی وہابی اس کے بعض اشعار پر کوئی فتویٰ نہ دے
باتیں تمہید میں بھی کہی تھیں اور ایک غزل بھی کہی تھی۔
رکی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
خط میں پوری غزل تھی لیکن اقبال نامے میں صرف مطلع شائع ہوا ہے۔ گویا یہ غزل ابرِ گہربار
طالب کی صفائی میں کہی گئی تھی۔ ابرِ گہربار یکم مارچ ۱۹۰۳ء کو پڑھی گئی جس کے معنی ہیں کہ یہ غزل

فروری ۱۹۰۳ء میں کہہ لی گئی ہوگی۔ شائع ہوئی مخزن اپریل ۱۹۰۳ء میں۔
عـــه ۱۹۰۳ء میں حسرت موہانی نے تنقیدِ ہمدرد کے نام سے اقبال کی زبان پر کچھ اعتراض کیے۔ اقبال نے مخزن اکتوبر ۱۹۰۳ء میں ان کا جواب دیا۔ ہمدرد کا ایک اعتراض اس مصرع کے محاورے 'سیدھا کرے' پر تھا۔ اقبال نے اپنی تائید میں بہت سی اسناد دے کر ثابت کیا کہ اہلِ زبان اساتذہ نے یہ محاورہ باندھا ہے (بحوالہ اقبال" اردو زبان پنجاب میں" مشمولہ اقبال کے نثری افکار" مرتبہ عبدالغفار شکیل ص ۴۷)

عـــه جوش ملسیانی اپنی کتاب" اقبال کی خامیاں" میں سرقہ کے عنوان کے تحت یہ شعر دے کر لکھتے ہیں
" یہ شعر علامہ موصوف کے نوادرِ افکار میں شامل ہے مگر بانگِ درا میں شائع نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ مرزا سودا کا یہ شعر پڑھ کر سمجھ میں آجائے گی ؎

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگان
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے

(ص ۵۵۔۵۶)

یہ شعر بانگ درا ہی میں نہیں مخزن اپریل ۱۹۰۳ء میں بھی نہیں۔ پھر جوش صاحب کو کہاں سے ملا؟ یہ شعر سودا کے شعر سے ایسا صریح سرقہ ہے کہ یقین نہیں آتا کہ اقبال نے ۱۹۰۳ء میں ایسا کیا ہوگا۔ اس کا استناد کمزور ہونے کی وجہ سے میں نے اسے غزل سے الگ دیا ہے۔

غزل

(منسوخ)

حیرت نظر کو، دل کو تپش، لب کو خامشی
انعام بٹ رہے ہیں تری جلوہ گاہ میں

کیا آپ کو بھی یاد ہے، اے حضرتِ کلیم!
ٹیلہ سا ایک ہے جو محبت کی راہ میں

ہنستا ہوں قصۂ اَرِنی گوئے طور پر
کیا جانے، کیا سمایا ہے میری نگاہ میں

غم سے میں ان کے عشق میں گو خاک ہو گیا
پر شاد ہوں کہ مل تو گیا گردِ راہ میں

تعمیر بت کیے ہوئے کعبے کی راہ میں

اقبال کی نہ پوچھ، تلوّن مزاجیاں
مے خانے میں کبھی ہے کبھی خانقاہ میں

حواشی :- ساڑھے پانچ اشعار کی یہ غزل بیاضِ اعجاز سے لے کر روزگار میں ۲۰۳، ۲۰۲ پر چھاپی گئی۔ معلوم ہوتا ہے تعمیر بت کیے ہوئے کعبے کی راہ میں، کسی مشاعرے کا مصرعِ طرح تھا جسے اقبال نے گرہ لگانے کے لیے لکھ لیا لیکن ابھی گرہ نہیں لگائی۔ یہاں سے لے کر یہ غزل باقیات ص ۵۰۹ پر دی ہے۔ وہاں صرف پانچ مکمل اشعار لیے ہیں۔ پانچویں شعر کا مصرعِ ثانی شامل نہیں کیا گیا۔
غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ اس کے رنگ کو دیکھ کر اندازے سے یہاں رکھ دی گئی ہے۔

غزل

(منسوخ)

کھلا راز ان پر مری بے بسی کا ۔۔۔ الٰہی بھرم کھل نہ جائے کسی کا
سوا اِس کے اب قوم کو کام کیا ہے ۔۔۔ امیروں کا شکوہ، گلہ بے زری کا
خدا جانے کیا ہو گیا ہندیوں کو ۔۔۔ کہ اس دیس میں راج ہے دشمنی کا

حواشی :- یہ غزل روزگار ص ۳۰۷ - ۳۰۶ پر نیز باقیات ص ۳۹۸ پر ملتی ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں۔ چونکہ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال وطن کے لیے نہیں لکھتے تھے اس لیے تیسرے شعر میں ہندیوں کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ سفرِ یورپ سے قبل کی ہے۔

غزل

(منسوخ)

حشر کو مانتا ہوں بن دیکھے ۔۔۔ ہائے ہنگامہ اس کی محفل کا
سدِّ رہ گرچہ تھی صعوبتِ راہ ۔۔۔ لے اڑا اشتیاق منزل کا
تھی غضب طرزِ پرسشِ ہمدرد ۔۔۔ لب پہ آیا ہے مدّعا دل کا

حاشیہ :- یہ غزل روزگار ص ۳۰۷ - ۳۰۶ اور باقیات ص ۴۴۹ پر ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں۔ اس کے رنگ کو دیکھتے ہوئے اندازاً یہاں رکھ دی گئی ہے۔

غزل

(منسوخ)

پہلے مل جاتا تھا ریاضت سے — اب کسی کو خدا نہیں ملتا
جستجو اپنی جستجو ہی نہ تھی — ورنہ ڈھونڈیں تو کیا نہیں ملتا
ہم نے اقبال کو بہت ڈھونڈا — کوئی اس نام کا نہیں ملتا

حاشیہ - یہ غزل روزگار ص ٣٠٨ اور باقیات ص ٥٨٢ پر ہے - اس کا زمانہ معلوم نہیں -

---

دوغزلہ

اہلِ درد

(منسوخ)

زندگی دنیا کی، مرگِ ناگہان اہلِ درد — موت، پیغامِ حیاتِ جاودانِ اہلِ درد
بند ہوکر، اور کھلتی ہے زبانِ اہلِ درد — بولتا ہے مثلِ نَے، ہر استخوانِ اہلِ درد
آپ بائع، آپ ہی نقد و متاع و مشتری — ساری دنیا سے نرالی ہے دکانِ اہلِ درد
اس خموشی اور گویائی کے صدقے جائیے — محوِ شکرِ بے زبانی ہے زبانِ اہلِ درد
یہ وہ پستی ہے کہ اس پستی میں ہے رفعت نہاں — سر کے بل گرتا ہے گویا نردبانِ اہلِ درد
بیخودی میں یہ پہنچ جاتے ہیں اپنے آپ تک — عین بیداری نہ ہو خوابِ گرانِ اہلِ درد
کہہ رہی ہے ہر کلی گلزارِ ابراہیم کی — آگ سے ہوتا ہے پیدا گلستانِ اہلِ درد
پالیا موسیٰ نے آخر بندۂ اللہ کو — درد والوں ہی کو ملتا ہے نشانِ اہلِ درد
ان کی دنیا بھی یہی، عرشِ معلیٰ بھی یہی — دل مکانِ اہلِ درد و لامکانِ اہلِ درد
ہائے کیا محشر بپا واعظ نے اٹھا رکھی ہے یاں! — ہے اسی دنیا میں ہوتا امتحانِ اہلِ درد
درد ہی کے دم سے ہے ان دل جلوں کی زندگی — درد سے پیدا ہوئی روحِ روانِ اہلِ درد
لیتے ہیں داغِ محبت سے گلِ جنت مراد — ہائے کیا مرغوب ہے طرزِ بیانِ اہلِ درد

یہ اجڑ جانے کو آبادی سمجھتے ہیں مگر
ڈھونڈتا ہے راہزن کو کاروانِ اہلِ

ارتجالاً ہم نے اے اقبال! کہہ ڈالے یہ شعر
تھی نوازش کو جو فکرِ امتحانِ اہلِ درد

صبرِ ایوبؑ و فاخوؑ جزوِ جانِ اہلِ درد
گریۂ آدمؑ سرشتِ دودمانِ اہلِ د

ہے سکوں ناآشنا، طبعِ جہانِ اہلِ درد
جوں قمر، سائر ہے قطبِ آسمانِ اہلِ

اوجِ یک مشتِ غبارِ آستانِ اہلِ درد
جوہرِ رفعت، بلاگردانِ شانِ اہلِ

پھر رہے ہیں گلشنِ ہستی کے نظاروں میں مست
نکہتِ گل ہے شرابِ ارغوانِ اہلِ

ابتدا میں شرحِ رمزِ آیۂ لا تقرَبا[۱]
کس قدر مشکل تھا یہ پہلا امتحانِ اہلِ د

ہم نشیں رونا ہمارا کچھ نیا رونا نہیں
تھی ہم آہنگ ندائے کُن، فغانِ اہلِ د

شورشِ محشر جسے واعظ نے ہے سمجھا ہوا
ہے وہ گلبانگِ درائے کاروانِ اہلِ د

بت کدے کی سمت کیوں جاتا ہے یارب برہمن
کعبۂ دل ہی تو ہے ہندوستانِ اہلِ در

گرمیِ جوشِ عقیدت سے کیا کرتی ہے طوف
کعبۂ برقِ بلا ہے آشیانِ اہلِ در

ذبح ہونا کوچۂ الفت میں، ہے ان کی نماز
ہے صدا تکبیر کی گویا اذانِ اہلِ در

دار پر چڑھنا نہ تھا، معراج تھا منصور کو
تھی وہ سولی درحقیقت نردبانِ اہلِ در

موجِ خونِ سرمدؒ و تبریزیؒ و منصور سے
کس قدر رنگیں ہے یارب! داستانِ اہلِ در

تو نے اے انسانِ غافل! آہ کچھ پروا نہ کی
بے بیان طائر سمجھتے تھے زبانِ اہلِ در

دیدۂ سوزن سے بھی رکھتے تھے یہ پنہاں اسے
کوئی کیا دیکھے گا زخمِ بے نشانِ اہلِ درد

دیکھنے والے سمجھتے تھے دمِ عیسیٰ جسے
تھی وہ اک موجِ نسیمِ بوستانِ اہلِ درد

پھرتے رہتے ہیں میانِ کوچۂ حبل الورید
ہے اسی آوارگی میں عزّ و شانِ اہلِ درد

کہہ دیا اقبال! اک مصرع نوازش نے جو آج
وہ بہانہ ہو گیا بہرِ بیانِ اہلِ درد

مئی ۱۹۰۳ء

حواشی ۔ یہ دو غزلہ مخزن مئی ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔ ساتھ میں اس کی شانِ نزول درج تھی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

ایک شخص متخلص بہ نوازش کے گھر پر اقبال، گرامی اور بسمل تشریف رکھتے تھے۔ اقبال نے کہا کہ انھیں دردِ قولنج کی شکایت ہوا کرتی ہے اور اس وقت اس کے آغاز کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ اس پر صاحبِ خانہ نے ایک مصرع پڑھا جس کی ردیف اہلِ درد تھی اور اس پر غزل کہنے کی فرمائش کی۔ اقبال نے خفیف درد کے باوجود یہ دو غزلیں کہیں۔ مولوی عبداللہ بسمل نے تمہید کے طور پر ایک فارسی قطعہ لکھ کر اشاعت کی غرض سے بھیجا۔

عجیب بات ہے۔ اگر مہمان کو درد کا شبہ ہو رہا تھا تو انھیں کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس لے جانا چاہیے تھا یا کم از کم آرام ہی کراتے نہ کہ غزلیں کہنے کو مجبور کرتے۔

ع۱ ابنِ عباس سے روایت ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا جنت کی نعمتوں سے محروم ہونے پر دو سو سال تک روتے رہے (مصائب التنزیل از نجوی۔ ص ۲۳ بمبئی ۱۲۹۵ھ بحوالہ اکبر حسین قریشی: تلمیحات و ارشاداتِ اقبال ص ۲۹۴)

ع۲ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ۔ آدم اور حوا دونوں کو حکم تھا کہ اس درخت کے نزدیک نہ جانا (سرودِ رفتہ ص ۵۹)

ع۳ تبریزی سے مراد شمس تبریز جو مولانا روم کے مرشد تھے۔

غزل

(منسوخ)

۱ تو نہاں مجھ سے، مرے داغِ جگر کی صورت
میں نہاں تجھ سے، ترے موئے کمر کی صورت

۲ ہو شگفتہ ترے دم سے چمنِ دہر تمام
سیر اس باغ کی کر بادِ سحر کی صورت

۳ نام روشن تو رہے، عمر ہو گر برق خرام
زندگی چاہیے دنیا میں شرر کی صورت

۴ یہ تو بتلا دے مؤذن! کہ تری آنکھوں سے
کیا مروت بھی گئی خوابِ سحر کی صورت

۵ جوش زن بحرِ محبت تھا مگر دل اپنا
صاف نکلا نگہہ دیدۂ تر کی صورت

۶ خیر کیا بات ہے پتھر ہے اگر دل تیرا
ہم بھی اس سنگ میں رہتے ہیں شرر کی صورت

۷ کوچۂ عشق کے یہ راہ نما بنتے ہیں
اللہ اللہ! کوئی دیکھے تو خضر کی صورت

۸ وصل کی رات تو آخر ہوئی اے دامنِ صبر!
چاک ہو تو بھی گریبانِ سحر کی صورت

۹ گر پڑا شیشۂ دل سنگِ درِ جاناں پر
یہ بھی ٹوٹے گا یہیں کاسۂ سر کی صورت

۱۰ خواب اب دل میں نہیں اے رہِ الفت باقی
ختم ہو تو بھی کہیں زادِ سفر کی صورت

۱۱ کیوں نہ آنکھوں پہ بٹھاؤں تجھے اے روزنِ در
تو دکھاتا ہے کسی رشکِ قمر کی صورت

۱۲ میں تو دیوانہ ہوا، خیر، کوئی بات نہ تھی
آپ کیوں پھر گئے لیکن مرے سر کی صورت

۱۳ عشقِ یعقوب کا تو محرمِ اسرار تو ہو
پیرہن دے گا دکھا، تجھ کو پسر کی صورت

۱۴ دہر میں ذوقِ سکوں تجھ کو ہے پیغامِ فنا
تازہ رکھ جوشِ سفر، شمس و قمر کی صورت

۱۵ ضربِ شمشیرِ حوادث سے نہ کھو قوتِ ضبط
سخت خوددار ہو دنیا میں سپر کی صورت

۱۶ ہے گل و لالہ کی صورت تو انھیں شے لیکن
ان میں یہ سوز نہیں قلب و جگر کی صورت

۱۷ لطف جب آتا ہے اقبال سخن گوئی کا
شعر نکلے صدفِ دل سے گہر کی صورت

مئی ۱۹۰۳ء

حاشیہ۔ یہ غزل یا اس کا کوئی جزو مخزن مئی ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا

برگِ گل (ایک دردمند دل کی عرض)

(منسوخ)

برمزارِ مقدس حضرت خواجہ نظام الدین اولیا دہلوی

کیوں نہ ہوں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے
طور در آغوش ہیں ذرّے تری درگاہ کے

میں تری درگاہ کی جانب جو نکلا لے اُڑا
آسماں تارے بنا کر میری گردِ راہ کے

ہے زیارت کی تمنّا، المدد اے سوزِ عشق!
پھول لادے مجھ کو گلزارِ خلیل اللہ کے

شانِ محبوبی ہوئی ہے پردہ دارِ شانِ عشق
ہائے کیا رتبے ہیں اس سرکارِ عالی جاہ کے

تر جو تیرے آستانے کی تمنّا میں ہوئی
اشک موتی بن گئے، چشمِ تماشا خواہ کے

رنگ اس درگہ کے ہر ذرّے میں ہے توحید کا
طائرانِ بام بھی طائر ہیں بسم اللہ کے

چھپ کے ہے بیٹھا ہوا اثباتِ نفیِ غیر میں
'لا' کے دریا میں نہاں، موتی ہیں الّا اللہ کے

سنگِ اسود تھا مگر سنگِ فسانِ تیغِ عشق
زخم میرے کیا ہیں، دروازے ہیں بیت اللہ کے

کس قدر سرسبز ہے صحرا محبّت کا تری
عشق کی نہریں ہیں اور سائے ہیں نخلِ آہ کے

عشق اس کو بھی تری درگاہ کی رفعت سے ہے
آہ یہ انجم نہیں، آنسو ہیں چشمِ ماہ کے

تیرے ناخن نے جو کھولی میمِ احمد کی گرہ
کھُل گئے عقدے جہاں میں ہر خدا آگاہ کے

میرے جیسے بے نواؤں کا بھلا مذکور کیا
قیصر و فغفور درباں ہیں تری درگاہ کے

محوِ اظہارِ تمنّائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہوں

سہمی پھرتی ہے [illegible] میرے دلِ بیمار سے
اے مسیحا دم! بچا لے مجھ کو اس آزار سے

اے ضیائے چشمِ عرفاں! اے چراغِ راہِ عشق!
تنگ آیا ہوں جفائے چرخِ ناہنجار سے

سینۂ پاکِ علی جن کا امانت دار تھا
اے شہِ ذی جاہ! تو واقف ہے اُن اسرار سے

ہند کا داتا ہے تو، تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہر بار سے

اک نظر میں، خسروِ ملکِ سخن، خسرو ہوا
میں کہیں خالی نہ پھر جاؤں تری سرکار سے

تاک میں بیٹھی ہے بجلی، میرے حاصل کے لیے
بَیر ہے بادِ بہاری کو مرے گلزار سے

آج کل، اصغر جو تھے، اکبر ہیں اور مولا غلام
ہیں مجھے شکوے ہزاروں چرخِ کج رفتار سے

کیا کروں اوروں کا شکوہ اے امیرِ ملکِ فقر!
دشمنی میں بڑھ گئے اہلِ وطن، اغیار سے

کہہ رہے ہیں، مجھ کو پابستۂ قفس میں دیکھ کر
اُڑ نہ جائے یہ کہیں، پر کھول کر منقار سے

گریۂ شبنم پہ گل ہنستے ہیں، کیا بے درد ہیں!
وہ جو تھی بوئے محبت اُڑ گئی گلزار سے

گھات میں صیاد، مائل آشیاں سوزی پہ برق
باغ بھی بگڑا ہوا ہے عندلیبِ زار سے

کہہ[11] دیا تنگ آکے اتنا بھی کہ میں مجبور تھا
خامشی ممکن نہیں خوکردۂ گفتار سے
ہاں قسم دیتا ہوں میں مدفونِ یثرب کی تجھے
کر دعا حق سے کہ میں چھٹ جاؤں اس آزار سے

سخت ہے میری مصیبت، سخت گھبرایا ہوں میں
بن کے فریادی تری سرکار میں آیا ہوں میں

کیمیا سے بھی فزوں ہے[12] تیری خاکِ در مجھے
ہاں عطا کر دے مرے مقصود کا گوہر مجھے
تو ہے محبوبِ الٰہی، کر دعا میرے لیے
یہ مصیبت ہے مثالِ فتنۂ محشر مجھے
آہ[13] اس غم میں اگر تو نے خبر میری نہ لی
غرق کر ڈالے گی آخر کو یہ چشمِ تر مجھے
ہو اگر یوسف مرا، زحمت کشِ چاہِ الم
چین آئے مصرِ آزادی میں پھر کیونکر مجھے
آپ یہ وقفِ تپش، ہم صورتِ سیماب ہے
کیا تسلی دے بھلا، میرا دلِ مضطر مجھے
کیا کہوں میں قصۂ ہمدردیِ اہلِ وطن
تیر کوئی بھیجتا ہے اور کوئی نشتر مجھے
یہ[14] خوشی پھیلی مرے غم سے کہ شادی مرگ میں
زندگانی ہو گئی ہے موت سے بدتر مجھے
اس بڑی سرکار کے قابل مری فریاد ہے
چل، حضوری میں شہِ یثرب کی، تو لے کر مجھے
میرا کیا منہ ہے کہ اس سرکار میں جاؤں مگر
تیرے جیسا مل گیا تقدیر سے رہبر مجھے
واسطہ دوں گا اگر لختِ دلِ زہرا کا میں
غم میں کیونکر چھوڑ دیں گے شافعِ محشر مجھے
رونے[15] والا ہوں شہیدِ کربلا کے غم میں میں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیِ کوثر مجھے!
ہوں مریدِ خاندانِ خفتۂ خاکِ نجف
موجِ دریا[16]، آپ لے جائے گی ساحل پر مجھے
دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہلِ بیت
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِ دامنِ حیدر مجھے
جا ہی پہنچے گی صدا پنجاب سے دہلی تلک
کر دیا ہے گرچہ اس غم نے بہت لاغر مجھے

آہ تیرے سامنے آنے کے ناقابل ہوں میں
منہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں۔

جولائی ۱۹۰۳ء

حواشی۔ جو واقعہ اس نظم کی تخلیق کا باعث بنا اس کی تفصیل اقبال کے بھتیجے اعجاز احمد نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" (کراچی ۱۹۸۵ء) میں ص ۵۲-۵۳ پر دی ہے۔ اقبال کے

بڑے بھائی اور اعجاز احمد کے والد شیخ عطا محمد بلوچستان میں ایم ای ایس (ملٹری انجینئرنگ سروس) میں سب اوورسیر تھے۔ ایک ہندو سب اوورسیر ان سے سینیر تھا۔ نومبر ۱۹۰۲ء میں اس کی سینیرٹی کو نظرانداز کر کے عطا محمد کو ایس ڈی او کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور ستم یہ کیا کہ ان کی پوسٹنگ اسی ڈویزن میں اسی سب اوورسیر کے اوپر کر دی گئی۔ ایک انگریز میجر انجنیئر کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ایک دن عطا محمدؐ کی اس انگریز افسر سے تو تو میں میں ہوگئی۔ انگریز اور ہندو سب اوورسیر نے مل کر عطا محمدؐ کے خلاف اسٹور میں سے مال خورد برد کرنے کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ عطا محمدؐ کی طرف سے کوشش ہوئی کہ مقدمہ کسی دوسرے ضلع کی عدالت میں منتقل کر دیا جائے تاکہ مخالفین اپنا رسوخ استعمال نہ کر سکیں۔

مصنف روزگار فقیر نے لکھا ہے کہ دو غیر مسلم ساتھیوں نے انگریز افسر کے ساتھ مل کر سازش کی ص ۱۴۸ اور ۱۵۰ پر غیر مسلم کے لفظ کو بہت نمایاں کیا ہے۔ اعجاز احمد نے ہندو سب اوورسیر لکھا ہے گویا یہ ایک ہندو نے فرقہ پرستی کے سبب کیا، حالانکہ ظاہر ہے کہ اگر کسی مسلمان کی سینیرٹی کو نظرانداز کر کے اس کے ہم مذہب جونیر کو اس کے سر پر بٹھا دیا جاتا تو اس کا بھی یہی ردِّعمل ہوتا۔ خود اقبال نے اپنی نظم میں صرف "اہلِ وطن" کے خلاف شکوہ کیا ہے، ہندو کا نام نہیں لیا۔ کہتے ہیں ، دشمنی میں بڑھ گئے اہل وطن اغیار سے، یعنی ہندوستانیوں نے بیرونی انگریزوں سے بھی زیادہ عداوت دکھائی۔

روزگار فقیر اور مظلوم اقبال کے مصنفین نے خواہ مخواہ معاملے کو ہندو مسلمان کا رنگ دیا ہے۔

اقبال کے لیے یہ بڑی پریشانی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے بلوچستان جا کر کثیر روپیہ خرچ کیا اور آخر وائسرے ہند لارڈ کرزن کو لکھا کہ مقدمے کے دوران مخالف افسروں کو تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ گواہوں کو متاثر نہ کر سکیں۔ وائسرے نے ان کی فریاد سن لی۔ مولفِ روزگارِ فقیر لکھتے ہیں

"یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ اقبال کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ سرکاری حلقوں میں نہ تو ان کی رسائی تھی اور نہ کوئی اثر و رسوخ تھا۔ ان کی شاعرانہ شہرت پر ابھی شباب کہاں آیا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وائسرے ہند نے انگریزی انصاف کی ساکھ باقی رکھنے کے لیے واقعات کی تحقیق کرائی جائے گی اور اطمینان ہو جانے کے بعد ان افسروں کا ...... تبادلہ کر دیا جس کی وجہ سے وہ مقدمہ بھی بے جان اور کمزور ہو گیا۔" (ص ۱۴۹)

دوسری طرف اقبال نے مذہب کے دامن میں بھی پناہ لی۔ مندرجہ بالا نظم لکھ کر خواجہ

حسن نظامی کو بھیجی اور انھوں نے حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر پڑھی۔ اقبال کے بھا مقدمے سے بَری ہو گئے۔ اقبال نے تفصیلات صدر یار جنگ کے نام ۶ / اگست ۱۹۰۳ء کے خط لکھ کر بھیجیں۔ یہ خط اقبال نامے میں شامل ہے۔

یہ نظم سب سے پہلے ہفتہ وار وطن لاہور بابت ۲۹ جولائی ۱۹۰۳ء میں 'مناجات' کے عنوا سے شائع ہوئی۔ وہاں تمہیدی نوٹ ہے۔

مناجات

از شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج جو حضرت محبوب الٰہی کے مزار مقدس پر خواجہ حسن نظامی نے بآوازِ بلند پڑھی۔

بیجۂ فولاد لاہور، ۷ / اگست ۱۹۰۳ء میں یہ ایک دردمند دل کی عرض' کے عنوان سے چھپی ، اقبال دانائے راز' ص ۲۲۰ پر 'عرض' کی جگہ 'غرض' چھپا ہے وہ صحیح نہیں روزگار ص ۱۹۳ پر صحیح لفظ 'عرض' دیا ہے۔

ع۱ جوش ملسیانی اپنی کتاب 'اقبال کی خامیاں (ص ۵۶) میں معترض ہیں کہ اقبال کا یہ شعر امیر مینائی کے اس مطلع سے ماخوذ ہے جو مراۃ الغیب میں موجود ہے۔

دل مرا کشتہ ہے یارب کس شہادت گاہ کا   ہر شگافِ زخم دروازہ ہے بیت اللہ کا

پورے شعر کی حد تک جوش کا اعتراض درست نہیں ہاں مصرعِ ثانی ضرور امیر کے شعر سے ماخوذ ہے

ع۲ وطن' کے نوٹ کے مطابق خواجہ محمد اقبال، حضرت کے ایک مریدِ خاص کا نام تھا جن پر ان کی بڑی نظرِ عنایت تھی۔

ع۳ رزاق ص ۱۱۵ اور باقیات سوم ص ۷ پر لکھا ہے کہ اس نظم کا ایک شعر ـــ ہند کا داتا.... ـ علیحدہ لکھ کر مزار شریف کے دروازے پر لگایا گیا۔ بقول عبد اللطیف اعظمی خطوطِ اقبال ص ۷ پر بھی یہی بات لکھی ہے لیکن اعظمی نے خود دیکھا ہے کہ مزار کے سامنے کی دیوار پر ایک نہیں، تین اشعار لکھے ہوئے ہیں ایک تو یہی شعر، دوسرا پہلے بند کی ٹیپ کا شعر، تیسرا نظم التجائے مسافر کا ایک منسوخ شعر بھلا ہو دونوں جہاں ....

(اقبال، دانائے راز ص ۳۵ فٹ نوٹ)

غزل

(منسوخ)

جہاں زندگی ہے، وہاں آرزو ہے
جہاں آرزو ہے، وہاں جستجو ہے

نہ ہو جستجو تو ہے ویرانہ عالم
تری جستجو ہی تری آبرو ہے

نظر جب سے تیری نظر سے ملی ہے
جسے دیکھتا ہوں وہی خوب رو ہے

مٹاتے ہیں الفاظ معنی کی شوکت
مری بے زبانی مری گفتگو ہے

تری آرزو سے ملی وہ قناعت
نہ کوئی ہوس ہے نہ کچھ آرزو ہے

خودی[۱] نے عطا کی مجھے خود شناسی
مرا حسن، دائم مرے روبرو ہے

نمایاں ہے کثرت میں وحدت کا جلوہ
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

وہ کیا شے ہے اقبال سینے میں تیرے
فرشتوں میں ہر دم تری گفتگو ہے

حاشیہ ۔ اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ اس کے رنگ اور پختگی کی بنا پر قیاساً یہاں جگہ دی گئی ہے۔

[۱] خودی کا لفظ اقبال ایک اور پرانی غزل میں لا چکے ہیں

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایمان
جنتی ہوگا فرشتوں میں نمایاں ہوگا

موجودہ غزل کے پہلے مصرع میں یہ لفظ اور کھل کر آیا ہے۔ اب دو امکانات ہیں۔

(۱) اقبال کے ذہن میں قدیم زمانے سے خودی کا لفظ اور خودی کا نیا تصور تھا جو پکتا رہا اور بہت بعد میں اسے انھوں نے مثنوی اسرار خودی میں پیش کیا۔

(۲) اقبال نے بعد میں ان غزلوں میں ترمیم و اضافہ کیا اور خودی والا شعر شامل کر دیا لیکن موجودہ غزل میں یہ شعر معنی کے لحاظ سے اتنا پختہ و ترقی یافتہ نہیں کہ اسے مثنوی اسرار خودی کے عہد سے وابستہ کیا جا سکے۔ دوسرے مصرع نے شعر کی سطح کو کم کر دیا ہے۔

غزل

(منسوخ)

۱ عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا
مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا

۲ دمِ آفرینش ہدایت تھی دل کو
کلیمِ تماشائے ہر طور رہنا

۳ مسرت کی تقسیم ہوتی تھی جس دم
پسند آگیا دل کو مجبور رہنا

۴ سکھائی ہے کس نے تمھیں بے حجابی
حسینوں کا شیوہ ہے مستور رہنا

۵ عجب شیوۂ عاشقی ہے جہاں میں
نہ مغرور رکھنا، نہ مغرور رہنا

۶ تمھیں کیا بتائیں محبت ہے کیا شے؟
یہ ہے دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا

۷ دکھاوے کی بے اعتنائی کے صدقے
بڑے کام آیا، مرا دور رہنا

۸ نبھائیں گے کیا ایک سے وہ محبت!
جنھیں ہر نظر میں ہو منظور رہنا

۹ نہیں عشق بازی یہ، زاہد! تو کیا ہے؟
اسیرِ خمِ گیسوئے حور رہنا

۱۰ کوئی چال اس خاکساری میں ہوگی
تمھاری تو عادت تھی مغرور رہنا

۱۱ نہ میں تم کو دیکھوں نہ اغیار دیکھیں
مری آنکھ میں صورتِ نور رہنا

۱۲ نہ ہو جن کی آنکھوں میں تابِ نظارہ
بھلا ان غریبوں سے کیا دور رہنا

۱۳ وہ ہو ناز اقبال پر کر رہے ہیں
زمانے میں ہے ان کو مشہور رہنا

اگست ۱۹۰۳ء

حواشی۔ نوادر میں اس غزل کا ماخذ عروسِ چمن لاہور مرتبہ محمد دین فوق بابت ۱۹۰۱ء

دیا ہے، لیکن نوادر میں دوسرے مجموعوں کی نسبت اشعار کم ہیں۔ رسالہ برگِ گل[1] کراچی اقبال نمبر کے مطابق یہ غزل مخزن اگست ۱۹۰۳ء میں موجود ہے باقیاتِ سوم میں اس کا ماخذ بہارِ گلشن جلد دوم نیز مخزن اگست ۱۹۰۳ء ہے۔ بہارِ گلشن کے نام سے فوق نے گلدستے مرتب کیے تھے جس کی کم سے کم دو جلدیں ہیں۔ عبداللہ[2] قریشی کے ایک بیان کے مطابق ۱۹۰۳ء میں اقبال اور ان کے دوست غلام بھیک نیرنگ دونوں نے غزلیں کہیں نیرنگ کی غزل ع یہ شایاں ہے عاشق کا دستور رہنا' پنجۂ فولاد لاہور بابت ۴؍اکتوبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس سے یقین ہو جاتا ہے کہ اقبال کی غزل ۱۹۰۳ء ہی کی تخلیق ہے۔ نوادر میں اسے عروسِ چمن ۱۹۰۱ء سے جو ماخوذ کیا ہے وہ سہوِ کتابت ہو سکتا ہے۔

غزل

(منسوخ)

پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے
نادرِ کاکوروی[1] نے دور سے دیکھا مجھے

اے حبابِ بحر! بالے پروردۂ دامانِ[1] موج
کچھ پتہ ملتا ہے تجھ سے اپنی ہستی کا مجھے

کیا کروں اے دل! چمن آرائے عالم کا گلہ
ضبط کی طاقت نہ دی، بخشا لبِ گویا مجھے

دل میں جو آتا ہے کہہ دوں گا نہیں مجبور ہوں
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، کچھ نہیں پروا مجھے

کھل گئی چشمِ تماشا اپنی جس دم اے کلیم!
طور ہر ذرے کے دامن میں نظر آیا مجھے

قہر کر دینا نہ اے صیاد! مجھ کو چھوڑ کر
ہو گیا ہے قید سے کچھ پیار سا پیدا مجھے

کس قدر تاریک تھی یا رب! مری صبحِ نمود
آہ اس ظلمت نے مجھ سے بھی چھپا رکھا مجھے

حالِ دل کس سے کہوں اے لذتِ افسانۂ راز
ایک بھی اس دیس میں محرم نہیں ملتا مجھے

رہتے ہیں بے درد میری چشمِ تر پر خندہ زن
اے دلِ درد آشنا! تو نے کیا رسوا مجھے

---

[1] عابدہ سلطانہ سوز: اقبال اور مخزن رسالہ برگِ گل، اقبال نمبر ۱۹۷۷ء، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی ص ۳۸۸

[2] عبداللہ قریشی: معاصرینِ اقبال کی نظر میں ص ۶۰ مجلس ترقیِ ادب لاہور نومبر ۷۷ء

یوں بگڑتا میری خود بینی پہ اب زیبا نہیں — اپنی صورت[۲] پر کیا تھا تو نے کیوں بید
تر چلی آتی ہے کچھ برقِ ازل سے اپنی آنکھ — جب سے روتا ہوں کہ آتا بھی نہ تھا رو
یادِ دنیا کی کہاں باقی ہے اے اہلِ عدم؟ — ہاں یونہی سا یاد ہے کچھ اپنا مرجانا
ہے بسیرا اک نئی ڈالی پہ مدّت سے، مگر — یاد آتا ہے پرانا آشیاں اپنا
موت یہ میری نہیں، میری اجل کی موت ہے — کیوں ڈروں اس سے کہ مر کر پھر نہیں مرنا
دل کو ہے اندر ہی اندر جستجو تیری، مگر — کیا قیامت ہے کہ سمجھا تو نے بے پروا
جا تو نکلوں وادیِ ایمن میں میں بھی اے کلیم! — لن ترانی کہہ نہ دے وہ شوخِ بے پروا
ہر کسی کو بزمِ ہستی میں ہے رونا موت کا — اور اس محفل میں رونا زندگانی کا ہے مجھ
رہ گئے شہرِ خموشاں میں تو یہ آئی صدا — او گزرنے والے! ٹھوکر سے مٹا جانا ہے مجھ
لکھ دیا تھا میں نے کیا خط میں کہ آیا یہ جواب — دیکھ سمجھ کر آپ نے یہ خط لکھا ہوتا مجھے
کس غضب کا رنگ لائی ہے سیہ کاری مری — مغفرت نے بھی نہ روزِ حشر پہچانا مجھے

نادر[۳] و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

اگست ۱۹۰۳ء

حاشیہ - یہ غزل خدنگِ نظر اگست ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی

ع۱ نادر سے مراد شیخ نادر علی نادر کاکوروی (۱۸۶۷ تا ۱۹۱۲ء) ہیں۔ یہ اقبال کے قدرداں تھے لیکن کبھی اقبال سے نہ مل سکے اس لیے کہا ہے کہ نادر[۱۱] نے انھیں دور سے دیکھا۔

ع۲ انجیل میں کہا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنے عکس کے مطابق پیدا کیا۔

ع۳ نادر سے مراد شیخ نادر کاکوروی ہیں۔ نیرنگ سے مراد اقبال کے دوست میر

---

۱۱ محمد عبداللہ قریشی: معاصرینِ اقبال کی نظر میں۔ ص ۶۳-۶۲

غلام بھیک نیرنگ ۱۸۷۵ء تا ۱۹۵۲ء ہیں۔ ان دونوں کے حالات عبداللہ قریشی کی کتاب معاصرینِ اقبال کی نظر میں، (مجلس ترقیِ ادب لاہور۔ نومبر ۱۹۷۷ء) میں ملتے ہیں۔

انسان اور بزمِ قدرت

صبح، خورشیدِ درخشاں کو جو دیکھا میں نے
بزمِ معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے

پرتوِ مہر کے دم سے ہے اُجالا تیرا
سیمِ سیّال ہے پانی ترے دریاؤں کا

مہر نے نور کا گہنا تجھے پہنایا ہے
تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے

گل و گلزار ترے، خلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں

سرخ پوشاک ہے پھولوں کی، درختوں کی ہری
تیری محفل میں کوئی سبز، کوئی لال پری

ہے ترے خیمۂ گردوں کی طلائی جھالر
بدلیاں لال سی آتی ہیں افق پر جو نظر

کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی
مئے گل رنگ، خمِ شام میں تو نے ڈالی

نور یکساں ترے ویرانے میں، آبادی میں
شہر میں، دشت میں، کہسار کی ہر وادی میں

رتبہ تیرا ہے بڑا، شان بڑی ہے تیری
پردۂ نور میں مستور ہے ہر شے تیری

صبح، اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا
زیرِ خورشید، نشاں تک بھی نہیں ظلمت کا

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں، مگر
جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیونکر؟

نور سے دور ہوں، ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
بامِ گردوں سے، و یا صحنِ زمیں سے آئی

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود

انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں
عشق کا تو ہے صحیفہ، تری تفسیر ہوں میں

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار جو مجھ سے نہ اٹھا، وہ اٹھایا تو نے

نورِ خورشید کی محتاج ہے ہستی میری
اور بے منتِ خورشید چمک ہے تیر

ہو نہ خورشید تو ویراں ہو گلستاں میرا
منزلِ عیش کی جا ' نام ہو زنداں ب

آہ اے رازِ عیاں کے نہ سمجھنے والے
حلقۂ دامِ تمنا میں الجھنے وا

جو سمجھنے کی تھی وہ بات نہ سمجھی تو نے
م یعنی مے پی ہے تمیزِ من و تو کی تو

ہائے غفلت کہ تری آنکھ ہے پابندِ مجاز
ناز زیبا تھا تجھے، تو ہے مگر گرمِ نی

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے، پھر نہ سیہ کار رہے

ستمبر ۱۹۰۲

۱- یہ نظم مخزن ستمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی.

شیشۂ ساعت کی ریگ

(منسوخ)

اے مشتِ گردِ میداں! اے ریگِ سرخِ صحرا
کس فتنہ جو نے تجھ سے دشتِ عرب چھڑا

صرصر کے دوش پر تو اڑتی پھرتی ہے صدیوں
بلور کے مکاں میں کرتی ہے اب بسیر

ہے خار زارِ غربت، تیرے لیے یہ شیشہ
قصرِ بلور جس کو میری نظر نے سمج

تیرے سکوت میں ہے سو داستاں پرانی
عہدِ کہن بھی گویا، دیکھا ہوا ہے تیر

اس دن کی یاد اب تک باقی ہے تیرے دل میں
کنعاں کا قافلہ جب سوئے حجاز آیا

دیکھے ہوئے ہیں تیرے، فرعون کے سپاہی
تو ہو چکی ہے شاید پامال قومِ موسیٰ

چومے تھے تو نے اڑ کر، مریم کے پائے نازک
ٹوٹا جو ناصرہ کی تقدیر کا ستارہ

شاید گواہ ہے تو اس روز کے ستم پر
یثرب کا چاند جس دم اپنے وطن سے نکلا

ہو کس طرح بھلا تو اس نقشِ پا سے غافل
جس نے ترے وطن کو جنت بنا دیا تھا

اے ریگِ سرخ! تیرا ہر ذرہ کہہ رہا ہے
میں جانتا ہوں قصہ میدانِ کربلا کا

تو گرد پا ہے شاید، بصرہ کے زائروں کی
بانگِ درا سے تیرا ہر ذرہ ہے شناسا

طرزِ نفس شماری، شیشے سے تو نے سیکھی
جاسوس بن گئی تو اقلیمِ زندگی کی

ستمبر ۱۹۰۲ء

خدنگِ نظر لکھنؤ ستمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔
عله ناصرہ وہ قریہ ہے جہاں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تھے۔

دردِ عشق

اے دردِ عشق! ہے گہرِ آبدار تو ‌‌ ‌‌ ‌‌ نامحرموں میں، دیکھ، نہ ہو آشکار تو
پنہاں تہہ نقاب تری جلوہ گاہ ہے ‌‌ ‌‌ ‌‌ ظاہر پرست، محفلِ نو کی نگاہ ہے
آئی نئی ہوا، چمنِ ہست و بود میں ‌‌ ‌‌ ‌‌ اے دردِ عشق! اب نہیں لذّت نمود میں
ہاں، خودنمائیوں کی تجھے جستجو نہ ہو ‌‌ ‌‌ ‌‌ منّت پذیر، نالۂ بلبل کا تو نہ ہو
خالی شرابِ عشق سے لالے کا جام ہو ‌‌ ‌‌ ‌‌ پانی کی بوند، گریۂ شبنم کا نام ہو
پروانہ سوئے شمع نہ قسمت کو رو کے آئے ‌‌ ‌‌ ‌‌ م ذوقِ تپش سے بزم میں آزاد ہو کے آئے
پنہاں درونِ سینہ کہیں راز ہو ترا ‌‌ ‌‌ ‌‌ اشکِ جگر گداز نہ غمّاز ہو ترا
گویا، زبانِ شاعرِ رنگیں بیاں نہ ہو ‌‌ ‌‌ ‌‌ آوازِ نَے میں شکوۂ فرقت نہاں نہ ہو

یہ دَور نکتہ چیں ہے، کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تو مکیں ہے، وہیں چھپ کے بیٹھ رہ

غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ، دیکھ عله ‌‌ ‌‌ ‌‌ جویا نہیں تری، نگہِ نارسیدہ دیکھ
اس بزم میں کسی کو نہیں آرزو تری ‌‌ ‌‌ ‌‌ م موتی ہے تو، مٹے نہ کہیں آبرو تیری
رہنے دے جستجو میں خیالِ بلند کو ‌‌ ‌‌ ‌‌ حیرت میں چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو
جس کی بہار تو ہو، یہ ایسا چمن نہیں ‌‌ ‌‌ ‌‌ قابل تری نمود کے، یہ انجمن نہیں
یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز ‌‌ ‌‌ ‌‌ مقصد تری نگاہ کا، خلوت سرائے راز
ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے ‌‌ ‌‌ ‌‌ کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے
محفل یہ، مرمٹی ہے شرابِ مجاز پر ‌‌ ‌‌ ‌‌ م ادراک طعنہ زن ہے سرورِ گداز پر
رہبر تو خضرِ فکر ہے اور ذوقِ دید ہے ‌‌ ‌‌ ‌‌ م ہاتھوں میں انجمن کے پرانی کلید ہے

نایاب ہو کے اپنی حقیقت دکھا انھیں م جو عجز میں نہاں ہے وہ رفعت دکھا انھیں

فکرِ بلند، غرقِ شرابِ غرور ہے م اس بے خبر کو راہ پہ لانا ضرور ہے

طے کر کے آسماں کو جو بے مدّعا پھرے م دیوانہ وار تیرا پتا پوچھتا پھرے

بے تاب پھر جہاں ہو ترے اشتیاق میں
گریاں ہو چشمِ حسن بھی تیرے فراق میں م

۲۸ ستمبر ۱۹۰۳ء

حاشیہ - یہ نظم اصلاً پنجۂ فولاد بابت ۲۸ ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔

عـلـہ جوش ملسیانی نے "اقبال کی خامیاں" ص ۳۵ پر اعتراض کیا ہے کہ اس شعر کے دونوں مصرعوں میں ردیف معنوی حیثیت سے بے کار ہے۔

غزل

کہوں کیا، آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے؟
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

حباب آسا، سرِ موجِ نفس باندھا ہے محمل کو م
ذرا دیکھ اے شرر! ذوقِ فنا مجھ کو کہاں تک ہے؟

وہی اک شعلہ ہے تربت بھی ہے اور شمعِ تربت بھی م
مزا مرنے کا کچھ پروانۂ آتش بجاں تک ہے

نہ سیکھی تو نے مرغِ رنگِ گل سے رمزِ آزادی م
یہ قیدِ بوستاں، بلبل! خیالِ آشیاں تک ہے

وہ میکش ہوں، فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل، فراقِ ساقیِ نامہرباں تک ہے

چمن افروز ہے صیاد میری خوش نوائی تک
رہی بجلی کی بے تابی، سو میرے آشیاں تک ہے

بنائیں چارہ گر نے دیدۂ حیراں کی زنجیریں م
نظر آیا، مری وحشت میں بے تابی یہاں تک ہے

میں خارِ خشک پہلوئے شعلۂ گلخن کے قابل ہوں م
پڑے رہنا مرا گلشن میں رحمِ باغباں تک ہے

وہ مشتِ خاک ہوں، فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی، زمیں سے آسماں تک ہے

مثالِ عکس، بے تارِ نفس ہے زندگی میری م
تری آسیب کاری اے اجل! اقلیمِ جاں تک ہے

زباں تک عقدۂ تبخالہ بن کر رہ گیا مطلب م
اثر مجھ دل جلے کی بستہ کاری کا یہاں تک ہے

جرس ہوں، نالۂ[1] خوابیدہ ہے میرے ہر رگ و پے میں — یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے
سکونِ دل سے سامانِ کشودِ کار پیدا کر — کہ عقدۂ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے
نہیں منت پذیرِ چشم، رونا شمعِ سوزاں کا — م — سمجھ غافل! گدازِ دل میں آزادی کہاں تک ہے
چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل! — یہاں کی زندگی پابندیِ رسمِ فغاں تک ہے
بھلا اے گل! کبھی اس رمز کو تو نے بھی سمجھا ہے — م — تری شبنم فریبی، کیوں بہارِ بوستاں تک ہے
جوانی ہے تو ذوقِ دید[2] بھی، لطفِ تمنا بھی — ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہماں تک ہے
زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی — سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

یہ ہے اقبال! فیضِ یادِ نامِ مرتضیٰ جس سے
نگاہِ فکر میں، خلوت سرائے لامکاں تک ہے — م

اکتوبر ۱۹۰۳ء

حواشی۔ یہ غزل سب سے پہلے مخزن اکتوبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی
عله یاد کیجیے غالب کا مصرع ع چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

عشق اور موت

(ماخوذ از ٹینی سن)

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی — تبسّم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا — عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن[1] شام کو دے رہے تھے — ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی
کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے — کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی[2] تھی
کہیں عجز سے گردنیں جھک رہی تھی — م — رعونت کہیں، مانعِ بندگی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا — ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو — خودی، تشنہ کامِ مئے بیخودی تھی
پتنگا کہیں مستِ ذوقِ تپیدن — م — کہیں شمع کو نازشِ دلبری تھی

جو قمری کو ملتا تھا طوقِ غلامی
صنوبر کو انعامِ آزادگی تھی

اُٹھی اوّل اوّل گھٹا کالی کالی
کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

یہ گرمِ فغاں تھی، وہ محوِ تبسّم
جو بلبل کا غم تھا وہ گل کی فغاں تھی

زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

غرض اس قدر یہ نظارا تھا پیارا
کہ نظارگی ہو سراپا نظارا

ملک آزماتے تھے پرواز اپنی
جبینوں سے نورِ ازل آشکارا

فرشتہ تھا اک، عشق تھا نام جس کا
کہ تھی رہبری اس کی سب کا سہارا

فرشتہ کہ پتلا تھا بے تابیوں کا
ملک کا ملک اور پارے کا پارا

وہ دردِ محبت، وہ ایمانِ ہستی
وہ افشانِ حسنِ ازل کا ستارا

پئے سیرِ فردوس کو جا رہا تھا
قضا سے ملا راہ میں وہ قضارا

یہ پوچھا، ترا نام کیا، کام کیا ہے؟
نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا

ہوا سن کے گویا، قضا کا فرشتہ
اجل ہوں، مرا کام ہے آشکارا

اڑاتی ہوں میں رختِ ہستی کے پرزے
بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا

مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے
پیامِ فنا ہے اسی کا اشارا

مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
وہ آتش ہے، میں سامنے اس کے پارا

شرر بن کے رہتی ہے انساں کے دل میں
وہ ہے نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا

ٹپکتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو
وہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا

سرِ کوہ چمکے جو وہ بن کے بجلی
تو ہو غیرتِ طور، ہر سنگِ خارا

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا

گری اس تبسّم کی بجلی اجل پر
اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا؟

بقا کو جو دیکھا، فنا ہو گئی وہ
قضا تھی، شکارِ قضا ہو گئی وہ

نومبر ۱۹۰۳ء

حاشیہ- یہ نظم مخزن نومبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کا ماخذ انگریزی شاعر الفریڈ ٹینی سن (۱۸۰۹ء تا ۱۸۹۲ء) کی نظم LOVE AND DEATH ہے جس کا متن ضمیمے میں دیا ہے۔

قصیدۂ تہنیت

دربارِ بہاول پور

(منسوخ)

بزمِ انجم میں ہے گویا چھوٹا سا اک اخترِ زمیں
آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے اوپر زمیں

اوج میں بالا فلک سے، مہر سے تنویر میں
کیا نصیبہ ہے، رہی ہر معرکے میں سرخ زمیں

انتہائے نور سے ہر ذرّہ اختر خیز ہے
مہر و ماہ و مشتری صیغے ہیں، اور مصدر زمیں

لے کے پیغامِ طرب جاتی ہے سوئے آسماں
اب نہ ٹھہرے گی کبھی اطلس کے شانوں پر زمیں

شوق بِک جانے کا ہے فیروزۂ گردوں کو بھی
مول لیتی ہے لٹانے کے لیے گوہر زمیں

بسکہ گلشن ریز ہے ہر قطرۂ ابرِ بہار
ہے شگفتہ، صورتِ طبعِ سخن گستر، زمیں

برگِ گل کی رگ میں ہے جنبش، رگِ جاں کی طرح
ہے امیں اعجازِ عیسیٰ کی، کہ افسوں گر زمیں؟

خاک پر کھینچیں جو نقشہ مرغِ بسم اللہ کا
قوتِ پرواز دے دے حرفِ قُم کہہ کر زمیں

صاف آتا ہے نظر، صحنِ چمن میں عکسِ گل
بن گئی آپ اپنے آئینے کی روشن گر، زمیں

اس قدر نظارہ پرور ہے کہ نرگس کے عوض
خاک سے کرتی ہے پیدا چشمِ اسکندر، زمیں

امتحاں ہو اس کی وسعت کا جو مقصودِ چمن
خواب میں سبزے کے آئے آسماں بن کر، زمیں

چاندنی کے پھول پر ہے ماہِ کامل کا سماں
دن کو ہے اوڑھے ہوئے مہتاب کی چادر زمیں

آسماں کہتا ہے، ظلمت کا جو ہو دامن میں داغ
دھوئے، پانی چشمۂ خورشید سے لے کر، زمیں

چومتی ہے، دیکھنا جوشِ عقیدت کا کمال
پائے تختِ یادگارِ عمِّ پیغمبر، زمیں

زینتِ مسند ہوا عباسیوں کا آفتاب
ہو گئی آزادِ احسانِ شہِ خاور، زمیں

یعنی نوّابِ بہاول خاں، کرے جس پر فدا
بحر موتی، آسماں انجم، زر و گوہر زمیں

جس کے بد خواہوں کی شمعِ آرزو کے واسطے
رکھتی ہے آغوش میں صد موجۂ صرصر زمیں

جس کی بزمِ مسند آرائی کے نظارے کو آج
دل کے آئینے سے لائی دیدۂ جوہر زمیں

فیضِ نقشِ پا سے جس کے ہے وہ جاں بخشی کا ذوق
شمع سے لیتی ہے پروانے کی خاکستر، زمیں

جس کی راہِ آستاں کو حق نے وہ رتبہ دیا
کہکشاں اس کو سمجھتا ہے فلک، محور زمیں

آستانہ جس کا ہے اس قوم کی امید گاہ
تھی کبھی جس قوم کے آگے جبیں گستر زمیں

جس کے فیضِ پا سے ہے شفاف مثلِ آئنہ
چشمِ اعدا میں چھپا کر خاک کا عنصر، زمیں

جس کے ثانی کو نہ دیکھے، مدتوں ڈھونڈے اگر
ہاتھ میں لے کر چراغِ لالۂ احمر، زمیں

وہ سراپا نور اک مطلعِ خطابیہ پڑھوں
جس کے ہر مصرع کو سمجھے مطلعِ خاور، زمیں

اے کہ فیضِ نقشِ پا سے تیرے گُل بر سر زمیں
اے کہ تیرے دم قدم سے خسروِ خاور زمیں

اے کہ تیرے آستاں سے آسماں انجم بہ جیب
اے کہ ہے تیرے کرم سے معدنِ گوہر زمیں

لے کے آئی ہے برائے خطبۂ نامِ سعید
چوبِ نخلِ طور سے ترشا ہوا منبر، زمیں

تیری رفعت سے جو یہ حیرت میں ہے ڈوبا ہوا
جانتی ہے مہر کو، ایک مہرۂ ششدر، زمیں

ہے سراپا طور، عکسِ روئے روشن سے ترے
ورنہ تھی بے نور مثلِ دیدۂ عبہر، زمیں

مایۂ نازش ہے تو اس خانداں کے واسطے
اب تلک رکھتی ہے، جس کی داستاں ازبر، زمیں

ہو ترا عہدِ مبارک صبحِ حکمت کی نمود
وہ چمک پائے کہ ہو محسودِ ہر اختر، زمیں

سامنے آنکھوں کے پھر جائے سماں بغداد کا
ہند میں پیدا ہو پھر عباسیوں کی سر زمیں

محو کر دے عدل تیرا، آسماں کی کج روی
کلیاتِ دہر کے حق میں بنے مسطر زمیں

صلح ہو ایسی گلے مل جائیں ناقوس و اذاں
ساتھ مسجد کے رکھے بت خانۂ آذر، زمیں

نامِ شاہنشاہِ اکبر زندۂ جاوید ہے
ورنہ دامن میں لیے بیٹھی ہے سو قیصر، زمیں

بادشاہوں کی عبادت ہے رعیت پروری
ہے اسی اخلاص کے سجدے سے قائم ہر زمیں

ہے مروت کی صدف میں گوہرِ تسخیرِ دل
یہ گہر وہ ہے کہ ہے جس پر فدا کشور زمیں

حکمراں مستِ شرابِ عیش و عشرت ہو اگر
آسماں کی طرح ہوتی ہے ستم پرور، زمیں

عدل ہو، عالی اگر اس کا، یہی فردوس ہے
ورنہ ہے مٹی کا ڈھیلا، خاک کا پیکر زمیں

ہے گل و گلزار، محنت کے عرق سے سلطنت
ہو نہ یہ پانی تو پھر سرسبز ہو کیونکر زمیں

چاہیے پہرا دماغِ عاقبت اندیش کا
بے ددی میں، ہے مثالِ گنبدِ اخضر، زمیں

دستِ گیری ہو شریفوں کی، اصولِ سلطنت
ہے عدوانِ غم کشوں کی آسماں بن کر، زمیں

لامکاں تک کیوں نہ جائے گی دعا اقبال کی
عرش تک پہنچی ہے جس کے شعر کی اڑ کر زمیں

خانداں تیرا ہے زیبندۂ تاج و سریر
جب تلک مثلِ قمر کھاتی رہے چکر زمیں

مسندِ احباب، رفعت سے ثریا بوس ہو
خاک رختِ خواب ہو اعدا کا، اور بستر زمیں

تیرے دشمن کو اگر شوقِ گل و گلزار ہو
باغ میں، سبزے کی جا پیدا کرے نشتر زمیں

ہو اگر پنہاں تری ہیبت سے ڈر کر زیرِ خاک
مانگ کر لائے شعاعِ مہر سے خنجر زمیں

پاک ہے گردِ غرض سے آئنہ اشعار کا
جو فلکِ رفعت میں ہو لایا ہوں وہ چن کر زمیں

تھی تو پتھر ہی مگر مدحت سرا کے واسطے
ہو گئی ہے گل کی پتی سے بھی نازک تر زمیں

نومبر ۱۹۰۳ء

حواشی۔ یہ قصیدہ مخزن نومبر ۱۹۰۳ء اور وطن ۴ دسمبر ۱۹۰۳ء میں شایع ہوا۔ قصیدے سے پہلے مخزن میں شیخ عبدالقادر کا ایک طویل نوٹ تھا۔ اس کی اور دوسرے ذرائع کی مدد سے قصیدے کی شانِ نزول ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

نواب محمد بہاول خاں پنجم عباسی کے سنِ بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی ان کے والد انتقال کر گئے تھے۔ اس لیے ریاست کا انتظام ایک کونسل آف ریجنسی کرتی تھی نواب کے بالغ ہونے پر خود وائسرائے نے انھیں نومبر ۱۹۰۳ء کو تخت پر بٹھایا۔ شہر کو جس طرح سجایا گیا وہ یادگار رہے گا۔ اس موقع پر اقبال سے ایک قصیدہ کہنے کی فرمائش کی گئی۔ وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے قصیدہ وقت پر مکمل نہ کر سکے اور جشنِ تاجپوشی میں شریک بھی نہ ہو سکے۔ اس لیے یہ قصیدہ مخزن کی معرفت نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ باقیات اور نوادر میں مخزن کے نوٹ میں تاج پوشی کی تاریخ ۲۱ نومبر ۱۹۰۳ء لکھی ہے۔ نقوش، اقبال نمبر ۱ میں مسعود حسن شہاب کے مضمون "اقبال

اور بہاول پور" میں بھی یہ نوٹ درج ہے اور وہاں بھی ۲۱ نومبر لکھی ہے لیکن رختِ سفر میں اسی نوٹ میں ۱۲ر نومبر دی ہے۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے "تلمیحاتِ و ارشاداتِ اقبال" ص ۴۸۲-۴۸۳ پر بہاول خاں کے حالات محمد عزیز الرحمٰن کی کتاب "صبحِ صادق" (بہاول پور۔ طبع ثانی ۱۹۴۳ء) سے لے کر لکھے ہیں۔ اس کے مطابق نواب محمد مبارک خاں کو محمد بہاول خاں پنجم عباسی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ اکتوبر ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۰۳ء کو کرزن نے ان کو اختیارات دیئے۔ ۱۵ر فروری ۱۹۰۷ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح ۱۲ر نومبر صحیح تاریخ معلوم ہوتی ہے، ۲۱ر نومبر نہیں۔ چونکہ قصیدہ اس تاریخ کے بعد مکمل ہوا ہوگا اس کے معنی ہیں کہ مخزن کا نومبر کا شمارہ دیر سے شائع ہوا ہوگا۔ اسی لیے اقبال نے یہ قصیدہ ہفتہ وار وطن کو بھی دے دیا ہوگا۔ وطن میں اس کا عنوان ہے۔

قصیدۂ تہنیت

بتقریبِ جشنِ عطائے اختیارات ہز ہائنس نواب بہاول خاں العباسی الخامس
والیِ بہاول پور

از

جناب شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

یہی قصیدہ مولوی عزیز الرحمٰن کی "تاریخِ نواب بہاول پور" میں بھی درج ہے۔ وہاں عنوان یہ ہے

قصیدۂ تہنیتِ مسند نشینیِ نواب محمد بہاول خاں پنجم دام اقبالہم
(ریختۂ کلکِ گوہر سلکِ شیخ محمد اقبال ایم اے)

وہاں سے لے کر مسعود حسن شہاب نے اپنے مضمون "علامہ اقبال اور بہاول پور" مشمولہ نقوش اقبال نمبر ۱، ستمبر ۱۹۷۷ء شمارہ ۱۲۱ میں ص ۵۳۵ تا ۵۴۳ پر دیا ہے۔ اس قصیدے کی زمین واقعی مشکل ہے۔ اس کا خاتمہ محلِ نظر ہے۔ خاتمے میں ممدوح کے لیے دعا یا حسن طلب ہونا چاہیے۔ اقبال نے اس قصیدے کے آخری دو اشعار میں فخر و مباہات

سے کام لیا ہے بالخصوص آخری شعر میں جولاف وگزاف ہے وہ قصیدے کے لیے مناسب خاتمہ نہیں

۱؎ اطلس یعنی ایٹلس۔ یونان و روم کی دیومالا کا وہ گراں ڈیل دیوتا جو زمین کو اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔

۲؎ یادگارِ عمِ پیغمبر اس لیے کہا کہ نواب کا خاندان عباسی تھا۔

۳؎ اقبال نے مس فرگوسن کے نام ایک خط میں لکھا کہ نواب بہاولپور خلفائے بغداد کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ (مسعود حسن شہاب کا محولہ بالا مضمون ص ۵۳۲)

پیامِ صبح

(ماخوذ از لانگ فیلو)

اُجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا
نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا

جگایا بلبلِ رنگیں نوا کو آشیانے میں
کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کا

طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنور سے توڑا
اندھیرے میں اڑایا تاجِ زر شمعِ شبستاں کا

پڑھا خوابیدگانِ دیر پر افسونِ بیداری
برہمن کو دیا پیغام خورشیدِ درخشاں کا

ہوئی بامِ حرم پر آکے یوں گویا مؤذن سے[1]
نہیں کھٹکا ترے دل میں نمودِ مہرِ تاباں کا؟

ہلائی اس نے زنجیرِ درِ مے خانہ، یہ کہہ کر م
اٹھو، شیرازہ[2] کھولو نسخۂ خوابِ پریشاں کا

اٹھایا آکے سبزے کو صدائے قُم باذنی[3] سے م
دبا یا پائے نازک اس نے ہر طفلِ دبستاں کا

پکاری اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑے ہو کر
چٹک او غنچۂ گل! تو مؤذن ہے گلستاں کا

اٹھایا قطرۂ شبنم کو اس نے بسترِ گل سے م
چھڑایا نیند کے ہاتھوں سے دامن گلستاں کا

دیا یہ حکم صحرا[4] میں چلو اے قافلے والو!
چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا

سوئے گورِ غریباں جب گئی زندوں کی بستی[5] سے
تو یوں بولی، نظارا دیکھ کر شہرِ خموشاں کا

ابھی آرام سے لیٹے رہو میں پھر بھی آؤں گی
سلا دوں گی جہاں کو خواب[6] سے تم کو جگاؤں گی

دسمبر ۱۹۰۳ء

حواشی۔ یہ نظم فتنہ وعطرِ فتنہ بابت ۲۳ر دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کا ماخذ امریکی شاعر لانگ فیلو (۱۸۰۷ء تا ۱۸۸۲ء) کی انگریزی نظم DAY BREAK ہے۔ اس کا انگریزی متن ضمیمے میں ملاحظہ ہو۔

جوش ملسیانی نے اپنی کتاب "تبان کی خامیاں" ص ۷۰-۶۹ پر اس نظم پر کئی معنوی اعتراض کیے ہیں مثلاً:

پہلے شعر کے مصرعِ ثانی میں صبح ہونے کا ذکر ہے لیکن مصرعِ اوّل میں اجالے کے رخصت ہونے کا۔ ایک اجالے کے بعد دوسرا اجالا پیدا ہونا کوئی پُر لطف بات نہیں تیسرے شعر پر دو اعتراض ہیں کہ اس کے پہلے مصرع میں طلسمِ شب کے ٹوٹنے کا ذکر ہے پھر مصرعِ ثانی میں اندھیرا کہاں سے آگیا۔ دوسرے یہ کہ وہ طاقت جو ایک مقدس سورۂ والنور کا وِرد کر رہی ہے "اندھیرے میں چوریاں کس طرح کر سکتی ہے۔ دسویں شعر کے مصرعِ ثانی پر اعتراض ہے کہ دن میں جگنو کہاں چمکتے ہیں۔ جگنو کا تعلق رات سے ہے۔

زہد اور رندی

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی، نہیں منظور، طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
لبریز مئے زہد سے تھی، دل کی صراحی
تھی تہ میں کہیں دُردِ خیالِ ہمہ دانی
کرتے تھے بیاں آپ، کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
دو نذر تو فرماتے تھے ہو کر متبسم
م دیں داروں کی امداد، ہے ایماں کی نشانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال، کہ ہے قمریٔ شمشادِ معانی

پابندیِ احکامِ شریعت میں ہے کیسا!
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمہ دانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؑ ہم نے سنی اس کی زبانی

م کہتے ہیں کہ ہے اس کو محبت فقرا سے
دیکھی نہیں ہم نے تو کوئی ایسی نشانی

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی، مگر خاک اُڑانی

کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی

م ہر رات اسے راگ کے جلسوں سے سروکار
پھرتا ہے سرِ مزرعِ اوراد یہ پانی

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

مجموعۂ اضداد ہے، اقبال نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے، طبیعت خفقانی

رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی

اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تا دیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی

اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی

اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی

فرمایا شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی

میں نے یہ کہا، کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا ز رہِ قربِ مکانی

خم ہے سرِ تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی

گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

دسمبر ۱۹۰۳ء

حاشیہ۔ نظم مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔
بیاضِ عماد میں اس نظم کے ساتھ پنسل سے نوٹ ہے۔
"یہ قطعہ حالی کے ایک قطعہ کو، جو اسی زمین میں ہے، دیکھ کر لکھا ہے"
میں نے رام نراین لال الہ آباد کا شائع کردہ دیوانِ حالی دیکھا۔ اس میں اس زمین میں کوئی قطعہ نہیں ہے۔
۱؎ جوش ملسانی نے اپنی کتاب "اقبال کی خامیاں" میں ص ۱۵ اور ۳۹ پر لکھا ہے کہ دُرد مذکر ہے اور سند میں آتش کا شعر پیش کیا ہے۔
کہتے ہیں عطر جس کو یہ مردم گلاب کا ۔۔۔ اے تُرک دُرد ہے تری جھوٹی شراب کا
راقم الحروف کے نزدیک دُرد مونث ہے چنانچہ فرہنگِ آصفیہ میں بھی مونث ہی لکھا ہے۔ جوش نے یہ بھی کہا کہ 'کہیں' کی جگہ 'مگر' اور 'خیال' کی جگہ 'غرور' بہتر ہوگا چنانچہ انھوں نے مصرع کی یہ شکل تجویز کی۔
ع تھا تہہ میں مگر دُردِ غرورِ ہمہ دانی
۲؎ اعجاز احمد نے 'مظلوم اقبال' میں ص ۱۴۳ پر لکھا ہے کہ علامہ نے اس مصرع کی صراحت میں کہا کہ یہ مولوی صاحب کا قول ہے۔ وہ خود خلفائے راشدین میں ایک کی دوسرے پر فضیلت کا عقیدہ نہیں رکھتے۔

شاعر

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم ۔۔۔ منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم ۔۔۔ شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

حاشیہ۔ اس نظم کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ بانگِ درا میں اس کے مقام کی بنا پر اسے یہاں لکھا جا رہا ہے۔

غزل

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ، کیا چاہتا ہوں
ستم ہو، کہ ہو وعدہٗ بے حجابی — کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو — کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا — وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
مری جاں! نہیں ربط غیروں سے اچھا م — بھلا، میں تمھارا برا چاہتا ہوں؟
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل — چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی — بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں
مجھے جلوہٗ گل ہے برقِ تجلی م — سنبھالو مجھے، میں گرا چاہتا ہوں
نہ کوثر کا خواہاں، نہ حوروں کا شیدا م — خدا جانے میں کیا ہوں، کیا چاہتا ہوں
اُگوں گا، سبز ہوں، پس کے ہوں خون آخر م — میں قسمت [illegible] سا چاہتا ہوں
شجر ہوں، گرے گی مجھ پہ برقِ محبت م — ہرا ہو گیا ہوں، پھلا چاہتا ہوں
مری جاں! تری بے حجابی سے پہلے م — تری دید کا حوصلہ چاہتا ہوں
محبت مٹا دے گی بیگانگی کو م — سنبھل بیٹھ! میں تو "ہوا" چاہتا ہوں
ہوا خاک میں، اے ہوائے محبت م — مدینے کی جانب اُڑا چاہتا ہوں

چلو، مل کے اقبال کے گھر کو ڈھونڈھیں
کہ میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں م

جنوری ۱۹۰۴ء

حاشیہ - یہ غزل مخزن جنوری ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔

ترجمہ از ڈائک

(منسوخ)

دل شمع صفت، عشق سے ہو نور سراپا — اور فکر یہ روشن ہو کہ آئینہ ہو گویا

نیکی ہو ہر اک فعل میں، نیت کی ہو پیدا — ہر حال میں ہو خالقِ ہستی پہ بھروسا
ایسی کوئی نعمت تہہِ افلاک نہیں ہے — یہ بات جو حاصل ہو تو کچھ باک نہیں ہے

جنوری ۱۹۰۴ء

حواشی ۔ رسالہ برگِ گل، وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج کراچی اقبال نمبر، ۱۹۷۷ء میں عابدہ سلطانہ سوز کا مضمون 'اقبال اور مخزن' ہے ۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ڈانگ کا یہ ترجمہ مخزن جنوری ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا ۔ یہ ترجمہ عبدالغفور خاں کی فرمائش پر کیا گیا تھا ۔ نوادر ص ۲۴۰ پر اس کی تاریخ ۱۹۰۲ء دی ہے جو صحیح نہیں ۔ باقیات ص ۱۹۶ پر مخزن ۱۹۰۴ء لکھا ہے لیکن صحیح مہینہ نہیں دیا ۔ ڈانگ کون تھا یہ معلوم نہیں ۔

طفلِ شیرخوار

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلّاتا ہے تو — مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو
یسی چیزوں کو جو تو سمجھا ہے سامانِ خوشی م کیا کسی دکھ درد کے مکتب کی ابجد ہے یہی؟
ردیدہ آئے تو اسیرِ حلقۂ گردابِ درد م ہوتی جائے گی تجھے آگاہی اسبابِ درد
پھر پڑا روئے گا اے تو واردِ اقلیمِ غم — سمجھ نہ جائے، دیکھنا! باریک ہے نوکِ قلم

آہ! کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے؟
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے، یہ بے آزار ہے

ن چمکتی چیز کی خاطر یہ بے تابی ہے کیا؟ م اب سیاہی کے گرانے کی تجھے سوجھی ہے کیا!
میندے تیری کہاں؟ چینی کی بلّی ہے کدھر؟ — وہ ذرا سا جانور ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر
ہے تجھے کچھ فرش پر اس کو گرانے میں مزا م ٹوٹ جائے آئنہ میرا، تجھے پروا ہے کیا
یوں کا ہو کوئی گچھا کہ سونے کی گھڑی م مل گئی جو شے تجھے، تیرا کھلونا بن گئی
تری آنکھوں کے آگے ہو، ہوس انگیز ہے م یعنی ہر شے توسنِ ادراک کو مہمیز ہے
ئی ہے فصلِ گل کی، جس طرح پہلے کلی م منہ [illegible] پتے کی نقابِ عارضی

اے گلِ شگفتۂ صحنِ چمن زارِ وجود م
یوں ترے ہنسنے سے، دل میں ہے تمنا کی نمود

آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرارِ آرزو
تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو

تیری صورت آرزو بھی تیری نوزائیدہ ہے
ہاتھ کی جنبش میں، طرزِ دید میں پوشیدہ ہے

زندگانی ہے تری آزاد قیدِ امتیاز
تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہے تو
کیا تماشا ہے، ردی کاغذ سے من جاتا ہے تو!

آہ اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
تو تلوّن آشنا، میں بھی تلوّن آشنا

عارضی لذت کا شیدائی ہوں، چلاتا ہوں میں
جلد آجاتا ہے غصہ، جلد من جاتا ہوں میں

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری
کم نہیں کچھ، تیری نادانی سے نادانی مری

تیری صورت، گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفلِ ناداں میں بھی ہوں

فروری ۱۹۰۴ء

حاشیہ ۱۔ یہ نظم مخزن فروری ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی

رخصت اے بزمِ جہاں

(بیراگ)

ماخوذ از ایمرسن

رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

بسکہ میں افسردہ دل ہوں، درخورِ محفل نہیں
تو مرے قابل نہیں ہے، میں ترے قابل نہیں

قید ہے دربارِ سلطان و شبستانِ وزیر
توڑ کر نکلے گا زنجیرِ طلائی کا اسیر

تیر لگتی ہے نگاہِ چشمِ نو دولت مجھے م
ہے ترے عجزِ خوشامد زادہ سے نفرت مجھے

گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا
مدتوں بے تاب، موجِ بحر کی صورت رہا

مدتوں بیٹھا ترے ہنگامۂ عشرت میں میں
روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں

مدتوں ڈھونڈا کیا نظارۂ گل خار میں
آہ وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں

مدتوں ضبطِ تکلم کے ستم سہتا رہا م
اشک کی صورت میں، اپنا حالِ دل کہتا ہوا

خامشی کا بار لیکن اب اٹھا سکتا نہیں م
آئینہ مشرب ہوں، راز اپنا چھپا سکتا نہیں

چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
آرزو ساحل کی، مجھ طوفان کے مارے کو ہے

چھوڑ کر مانندِ بو تیرا چمن جاتا ہوں میں
رخصت اے بزمِ جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں

گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں
آہ، یہ لذت کہاں موسیقیِ گفتار میں

ہم نشینِ نرگسِ شہلا، رفیقِ گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن، ہمسایۂ بلبل ہوں میں

شام کو آوازِ چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح، فرشِ سبزہ سے کوئل جگاتی ہے مجھے

مل کے رہتی ہیں تہِ دامانِ دریا مچھلیاں م
یعنی وہ چاندی کے طائر بے پر و بے آشیاں

مل کے اڑتے، مل کے گاتے ہیں گلستاں میں طیور م
خیمہ زن انساں ہیں شہروں میں، ویرانوں سے دور

بزمِ ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن، کنجِ تنہائی پسند

ہے جنوں مجھ کو، کہ گھبراتا ہوں آبادی سے میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں؟

شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے؟
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے

کوہ کے دامن میں کیا بے مدعا پھرتا ہوں میں! م
کیا مصافِ زندگی سے بھاگتا پھرتا ہوں میں

طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنجِ عزلت کا ہوں میں
دیکھ، اے غافل! پیامی بزمِ قدرت کا ہوں میں

ہم وطن شمشاد کا، قمری کا میں ہم راز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوش بر آواز ہوں

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لیے
دیکھتا ہوں کچھ، تو اوروں کو دکھانے کے لیے

عاشقِ عزلت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں

لیٹنا زیرِ شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
شام کے تارے پہ جب پڑتی ہو رہ رہ کر نظر

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود؟
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود

مارچ ۱۹۰۴ء

حواشی - یہ نظم مارچ ۱۹۰۴ء میں مخزن لاہور اور دکن ریویو حیدرآباد دونوں میں شائع ہوئی۔
اس کا ماخذ انگریزی شاعر ایمرسن کی نظم GOOD BYE ہے۔ انگریزی متن ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کے مضمون 'اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ' مشمولہ 'اُردو کراچی جنوری ۶۶ء سے لے کر ضمیمے میں دیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ اکبر حسین قریشی نے واضح کیا ہے ایمرسن اور اقبال دونوں کے یہاں نظم کا ابتدائی حصّہ پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاعر اس جہان کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں جانے کو تیار ہے لیکن ایسی بات نہیں نظم کے بعد کے حصّے سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاعر شہر چھوڑ کر فطرت کی طرف پلٹ جانا چاہتا ہے۔ ع گھر بسایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں

اس کا ابتدائی عنوان 'بیراگ' تھا جو رزاق کی کلیات میں ہے۔ بانگ میں اس کا عنوان 'رخصت اے بزمِ جہاں' کر دیا گیا۔ بیاض میں اس کا عنوان 'رخصتِ بزمِ جہاں' دیا ہے۔

عـــہ جذباتِ نادر کراچی ص ۱۳۶ ایران کی نظم 'شاعری' میں یہ شعر ہے۔

تو مرے قابل نہیں ہے میں ترے قابل نہیں
مجھ کو جو سامان ہیں درکار وہ حاصل نہیں

(عبداللہ قریشی: معاصرینِ اقبال کی نظر میں ص ۵۸ - ۵۷)

کیا نادر نے اقبال کا مصرع لیا یا اقبال نے نادر کا؟

مزدور کا خواب

مسافر رات کے، چاندی کی جیب و آستیں والے
ستارے آسماں کے جن کو کہتے ہیں زمیں والے
اٹھا کر دوش پر اپنے عروسِ شب کی محمل کو
سحر کے خوف سے اُڑتے چلے جاتے تھے منزل کو
مثالِ گیسوئے شب خامشی بھی بڑھتی جاتی تھی
صدا موجوں کی لیکن ساحلِ دریں سے آتی تھی

وہ غافل سو رہا تھا بسترِ ریگِ بیاباں پر

ہوائیں چومتی آتی تھیں پہنائے سمندر کو
اڑا سکتی نہ تھیں اس کے تنِ عریاں کی چادر کو
ہوئیں آنکھیں جو اعجازِ تخیّل کی تماشائی
شبِ غربت میں کی صبحِ وطن نے جلوہ آرائی

کنارِ آبِ راوی خوابؔ نے پہنچا دیا اس کو   تماشا گاہِ طفلی کا سماں دکھلا دیا اس کو
ہوا اک بار پھر داخل وہ اس ٹوٹے ہوئے گھر میں
جہاں محنت ہم آغوشِ کفایت ہو کے رہتی تھی   قناعت خانہ پروردِ محبّت ہو کے رہتی تھی
جہاں چرخے کی خواب آور صدا پردہ تھی آہوں کا

حواشی - یہ نظم پہلی بار روزگار ص ۳۲۶ پر دی گئی - ظاہرا وہیں سے لے کر باقیات ص ۲۶۳ - ۲۶۲ پر دی ہے - اس میں ایک طرف جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن کا ذکر ہے ، ہے ، دوسری طرف راوی کا - انیسویں صدی میں بہت سے ہندوستانی افریقہ کے ممالک میں کام کرنے جاتے تھے - اس نظم میں کسی پنجابی مہاجر مزدور کا ذکر ہے جو ڈربن میں مزدوری کرتا ہے -

۱؎ محل مذکّر ہے - اقبال نے اسے مونث باندھا ہے -

تصویرِ درد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری   خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری
ہوئی ہے سرمۂ آواز، گو لذّتِ خموشی کی   م   نگہ بن بن کے آنکھوں سے نکلتی ہے فغاں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں   یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
مری حیرت دانی سوز ہے اس درجہ اے ساقی   م   کہ مینا بن گئی آخر، شرابِ ارغواں میری
شکارِ خوفِ رسوائی ہے میری نو گرفتاری   م   کسی صورت ہو یا ربّ ساری دنیا راز داں میری
اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے   چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے   چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری
ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے   سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری
الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا؟   حیاتِ جاوداں میری، نہ مرگِ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا   وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

دریں[علہ] حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم

زفیضِ دل تپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم

ریاضِ دہر میں نا آشنائے بزمِ عشرت ہوں — خوشی روتی ہے جس کو، میں وہ محرومِ مسرت ہوں

مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی — میں حرفِ زیرِ لب، شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں

شکایت آسماں کی، میرے لب پر آ نہیں سکتی — م — کہ میں[۲] قسمت کا مارا، آپ ہی اپنی مصیبت ہوں

مری ہستی نے آلودہ کیا دامانِ عصیاں کو — م — وہ عاصی ہوں کہ میں اپنے گناہوں کی ندامت ہوں

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا — سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

یہ سب کچھ ہے، مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا — سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں

خزینہ ہوں، چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے — کسی کو کیا خبر ہے، میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں

مرے طوفِ جبیں کو اُڑ کے خاکِ آستاں آئی — م — میں وہ درماندۂ دامانِ صحرائے عبادت ہوں

سیہ کاری مری، زاہد سے کہتی ہے یہ محشر میں — م — سبھی کچھ ہوں، مگر ہم رنگِ محرابِ عبادت ہوں

نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی — میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں

مری ہستی نہیں، وحدت میں کثرت کا تماشا ہے — م — کہ خود عاشق ہوں، خود معشوق ہوں، خود دردِ فرقت ہوں

نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں، نہ پیمانہ — میں اس مے خانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

وضو کے واسطے آتا ہے کعبہ لے کے زمزم کو — م — الٰہی کون سی وادی میں میں محوِ عبادت ہوں

نہ چھپ او کاٹنے والے! مجھے میرے نیستاں سے — م — سراپا صورتِ نے تیری فرقت کی شکایت ہوں

نجف میرا مدینہ ہے، مدینہ ہے مرا کعبہ — م — میں بندہ اور کا ہوں، امتِ شاہِ ولایت ہوں

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو — م — مجھے معذور رکھ، میں مستِ صہبائے محبت ہوں

یہی صہبا ہے جو رفعت بنا دیتی ہے پستی کو

اسی صہبا میں آنکھیں دیکھتی ہیں رازِ ہستی کو — م

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے

وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

شرابِ عشق میں، کیا جانئے، کیا تاثیر ہوتی ہے! — م — کہ مشتِ خاک جس سے رشکِ اکسیر ہوتی ہے

یہ وہ مئے ہے تکلم بن کے رہتی ہے زبانوں میں م نگاہوں میں مثالِ سرمۂ تسخیر ہوتی ہے
زباں میری ہے، لیکن کہنے والا اور ہے کوئی م مری تقریر گویا اور کی تقریر ہوتی ہے
بس اے ذوقِ خموشی! رخصتِ فریاد دے مجھ کو م کہ چپ بیٹھوں تو گویائی گریباں گیر ہوتی ہے
اثر ایسا کیا ہے دل پہ تاراجِ گلستاں نے م مجھے پروازِ رنگِ گل، صدائے تیر ہوتی ہے
سنا ہے میں نے جو کچھ، اہلِ محفل کو سناتا ہوں م خموشی بے محل، مثلِ دمِ شمشیر ہوتی ہے
نفس کا آئنہ باندھا ہے میں نے اپنی آہوں میں م مری ہر بات، میرے درد کی تصویر ہوتی ہے
خود اپنے آنسوؤں میں رونے والا چھپ کے بیٹھا ہو م صدائے نالۂ دل کی یہی تاثیر ہوتی ہے
تمیزِ ما و من ہوتی نہیں حرفِ محبت میں م مثالِ خامشی، گویا مری تقریر ہوتی ہے
سنے ہیں اہلِ محفل نے فسانے حال و ماضی کے م مرے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہوتی ہے

برا ہوں یا بھلا ہوں، میرا کہنا سب کو بھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے م

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں
رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
ہوائے امتیازِ ملت و آئیں کی موجوں نے م غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ، اس باغ میں گلچیں تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
جہاں خوں ہو رہا ہے کارزارِ زندگانی سے م مئے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں نوجوانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل! صدا میری، یہ ایسی چیز ہے جس کو وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو، جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے دھرا کیا ہے بھلا، عہدِ کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ تقریر پیدا کر زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

تغیّر اس طرح کا محفلِ ہستی میں آیا ہے م کہ ہے چپ بیٹھ رہنا بھی تباہی کے نشانوں میں
مژدہ دیتا نہیں کچھ صورتِ گل صد زباں ہونا م زباں جب ایک بھی گویا نہ ہو اتنی زبانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو! تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں
ہوا پیکار کی، آخر اُجاڑے گی گلستاں کو م خدا رکھے، یہ ہے اپنے پرانے مہربانوں میں
قیامت ہے کہ ہر ذرّے سے پیدا ہو مصیبت سے م زمیں بھی اپنی، شاید جا ملی ہے آسمانوں میں
اُڑا لے جائے گی موجِ ہوائے نیستی ان کو م نہ ہو جب راہ پیمائی کی طاقت ناتوانوں میں

رُلایا خوں مری آنکھوں کو تیرے خوابِ غفلت نے
مری تقدیر میں لکھا تھا رونا کلکِ قدرت نے م

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گام زن، محبوبِ فطرت ہے

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
دکھاؤں گا میں اے ہندوستاں! رنگِ وفا سب کو م کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا
نہیں بے وجہ، وحشت میں اڑانا خاکِ زنداں کا م کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کر کے چھوڑوں گا
شریکِ محنتِ زنداں ہوں گو یوسف صفت خود بھی م مگر تعبیرِ خوابِ اہلِ زنداں کر کے چھوڑوں گا
مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ درد آشنا پیدا چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا
ابھی مجھ دل جلے کو، ہم صفیرو! اور رونے دو م کہ میں سارے چمن کو شبنمستاں کر کے چھوڑوں گا
تعصب نے مری خاکِ وطن میں گھر بنایا ہے م وہ طوفاں ہوں کہ میں اس گھر کو ویراں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا
مجھے اے ہم نشیں! رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا
اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی م مسلمانوں کو آخر نامسلماں کر کے چھوڑوں گا
اٹھا دوں گا نقابِ عارضِ محبوبِ یک رنگی م تجھے اس خانہ جنگی پر پشیماں کر کے چھوڑوں گا
دکھا دوں گا جہاں کو، جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو تیرا درد تھا، تاکا ہے اس نے میرے پہلو کو
تری افتاد نے توڑا ہے میرے دست و بازو کو م
جو ہے پردوں میں پنہاں، چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے   گزاری عمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے
اُڑا کر لے گئی لذت، تجھے، آوارہ رہنے کی   م   چمن میں کچھ نہ دیکھا صورتِ بادِ صبا تو نے
تری تعمیر میں مضمر ہوئی افتادگی کیوں کر   م   لگائی ہے مگر اس گھر کو خشتِ نقشِ پا تو نے
تلاشِ نکہتِ اخگر سے پیدا ہے جنوں تیرا   م   جو پہنی صورتِ تصویر، کاغذ کی قبا تو نے
سبق لیتا رہا افتادگی کا خاکِ ساحل سے   م   نہ سیکھا موجِ دریا سے علاجِ خوابِ پا تو نے
رہا دل بستۂ محفل، مگر اپنی نگاہوں کو   کیا بیرونِ محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے
فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر   مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے
تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں   یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے
سراپا نالۂ بے دادِ سوزِ زندگی ہو جا   سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے
صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے   کفِ آئینہ پر باندھی ہے او ناداں! حنا تو نے
زمیں کیا، آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے   غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے
نہیں ہے دہریت کیا بندۂ حرص و ہوا ہونا؟   م   قیامت ہے مگر اوروں کو سمجھا دہریا تو نے
زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل   بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے
کنویں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا   ارے غافل! جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے
وہ حسنِ عالم آرا تیرے دل میں جلوہ گستر تھا   م   غضب ہے، آسمانوں میں دیا اس کا پتا تو نے
نہیں ممکن شناسائی ہو تجھ کو رمزِ وحدت سے   م   صدائے غیر سمجھا، جب سنی اپنی صدا تو نے

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری، صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

نظر اس دور میں مجھ کو ترا جینا نہیں آتا   م   کہ صہبائے محبت کا تجھے پینا نہیں آتا

پکڑ کر عجز کا دامن، پہنچ رشکِ نخی پہ م نگہ ہوں کو نظر اس بام کا زینا نہیں آتا
عدو، صبحِ صفائے دل کی ہے ظلمت تعصب کی م مقابل چشمِ نابینا کے آئینا نہیں آتا
یہیں بے نور ہے، محشر میں تو کیا خاک دیکھے گا م کہ تجھ کو دیکھنا اے دیدۂ بینا! نہیں آتا
یہ بہتر تھا کہ تو اے شیشۂ دل اچُور ہو جاتا م صفا رہنا تجھے، مانندِ آئینا نہیں آتا
اکارت ہے، بناوٹ سے ترا رونا نمازوں میں م کہ ہاتھ اس طرح وہ پوشیدہ گنجینا نہیں آتا
بنا آنکھوں کو جامِ اشک، دل کو درد کی مینا م مزا جینے کا کچھ بے ساغر و مینا نہیں آتا
بجھا دینا ہی اچھا ہے چراغِ زندگانی کا م محبت میں جو مر مر کے تجھے جینا نہیں آتا
بنا اس راہ میں ذوقِ طلب کو ہم سفر اپنا م اکیلے لطفِ سیرِ وادیِ سینا نہیں آتا
تلاشِ خضر کب تک تشنۂ زہرِ محبت کو! م جسے مرنا نہیں آتا، اسے جینا نہیں آتا

نمی گویم قیامت جوش زن یا شورِ طوفاں شو
ز طوفاں دست بردار! آنچہ نتوانی شدن آں شو م

دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پُرنم کو جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رلواتا ہے شبنم
تبسم سے غرض ہے پردہ داری چشمِ گریاں کی م چھپا کر بیٹھ صبحِ عید میں، شامِ محرم
نرا نظارہ ہی اے بوالہوس! مقصد نہیں اس کا بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم
اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا! نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے
شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے
جمالِ یوسفِ یثرب کو دیکھ آئینۂ دل میں م نہ ڈھونڈ اے دیدۂ حیراں! نمودِ ابنِ م
نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے ش
پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنی مر
شفا دیکھی ہے بیماری میں کیا ان دردمندوں نے! م کہ بے حاصل سمجھتے ہیں تلاشِ ابنِ مر
خدا جانے یہ بندے کون سی آتش میں جلتے ہیں م کہ خاکستر کی اک مٹھی، سمجھتے ہیں جہ

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

دور ہر دکھ کی ہے، مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا

شرابِ بےخودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا

تھمے[8] کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا، جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

یہ استغنا[9] ہے، پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثلِ حبابِ آبجو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا، اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں، او بیگانہ خو رہنا

شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست، بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیابانِ محبت، دشتِ غربت بھی، وطن بھی ہے
یہ ویرانہ، قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے، صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے

مرض کہتے ہیں سب اس کو، یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں، علاجِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے

جلانا دل کا ہے، گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے

وہی اک حسن ہے، لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بیستوں بھی، کوہکن بھی ہے

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟

سکوت آمیز طولِ داستانِ درد ہے[10]، ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

"نمی گردید کوتہ[11]، رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں، بہ خاموشی ادا کردم"

۱۹۰۴ء

حواشی۔ غلام رسول مہر سرود رفتہ کے مقدمے میں مطلع کرتے ہیں کہ یہ نظم انجمن حمایتِ اسلام کے ۱۹۰۴ء کے جلسے میں پڑھی گئی۔ انھیں کے بقول مخزن نے اسے مارچ ۱۹۰۴ء میں زائد صفحے لگا کر چھاپا تھا (ص ۱۱۵)

اقبال، دانائے راز میں عبداللطیف اعظمی لکھتے ہیں۔

"انجمن حمایتِ اسلام کے انیسویں سالانہ جلسے میں جو یکم تا ۳ اپریل اسلامیہ کالج کے صحن میں منعقد ہوا تھا، اقبال نے اپنی نظم تصویرِ درد پڑھی۔ اس جلسے میں مولانا حالیؔ مولانا نذیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر، میاں فضل حسین میاں محمد شفیع، مرزا ارشد گورگانی وغیرہ جیسے مشاہیر نے شرکت کی" (ص ۲۲۱)

باقیاتِ اقبال ص ۲۴۴ کے مطابق حالی نے اس نظم کا ایک شعر بہت پسند کیا اور انجمن کو دس روپیے کا نوٹ عطا فرمایا۔ معلوم نہیں وہ کون سا شعر تھا۔

یہ نظم مخزن مارچ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ پہلے انجمن میں پڑھی گئی ہوگی اور بعد میں مخزن میں چھپی ہوگی جس کے معنی ہیں کہ مخزن کا مارچ ۱۹۰۴ء کا شمارہ کم از کم ایک ماہ دیر سے آیا ہوگا۔

عــ۱ــہ جوش ملسیانی اپنی کتاب اقبال کی خامیاں (ص ۱۵) میں توجہ دلاتے ہیں کہ اقبال نے یہاں لفظِ طرز کو مونث باندھا ہے جب کہ نظم 'طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام' میں مذکر ع عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے۔ طرز بہ لحاظِ جنس مختلف فیہ ہے۔ شاعر کو کسی ایک اصول پر کاربند رہنا چاہیے۔

عــ۲ــہ معلوم نہیں یہ شعر کس کا ہے۔ اکبر حسین قریشی کو بھی اس کی خلش ہے (تلمیحات و اشاراتِ اقبال ص ۴۱۴)

عــ۳ــہ جوش ملسیانی 'اقبال کی خامیاں' ص ۴۸ پر لکھتے ہیں کہ یہاں اقبال نے "تو نے سمجھا ہے" باندھا ہے جب کہ نیا شوالہ میں "تو سمجھا ہے" (ع پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے) 'تو نے سمجھا ہے' غلط اور متروک ہے جب کہ 'تو سمجھا ہے' درست ہے۔

عــ۴ــہ جوش ملسیانی معترض ہیں کہ مرہم بالاتفاق مذکر ہے جب کہ اقبال نے مونث باندھا ہے۔

عــ۵ــہ یہ شعر نظیری کا ہے (تلمیحات و اشاراتِ اقبال ص ۲۸۲، نیز یوسف سلیم چشتی: شرح بانگِ درا ص ۱۲۲)

رباعی

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی　　　معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا　　　نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

اپریل ۱۹۰۴ء

حاشیہ - انجمن حمایتِ اسلام کے مندرجہ بالا جلسے یکم تا ۳/ اپریل ۱۹۰۴ء کو ہوئے۔ کسی جلسے میں پہلے اقبال نے اپنی نظم تصویرِ درد پڑھ کر سنائی، اس کے بعد حالی نے اپنا کلام سنایا۔ چونکہ مجمع بہت تھا اور حالی بہت بوڑھے ہو چکے تھے اُن کی آواز سامعین تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اقبال نے ان کی نظم سنائی۔ نظم سنانے سے پہلے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی۔ یہ سرودِ رفتہ اور باقیاتِ اقبال طبع سوم میں موجود ہے۔

ماہِ نو

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل　　　ایک ٹکڑا تیرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ[۱] گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب　　　نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
شام نے آکر پڑھا دیباچۂ مضمونِ شب　م　ہے لبِ پیرِ فلک پر مصرعِ موزونِ[۲] شب
چرخ نے بالی چرالی ہے عروسِ شام کی　م　نعلِ زریں گر پڑی ہے توسنِ ایام کی
منشیِ قدرت مگر کھا کر کہیں ٹھوکر گرا　م　جب سیاہی گر چکی، قط زن سیاہی پر ہوا
کاسۂ سیمیں لیے ہاتھوں میں آیا، دیکھنا　م　آسماں دریوزۂ ظلمت کو نکلا، دیکھنا

دام باقی کر رہا[۳] ہے، زلفِ مشکیں شام کی
نیل کے پانی میں اک مچھلی ہے سیمِ خام کی　م
چرخ[۴] نے بالی چرالی ہے عروسِ شام کی؟
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی؟

اے چراغِ دودمانِ آفتاب خاوری!　م　قہر ہے چشمِ تصور پر تری جادوگری
قافلہ تیرا رواں بے منتِ بانگِ درا[۵]　　　گوشِ انساں سن نہیں سکتا تری آوازِ پا

تو وہ رہرو ہے کہ پھرتا ہی رہا منزل کے گرد م قیس کی صورت جبیں سا ہی رہا محمل کے گرد
گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو ہے وطن تیرا کدھر؟ کس دیس کو جاتا ہے تو؟
سرمۂ گوہر مری آنکھوں کو تیری دید ہے م اے مہِ نو! تو ہلالِ مطلعِ امید ہے
آرزوئے نور میں ہے صورتِ سیماب تو م تیری بے تابی کے صدقے ہے عجب بے تاب تو
ساتھ، اے سیارۂ ثابت نما لے چل مجھے خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بے کل مجھے

نور کا طالب ہوں، گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

چاہیے میری نگاہوں کو انوکھی چاندنی م لا کہیں سے ماہِ کامل بن کے ایسی چاندنی

ظلمتِ بیگانگی میرے وطن سے دور ہو
خاکِ ہندستاں کا ہر ذرّہ سراپا طور ہو م

مئی ۱۹۰۴ء

حاشیہ۔ یہ نظم خدنگِ نظر مئی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔

نالۂ فراق

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں آہ مشرق کی، پسند آئی نہ اس کو، سرزمیں
آ گیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں ظلمتِ شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں

تا ز آغوشِ وداعش داغِ حسرت چیدہ است
ہمچو شمعِ کشتہ در چشمم نگہہ خوابیدہ است

کشتۂ عزلت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں شہر سے، سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
یادِ ایامِ سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں بہرِ تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں

آنکھ گو مانوس ہے تیرے در و دیوار سے
اجنبیت ہے مگر پیدا مری رفتار سے

ہوگئی رخصت مسرت، غم مرا ہمدم ہوا ۔ دفترِ صبر و شکیبائی جو تھا، برہم ہوا
کچھ عجب، اس کی جدائی میں مرا عالم ہوا ۔ دل مرا، منتِ پذیرِ نالۂ پیہم ہوا

حاضراں از دور چوں، محشر خروشم دیدہ اند
دیدہ ہا باز است لیک از راہِ گوشم دیدہ اند ۔

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا ۔ آئنہ ٹوٹا ہوا، عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا ۔ آہ کیا جانے کوئی، میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت
اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم! ۔ تھی تری موجِ نفس، بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائیِ صحرائے علم ۔ تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

"شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند؟
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند"

دجلہ ریزی کر رہا ہے دیدۂ پُرخوں مرا ۔ صورتِ سیماب مضطر ہے دلِ محزوں مرا
دردِ فرقت سے ہے رنگیں، نالۂ موزوں مرا ۔ داغِ حرماں ہے سراپا، ہر گلِ مضموں مرا

آہ وہ حاصل نہیں اوروں کی مدحت میں مجھے
لطف جو ملتا تھا کچھ، تیری ملامت میں مجھے ۔

کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو ۔ توڑ کر پہنچوں گا میں، پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو ۔ کیا تسلی ہو مگر، گرویدۂ تقدیر کو

"تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو، ہے سخن تصویر کا

زندگی کا، دامنِ انساں میں گویا خار ہے ۔ آرزو کا دل میں، سینے میں نفس کا خار ہے
یوں تو اس عالم کے ہر ذرے سے اگتا خار ہے ۔ خار، فرقت کا، مگر سب سے نکیلا خار ہے

زندگانی در جگر خار است و در پا سوزن است
تا نفس باقی ست، در پیراہنِ ما سوزن است ۔

مئی ۱۹۰۴ء

حاشیہ۔ یہ نظم مخزن مئی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی ۔اس کی ابتدا میں اقبال کا یہ تمہیدی نوٹ تھا جو سرو درخت میں دیا ہے:

"استاذی قبلہ آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد ان کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ کئی دن تک سکوتِ قلبی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ایک روز تخیل نے ان کے مکان کے سامنے لا کے کھڑا کر دیا اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان پر آ گئے جن کی اشاعت پر احباب مجبور کرتے ہیں ۔ اگرچہ ان کی رخصت کے موقع پر بہت سے الوداعی جلسے کیے گئے اور ان میں بہت سی نظمیں پڑھی گئیں اور یہ نظم اس وقت لکھی بھی جا چکی تھی تاہم اس خیال سے کہ اس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک درد انگیز اظہار تھا کسی عام جلسے میں اس کا پڑھنا مناسب نہ سمجھا گیا ۔آپ کی تشریف بری کے بعد دلی تاثرات کی شدت اور بڑھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظم میں بہت سی تبدیلی ہو گئی۔ اقبال"

ڈاکٹر آرنلڈ ۱۹۰۴ء کے اوائل میں لاہور سے لندن چلے گئے جہاں انڈیا آفس میں لائبریرین ہو گئے[۱]۔ ۹ جون ۱۹۳۰ء کو انتقال کیا[۲]

ع۱ اکبر حسین قریشی نے تلمیحاتِ اقبال ص ۲۸۳ پر اس شعر کو مرزا بیدل سے منسوب کیا ہے۔

ع۲ معلوم نہیں یہ شعر کس کا ہے۔

ع۳ یہ شعر امیر مینائی کا ہے (بحوالہ اکبر حسین قریشی ص ۲۸۳)

غزل

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے   نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

---

۱ یوسف سلیم چشتی : شرحِ بانگِ درا ص ۱۲۴۔ سلطانیہ بک ڈپو دہلی ۔

۲ سعید اختر درانی : اقبال یورپ میں (لاہور، ۱۹۸۵ء) ص ۳۲

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ! خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے
اثر غضب کا، دعائے قدح میں ہے ساقی م کوئی اسے بھی ذرا داخلِ نماز کرے
جواب ملتا ہے لولاک ما عرفنا کا م کوئی جو عجز کے دامن کو یاں دراز کرے
پرانے کفر کو تازہ کروں یہ کہہ کہہ کر م مدینہ وہ ہے کہ کعبہ جدھر نماز کرے
مری نگاہ میں، وہ رند ہی نہیں ساقی! جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے
مدام گوش بہ دل رہ، یہ ساز ہے ایسا جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے
شعاعِ نور کو تاریکیِ جہاں میں نہ ڈھونڈ م یہی ہے شمع، اگر دل کو تو گداز کرے
نہیں ہے فرق محبت میں اور غلامی میں م یہ عشق وہ ہے کہ محمود کو ایاز کرے
سخن میں سوز، الٰہی! کہاں سے آتا ہے یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو گداز کرے
تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل جہاں میں وا، نہ کوئی چشمِ امتیاز کرے
غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال!
اُڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

جون ۱۹۰۴ء

حاشیہ۔ یہ غزل مخزن جون، ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔

چاند

اے قمر! کیا خامشی افزا ہے تیری روشنی م رات کے دامن میں ہے گویا سحر سوئی ہوئی
میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موج زن
حسن کامل تیری صورت کا، نشاط انگیز ہے م چاندنی میں تیری اک تسکینِ غم آمیز ہے
قصد کس محفل کا ہے آتا ہے کس محفل سے تو زرد رُو شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو

چاندنی تیری نہیں انسان کی بستی سے دور ؎ گھر بنایا تو نے گو ہنگامۂ ہستی سے دور

ہاں اتر آ میرے دل میں ساتھ لے کر چاندنی
اس اندھیرے گھر میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

آفرینش میں سراپا نور تو، ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن، تیرا ہم قسمت ہوں میں

آہ میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز، داغِ منتِ خورشید سے

ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے

زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو، حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے، سوزاں ہوں میں

میں رہِ منزل میں ہوں، تو بھی رہِ منزل میں ہے
تیری محفل میں جو خاموشی ہے، میرے دل میں ہے

تو طلب خو ہے، تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے

انجمن ہے ایک میری بھی، جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو، تنہا ہوں میں

مہر کا پرتو، ترے حق میں ہے پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل

پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں، تو اور ہے
درد جس پہلو سے اٹھتا ہو، وہ پہلو اور ہے

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو
سیکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے، مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے، جبیں جس سے تری محروم ہے

جولائی ۱۹۰۴ء

حاشیہ - یہ نظم مخزن جولائی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ 'چاند' کے عنوان کی ایک نظم بانگِ درا حصۂ سوم میں بھی ہے۔

ابر

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا

نہاں ہوا جو رخِ مہر زیرِ دامنِ ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر

گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا
عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے — قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے
جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اُٹھے — زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اٹھے
نمودِ ابر سے ہشیار ہو گیا سبزہ — م — اسی کے ہجر میں گویا اداس تھا سبزہ
ہوا کی نم سے ہوئی نرم، سرو کی ٹہنی — م — جو آ کے فاختہ بیٹھی تو جھک گئی ٹہنی
ہلا رہی ہے سرِ شاخِ گل کو موجِ ہوا — م — بنا ہے باغ میں بلبل کے واسطے جھولا
نشیمنوں سے نکل کر پرند گاتے ہیں — م — ہوا سے کھیلتے پھرتے ہیں چہچہاتے ہیں
چمن میں سرو، برائے نماز اٹھتا ہے — م — وضو کرانے کو سقائے ابر آیا ہے
اتر کے آ گئے وادی میں ابر کے ٹکڑے — م — د، یا ہوا سے پریشاں ہیں روئی کے گالے
مری نگاہ میں پھرتا ہے اور ہی نقشا — م — جو دیکھتا ہوں خرام سکوں نما اُن کا
کھڑے ہیں محفلِ قدرت کو دیکھنے والے — م — کسان کھیتوں سے اُٹھ اُٹھ کے جھونپڑوں کو چلے
جفاکشی کا خضر کہیے ان کسانوں کو — م — یہ سبز کرتے ہیں کہسار کی چٹانوں کو
ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل — اٹھی وہ اور گھٹا، لو برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو، وادی میں پھرنے والوں کا

اگست ۱۹۰۴ء

حواشی ۔ ؏۱ رسالہ زمانہ میں نوٹ ہے "ایبٹ آباد میں ایک پہاڑی کا نام ہے۔ اقبال" یوسف سلیم چشتی شرحِ بانگ درا ص ۱۴۶-۱۴۵ میں لکھتے ہیں کہ سربن ایبٹ آباد کے مشرق میں پہاڑ کی چوٹی کا نام ہے جو ۶۲۴۳ فٹ بلند ہے۔ اقبال ۱۹۰۴ء میں ایبٹ آباد گئے تو یہ نظم وہاں بیٹھ کر لکھی جہاں اب میونسپل باغ ہے اور سربن کی چوٹی عین اس کے سامنے ہے

رفیع الدین ہاشمی نے اپنے مضمون "حیات نامۂ اقبال" مشمولہ نقوش، اقبال نمبر ایک، شمارہ ۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۷ء میں ص ۱۲ پر رکھا ہے کہ اقبال اگست ۱۹۰۴ء میں اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے پاس ایبٹ آباد گئے۔

بانگِ درا کی نظم "ابر" قیامِ ایبٹ آباد کی یادگار ہے ۔ یہ پوری نظم جلیل قدوائی کی مملوکہ ایک بیاض میں موجود ہے[1] اشعار کی مندرجہ بالا ترتیب اسی بیاض کے مطابق ہے ۔ پوری نظم زمانہ جون ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی ۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے یہ شمارہ دیکھا ہے ۔ وہ مجھے ۱۱ جون ۱۹۸۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ محذوف اشعار کی تعداد دس ہے ۔ مجھے نو شعروں ہی کا پتا چل سکا ۔

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا، ہم سایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں، اس کی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو — اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا!

اتحاد ۔ ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء

حواشی ۔ حیدرآباد میں عبدالصمد خاں ایک بے نظیر ذاتی کتب خانے کے مالک تھے ۔ اب یہاں سے اپنے بیش بہا ذخیرے سمیت باہر منتقل ہو گئے ہیں ۔ انھوں نے اپنے

---

[1] جلیل قدوائی : اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن مشمولہ ہمایوں لاہور بابت مئی ۱۹۵۱ء ۔ بازاشاعت رحیم بخش شاہین (مرتب) علامہ اقبال کے بارے میں غیر مدون تحریریں ۔ اسلامک پبلکیشنز لمیٹڈ ۔ لاہور ۔ بار اوّل اپریل ۱۹۷۵ء

ذخیرے سے رسالہ اتحاد بابت ۱۶ اراگست ۱۹۰۴ء ص ۴، رسالہ دلگداز نمبر ۸، جلد ۸ بابت ماہ اگست ۱۹۰۴ء ص ۲۴ اور رسالہ مخزن جلد ۸، نمبر ا ص ۴۹ کے عکس مجھے دیے ہیں جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ ان سے اس نظم کے بارے میں مفید معلومات ہوتی ہیں۔

اس نظم کی اشاعتِ اول سے متعلق پہلے دو غلط بیانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

وحید اپنی انگریزی کتاب 'کتابیاتِ اقبال' میں لکھتے ہیں کہ نظم ہمارا دیس مخزن لاہور جلد ۸، شمارہ ۱، ۱ اکتوبر ۱۹۰۱ء ص ۵۰ - ۴۹ پر شائع ہوئی۔

پہلے یہ واضح ہو کہ اصلاً یہ نظم ہمارا دیس کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ وحید صاحب نے سہواً ۱۹۰۴ء کے بجائے ۱۹۰۱ء لکھ دیا ہے۔ مخزن اپریل ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔ معلوم ہوتا ہے چھے شماروں کی ایک جلد بنائی جاتی تھی۔ اس طرح جلد ۸، نمبر ا کے معنی ہوئے اکتوبر ۱۹۰۴ء کا شمارہ۔ یہ نظم صرف ص ۴۹ پر شائع ہوئی۔ ص ۵۰ پر اس سے متعلق کوئی نوٹ رہا ہوگا۔

عبداللطیف اعظمی اپنی کتاب دانائے راز ص ۷، ۲۱ پر اکتوبر ۱۹۰۱ء کے تحت لکھتے ہیں
'مخزن میں مشہور نظم ہمارا دیس (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا) شائع ہوئی (ببلیو گرافی آف اقبال ص ۷)
لیکن اس کے نیچے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں:

"عین طباعت کے وقت معلوم ہوا کہ یہ سنہ غلط ہے، صحیح سنہ ۱۹۰۴ء ہے! مخزن' سے پہلے 'زمانہ' کانپور میں ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۰۷ء میں رسالہ اصلاحِ سخن لاہور کی طرح "ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا" میں شائع ہوئی تھی اس لیے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ ۱۹۰۷ء میں یہ نظم طرح میں کہی گئی تھی۔"
(فٹ نوٹ ص ۲۱۷)

رسالہ آج کل بابت یکم جنوری ۱۹۴۶ء میں محمد عمر (نور الٰہی) صاحب کا مضمون "ہندوستاں ہمارا کی شانِ نزول" شائع ہوا۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۹۰۴ء میں اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرر تھے اور لالہ ہر دیال [مشہور محبِّ وطن جنہوں نے بعد میں امریکہ میں غدر پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ گیان چند] ایک ہر دل عزیز طالب علم تھے۔ اس زمانے میں لاہور میں ایک ہی کلب ینگ مینز کرسچین ایسوسی ایشن (Y M C A) تھا۔ ہر دیال بھی اس کے ممبر تھے۔ کسی بات پر کلب کے سکریٹری سے جھڑپ ہو گئی۔ ہر دیال نے اس کے جواب میں ینگ مینز انڈین ایسوسی ایشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس دن شام کو چھے بجے افتتاحی اجلاس ہونا تھا اس دن سہ پہر کو تین بجے پروفیسر اقبال سے جلسے کی صدارت کی درخواست کی گئی اور انھوں نے مان لیا۔ چھے بجے خطبۂ صدارت دینے کے بجائے انھوں نے ترنم سے یہ نظم پڑھی۔ محمد عمر نے سن کر پنسل سے لکھ لی۔ بعد میں ہوسٹل میں جا کر صاف نقل کی اور شرر کے رسالہ اتحاد میں اشاعت کے لیے بھیج دی۔ جب یہ چھپ کر آئی تو اس پر حسن موہانی (کذا۔ صحیح حسرت موہانی) نے رسالہ اُردوئے معلّٰی میں اعتراض کیے۔ اقبال بہت خفا ہوئے۔ وہ یہ جاننے کو بے تاب تھے کہ رسالے کو نظم کس نے بھیجی ہے جس کے غلط متن کے باعث ان پر اعتراض ہوئے۔ انھیں بھیجنے والے کا نام معلوم نہ ہو سکا۔"

اتحاد میں نظم بغیر عنوان کے دی ہے۔ اس میں ینگ مین انڈین ایسوسی ایشن کا ذکر معلوم ہوتا ہے:

"اس کے ایک جلسہ میں پنجاب کے مشہور و نازک خیال شاعر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے نے ایک مختصر و پرجوش نظم پڑھی جس نے حاضرین پر اتنا اچھا اثر کیا کہ سب کے اصرار سے جلسہ کے افتتاح و اختتام دونوں اوقات میں گا کے سنائی گئی۔ اس نظم سے چونکہ 'اتحاد' کو اپنے مشن میں مدد ملی ہے لہٰذا ہم اپنے پرانے دوست مولوی محمد اقبال صاحب کا شکریہ ادا کر کے درجِ اتحاد کرتے ہیں۔" ص ۴

رسالہ آج کل دہلی اقبال نمبر ۷۷ ۱۹ء میں اس نظم کا متن بخطِ اقبال چھپا ہے اور اس پر ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء تاریخ پڑی ہے۔ اس کا ماخذ نہیں دیا کہ یہ کہاں سے حاصل

ہوا۔ یہی متن حیدرآباد میں منعقدہ عالمی اقبال سمینار اپریل ۱۹۸۶ء کے سووینیر میں دیا ہے اور وہی میرے پیشِ نظر ہے۔ اسی سووینیر کی ایک انگریزی تحریر سے معلوم ہوا کہ ایسوسی ایشن کے افتتاحی اجلاس کے لیے سوامی رام تیرتھ کا ایک مضمون 'ہندوستان کا مسئلہ' بھی حاصل کیا گیا تھا۔ رام تیرتھ ان دنوں امریکہ میں تھے۔ انگریزی تحریر میں لکھا ہے کہ اسوسی ایشن کی پہلی سال گرہ ۱۹۰۳ء میں منائی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ سنہ غلط ہے۔ ۱۹۰۴ء ہونا چاہیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ۱۹۰۴ء کا جلسہ افتتاحی جلسہ نہ ہو بلکہ ایسوسی ایشن کی پہلی سال گرہ ہو۔ افسوس کہ صاحبزادہ محمد عمر نے جلسے کی تاریخ نہیں دی صرف سال دیا ہے۔

مجھے ڈاکٹر اکبر حیدری نے زمانہ ستمبر ۱۹۰۴ء سے اس نظم کے متن کی نقل عنایت کی جو سب سے پہلا متن معلوم ہوتا ہے۔ عبدالصمد خاں نے رسالہ اتحاد ۱۶ راگست ۱۹۰۴ء نیز مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء کے اس نظم کے صفحے کا عکس عنایت کیا۔ ان سب کا مقابلہ کرنے سے اس نظم کی ذیل کی منازل سامنے آتی ہیں۔

زمانہ ستمبر ۱۹۰۴ء۔ اتحاد ۱۶ راگست ۱۹۰۴ء۔ اقبال کے خط میں مورخہ ۱۰ر اگست ۱۹۰۴ء۔ مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء۔ بانگ درا۔

اتحاد اور اقبال کے دستی متن میں خفیف سا فرق ہے۔ مخزن اور بانگ درا کے متن میں ایک ہی لفظ کا فرق ہے۔ یہ فرق اس کتاب کے اختلافِ نسخ کے باب میں شرح کیے گئے ہیں۔ ۱۰ر اگست ۱۹۰۴ء کا دستی متن اتحاد ۱۶ر اگست کے متن سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۶ر اگست کے پرچے میں چھپنے والی نظم ۱۰ر اگست سے بہت پہلے بھیجی گئی ہوگی۔ صاحبزادہ محمد عمر کا خیال ہے کہ اقبال نے یہ نظم جلسے کے دن سہ پہر تین بجے کے درمیان تصنیف کی لیکن جلسے کا متن اتحاد میں چھپا ہے جب کہ زمانہ ستمبر ۱۹۰۴ء کا متن یقیناً اتحاد کے متن سے 'یعنی جلسے کے متن سے' فرسودہ تر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے رسالہ زمانہ کو یہ نظم جلسے سے پہلے ہی بھیجی ہوگی۔ بعد میں اصلاح کرکے جلسے میں پڑھی۔ ممکن ہے

زمانہ کو جولائی کے مہینے میں بھیجی ہوگی۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے میرے نام اپنے مکتوب ۱۱رجون ۱۹۸۶ء میں زمانے کے متن کو ۱۰راگست ۱۹۰۴ء کے متن پر مقدم قرار دیا ہے۔
ایڈیٹر زمانہ نے نظم سے پہلے ایک طویل ستائشی نوٹ لکھا جسے ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے مضمون اقبال کا سفر لکھنو، حقیقت یا افسانہ۔ ہماری زبان ۱۵رمئی ۱۹۸۰ء ص ۳ میں شائع کیا ہے۔ اس نوٹ میں مدیر لکھتے ہیں۔

"انگلستان میں ایسے گیت ہر خاص و عام کی زبان پر ہوتے ہیں ... کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مخدوم پروفیسر اقبال کی یہ نظم جو انھوں نے ہمارے پیارے اور پیارے دیس پر لکھی ہے ملک بھر میں ہر دل عزیز اور مفید ثابت نہ ہو۔ ہمارے نزدیک یہ چھوٹے بڑوں، خاص و عام ہر ایک کے مفید ہونے کی مستحق ہے۔"

پروفیسر سلیم چشتی شرحِ بانگ درا میں ص ۱۳۳ پر لکھتے ہیں کہ اقبال نے یہ ترانہ ۱۰راگست ۱۹۰۴ء کو ایڈیٹر زمانہ کو بھیجا تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ شاید چشتی صاحب نے ۱۰راگست ۱۹۰۴ء کا اقبال کا دستی متن دیکھا ہوگا۔ لیکن وہ تو زمانہ کے متن سے بہت ترقی یافتہ ہے۔

رسالہ دلگداز بابت اگست ۱۹۰۴ء میں رسالہ اردوئے معلّٰی کا تعارف شائع ہوا۔ چونکہ حسرت موہانی اقبال کی زبان پر اعتراض کیا کرتے تھے اس لیے ضمناً مدیر دلگداز نے بھی نظم 'ہمارا دیس' پر حسبِ ذیل الفاظ میں گرفت کی ۔

"۱۶راگست کے اتحاد میں ہمارے قدیم دوست محمد اقبال صاحب کی ایک مختصر نظم چھپی ہے جو ہندو مسلمان کے اتفاق پر ہے ۔ اس کے آخری دو شعروں میں ردیف بگڑ گئی ہے ۔

یہ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری صدیوں سے آسماں ہے نا مہرباں ہمارا
اس میں "ہمارا" کی جگہ "ہم پر" یا " ہمارے حال پر" چاہیے
اقبال اپنا کوئی محرم نہیں جہاں میں معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا
اس شعر میں" ہمارا" کی جگہ "اپنا" چاہیے۔

میں مانتا ہوں کہ اقبال صاحب ملک کے نہایت ہی نازک خیال اور باکمال شعرا میں ہیں اور ایسی دو چار فروگزاشتوں سے ان کا کمال مٹ نہیں سکتا اور نہ یہ کسی کی کوشش ہونی چاہیے کہ ان کے کمالوں پر خاک ڈالے لیکن ان غلطیوں کو بتانا چاہیے تاکہ خود "اقبال" صاحب کو اور دیگر شعرا کو ایسی فروگزاشتوں سے بچنے کا موقع مل سکے۔"

اس پر اقبال نے نظم میں اصلاح کرکے اعتراضات رفع کر دیے اور اصلاح شدہ متن مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء میں چھپوا دیا۔ اس میں اور بانگِ درا کے متن میں صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ میرے سامنے مخزن جلد ۸ نمبر ا، کے ص ۴۹ کا عکس ہے جس میں نظم کا اصلاح شدہ متن ہے۔ نظم کے پہلے مدیر کا ایک نوٹ ہے جو حسبِ ذیل ہے۔

ہمارا دیس

جذباتِ دل کے ایک سینے سے دوسرے پر منعکس ہونے کا بھی عجیب قانون ہے ہمارے دوست نے مندرجہ ذیل اشعار میں ہوبہو وہ خیالات ظاہر کیے ہیں جو وطن سے دور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ اگر میں نظم لکھتا تو لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے کیے ہیں۔ (عبدالقادر)"

میرے پاس مخزن کے ص ۵۰ کا عکس نہیں۔ معلوم ہوتا ہے نظم کے متن کے بعد کسی نے دلگداز کے اعتراضات کا سختی سے جواب دیا ہے۔ حسرت موہانی نے اردوئے معلّٰی نومبر ۱۹۰۴ء میں مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء پر تنقید کی اور لکھا۔

" اکتوبر کا پرچہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض درشت زبان۔ اور ناواقف لوگوں سے قطع نظر کرکے جو نکتہ چینی کا جواب سب و شتم سے دینا چاہتے ہیں اہلِ پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج اور صحتِ زبان کے خواستگار ہیں وہ اپنی غلطیوں کو چھوڑتے جاتے ہیں اور نکتہ چینیوں کی نکتہ چینی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً پروفیسر اقبال صاحب نے ایک غزل کے مقطع میں لکھا تھا ؎

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

دلگداز نے اعتراض کیا کہ اس شعر کے آخر میں "ہمارا" کے بجائے "اپنا" چاہیے اور اقبال نے اب اس کو بدل کر مخزن میں اس طرح چھپوایا ؎

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں   معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

حضرت اقبال کی نظمیں روز بروز زبان کے لحاظ سے صاف ہوتی جاتی ہیں۔ کاش کہ جیسی توجہ اور احتیاط وہ نظم میں کرتے ہیں ویسی ہی نثر میں بھی کرتے کیونکہ ہم افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ اسی پرچے میں ان کے لکچر موسوم بہ قومی زندگی میں بہت سے اغلاط موجود ہیں۔"

اس کے آگے اس لکچر کی زبان پر اعتراضات ہیں۔

ع۵۱ جوش ملسیانی نے اپنی کتاب اقبال کی خامیاں میں اعتراض کیا ہے کہ 'ندیاں' میں د مشدّد چاہیے (ص ۲۳)

غزل

انوکھی وضع ہے، سارے زمانے سے نرالے ہیں		یہ عاشق کون سی بستی کے یارب! رہنے والے ہیں
علاجِ درد میں بھی درد کی لذّت پہ مرتا ہوں		جو تھے چھالوں میں کانٹے، نوکِ سوزن سے نکالے ہیں
بیابانوں میں لے دل! اہلِ دل کی جستجو کیسی	م	کریں جو پیار انساں سے وہی اللہ والے ہیں
پھلا پھولا رہے یارب! چمن میری اُمیدوں کا		جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں
غضب کے من چلے ہیں جنسِ دل کے بیچنے والے	م	یہ بندے، مال کے ساتھ آپ بھی بک جانے والے ہیں
رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی		نرالا عشق ہے میرا، نرالے میرے نالے ہیں
پتا، یوں تو بتاتے ہیں وہ سب کو لامکاں اپنا	م	ہمیں معلوم ہے اے دل! جہاں کے رہنے والے ہیں
پلا دی اس کو کیا مئے ساقیِ بادِ بہاری نے	م	زبانِ برگِ گل پر قطرۂ شبنم کے چھالے ہیں
نہ دیکھ اے دیدۂ خوں بار! دل کو کم نگاہی سے	م	ترے آنسو اسی اُجڑے ہوئے گلشن کے لالے ہیں
٣ نہ پوچھو مجھ سے لذّت خانماں برباد رہنے کی		نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے		ٹھہر جا اے شرر! ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

دعا دیتا ہوں، روتا ہوں، گلہ کرتا ہوں قسمت کا م ہزاروں ڈھنگ اظہارِ تمنا کے نکالے ہیں
الٰہی! کون سا مالی ہے اس دل کے گلستاں کا؟ م امیدوں کے شجر زخموں کے گل داغوں کے لالے ہیں
امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں
نہیں کچھ امتیازِ ما و تو شہرِ محبت میں م نرالا دیس ہے، دستور ہی یاں کے نرالے ہیں
نشانِ ماہِ کنعاں، اے زلیخا! پوچھ لے مجھ سے م کہ میں نے چاہِ دل سے سیکڑوں یوسف نکالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال! کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے، یہ درد انگیز نالے ہیں

۱۹۰۴ء

حاشیہ - یہ غزل دکن ریویو جلد ۲ نمبر ۸ سنہ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ نوادر ص ۶۹ میں اس غزل کا ماخذ 'مخزن' لکھا ہے لیکن سال اور ماہ نہیں درج کیا جس سے شبہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مخزن سے نہیں لیا۔ رسالہ برگِ گل، وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج کراچی اقبال نمبر ۷، ۱۹ء میں عابدہ سلطانہ سوز کا مضمون اقبال اور مخزن ہے اس میں مخزن کے کسی شمارے میں اس غزل کی اشاعت کا ذکر نہیں۔ رزاق اور نوادر کے متن کا مقابلہ کرنے سے صاف دکھائی دیتا ہے کہ نوادر کا ماخذ رزاق ہے گو بظاہر 'مخزن' کیا گیا ہے۔

بلال ؓ

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہس

ستم ہے، شوق کی آتش کو مثلِ موجِ ہوا
"خدا[1] بھلا کرے آزار دینے والوں کا"

نظر تھی صورتِ[2] سلماں[3] ادا شناس تری
شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا
اویس[4]، طاقتِ دیدار کو ترستا تھا

مدینہ، تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا

تری[5] نظر کو رہی، دید میں بھی حسرتِ دید
خنک دلے کہ تپید و دمے نیاسائید

ترے نصیب کا آخر چمک گیا اختر
علی کے سینے میں جو راز تھا، کھلا تجھ پر

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برقِ جلوہ بہ خاشاکِ حاصلِ تو زدند

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

نمازِ عشق حسینِ حجاز ہے گویا
یہی نماز، خدا کی نماز ہے گویا

اذاں، ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز، اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اس کا

ستمبر ۱۹۰۴ء

حواشی - یہ نظم مخزن ستمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ بانگِ درا کے تیسرے حصے میں بلال ہی کے عنوان سے ایک اور نظم ہے۔

؎۱ حضرت بلال حبشی نژاد غلام تھے لیکن مکہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت ابوبکر نے انھیں خرید کر آزاد کردیا۔ زبان میں لکنت تھی لیکن مسجدِ رسول کے مؤذن مقرر ہوئے ۲۰ھ میں شام میں انتقال کیا۔

؎۲ اس مصرع کے واوین میں ہونے کے یہ معنی ہیں یہ کسی اور شاعر کا مصرع ہے۔

؎۳ حضرت سلمان فارسی اصلاً زرتشتی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ مذاہب کی جانچ کرتے

تھے۔ آتش پرستی چھوڑ کر عیسائی ہوئے اور اس کے بعد مسلمان۔ اسلامی نام سلمان ہے۔ رسول نے ان کے لیے کہا "سلمان ہمارے اہلِ بیت میں سے ہیں"۔ ۳۳ھ میں انتقال ہوا۔

۳؎ اویسِ قرنی یمن کے رہنے والے نادیدہ عاشقِ رسول تھے۔ والدہ بوڑھی تھیں۔ یہ شتربانی کرکے ان کی خدمت بجالاتے تھے۔ دیدارِ رسول کے لیے آنا چاہتے تھے لیکن رسول کا حکم ہوا کہ اپنی ضعیف والدہ کی خدمت کرو اور انھیں چھوڑ کر نہ آؤ۔ رسولِ اکرم نے انھیں تابعین میں بہتر قرار دیا ہے۔ حضرت علی اور حضرت معاویہ کی جنگ میں ۳۷ھ میں شہید ہوئے۔

مندرجہ بالا تین بزرگوں کے حالات زیادہ تر ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کی تلمیحات و اشاراتِ اقبال، (علی گڑھ، ۱۹۷۰ء) سے ماخوذ ہیں۔

سرگزشتِ آدم

نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں میں نے   م   ہر ایک چیز میں دیکھا اسے مکیں میں نے
سوالِ دید میں لذت ہے اے کلیم ایسی   م   ہزار بار سنی ہے وہی "نہیں" میں نے
سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے   بھلایا قصۂ پیمانِ اولیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں   پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو   دکھایا اوجِ خیال فلک نشیں میں نے
ملا مزاج تغیر پسند، کچھ ایسا   کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی   کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
کہا کسی نے فسانہ جو عرش و کرسی کا   م   وہ سادہ لوح ہوں میں، کر لیا یقیں میں نے
کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا   چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا   کیا فلک کو سفر، چھوڑ کر زمیں میں نے
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں   دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

کبھی میں قتل ہوا کر بلا کے میداں میں ۔ م ۔ کبھی کسی کو ستم پر بھی آفریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرودِ[2] ربانی ۔ پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے
دیارِ ہند[3] نے جس دم مری صدا نہ سنی ۔ بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
بنایا ذروں[4] کی ترکیب سے کبھی عالم ۔ خلافِ معنیِ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے
اٹھائے تلخیِ انکار[5] میں مزے کیا کیا ۔ م ۔ بنا کے ایک زمانے کو نکتہ چیں میں نے
لہو سے لال کیا سیکڑوں زمینوں کو ۔ جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں[6] میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں[7] کی ۔ اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں ۔ سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں[8] میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر ۔ لگا کے آئینۂ عقلِ دُور بیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں[9] کو، برقِ مضطر کو ۔ بنا دی غیرتِ جنّت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ، رازِ ہستی کی ۔ کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

عجیب طرز[10] ہے کچھ گفتگو ہے واعظ کا ۔ م ۔ خدا بچائے، یہ باتیں سنی نہ تھیں میں نے
وہ چیز، نام ہے جس کا جہاں میں آزادی ۔ م ۔ سنی ضرور ہے، دیکھی کہیں[11] نہیں میں نے
نہ توڑ میرے دلِ دردمند کو ظالم! ۔ م ۔ بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگیں میں نے
خدا تو ملتا ہے، انسان ہی نہیں ملتا ۔ م ۔ یہ چیز وہ ہے کہ دیکھی کہیں کہیں[12] میں نے

عجیب شے ہے صنم[13] خانۂ امیر، اقبال
میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے ۔ م

ستمبر ۱۹۰۴ء

حواشی - یہ نظم مخزن ستمبر ۱۹۰۴ء میں غزل کے طور پر شائع ہوئی تھی۔ بانگِ درا میں اس کے چند اشعار حذف کر کے ایک مربوط نظم کے طور پر پیش کیا۔ بالخصوص ابتدائی دو اور آخری پانچ اشعار جو نظم کے تسلسل میں حائل تھے خارج کر دیے گئے۔ اس نظم

کے مختلف اشعار میں جو تلمیحات آئی ہیں انھیں یوسف سلیم چشتی نے شرح بانگ درا میں ص ۱۳۱ اور اس کے آس پاس نیز ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے تلمیحات و اشارات اقبال میں ص ۱۹۶ تا ۱۹۹ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ دونوں میں بہت کچھ یکساں ہے۔ میں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔

ع۱ جام آخریں : آخری صحیفہ یعنی قرآن۔

ع۲ سرودِ ربانی سے مراد کرشن کی بانسری ہے۔

ع۳ بدھ دھرم

ع۴ چوتھی صدی ق م کے یونانی فلسفی دمیراقطس کا قول تھا کہ کائنات محض ذرّوں کی ترتیب سے بنی ہے۔ اس کا کوئی خالق نہیں

ع۵ قرونِ وسطیٰ میں یورپ میں رومن کیتھولک کلیسا اور حکما کی آویزش کی طرف اشارہ ہے جس میں حکما کے قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہا۔

ع۶ اٹلی کے ماہر فلکیات گلیلیو (GALILEO) ۱۵۶۴ء تا ۱۶۴۲ یا ۱۶۴۳ء، کی طرف اشارہ ہے۔

ع۷ نکولس کوپرنکس (COPERNICUS) ۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ء، نے انکشاف کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ کلیسا نے اس کو قتل کی دھمکی دی۔

ع۸ نیوٹن (۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء) کا نظریہ کہ اجرام فلکی میں کشش ہے۔

ع۹ ڈاکٹر RONTGEN (۱۸۴۵ء تا ۱۹۲۳ء) نے ۱۸۹۵ء میں ایکس رے کی دریافت کی۔ ڈاکٹر مائکل فیراڈے (FARADAY) ۱۷۹۱ء تا ۱۸۶۷ء نے بجلی کی دریافت کی۔

ع۱۰ طرز کو عموماً مونث بولا جاتا ہے۔ اقبال نے مذکر باندھا ہے۔

ع۱۱ معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر میں امیر مینائی کے دیوان صنم خانۂ عشق، کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے مصرع میں صنم خانہ کی رعایت سے خود کو بت پرست کہا ہے۔ اقبال کی ابتدائی غزلیات پر داغ کے علاوہ امیر مینائی کا بھی اثر تھا۔ واضح ہو کہ صنم خانۂ عشق میں اس نظم کی زمین میں کوئی غزل یا شعر نہیں۔

غزل

تمھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

ں تاریکی ہوئی لیکن مجھ میں پوشیدہ وہ گوہر ہے م
جھلک جس کی عیاں ہے اے فلک! تیرے نگینوں میں

قیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

رکچھ آشنا ہوتا مذاقِ جبہہ سائی سے
تو سنگِ آستانِ کعبہ جا ملتا جبینوں میں

بھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں؛
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

بینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

ھے روکے گا تو اے ناخدا! کیا غرق ہونے سے؟
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

میا یا حسن کو اپنے، کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

لا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس اس کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

نا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

تی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انھیں خلوت گزینوں میں

سی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

بت کے لیے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل! حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں؟

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

ہیں لیلیٰ نے شاید دیکھ پائی ہے جھلک تیری م
کہ محمل سے نکل کر جا ملی صحرا نشینوں میں

ایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

ا اے خضرِ محبت! ڈھونڈتا ہوں اس ولایت کو م
جہاں سبزے کی صورت طور اگتے ہیں زمینوں میں

وشش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے، محبت کے قرینوں میں

بُرا سمجھوں انھیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں 'اقبال' اپنے نکتہ چینوں میں

اکتوبر ۱۹۰۴ء کے قریب

حاشیہ ۱ - بیاضِ عماد میں اس غزل کے اوپر لکھا ہے۔

عنوان در صوفی 'شاہ راہِ کامیابی'

معلوم ہوا کہ یہ غزل پنڈی بہا الدین کے رسالہ صوفی میں شائع ہوئی۔ ممکن ہے اس کی اشاعت یہی ہو۔ غزل کے زمانے کے بارے میں محمد عبداللہ قریشی کی کتاب "معاصرینِ اقبال کی نظر میں" سے روشنی پڑتی ہے۔

منشی فوق نے ہندو مسلم صوفیائے لاہور کا ایک تذکرہ 'یادِ رفتگاں' کے نام ۱۹۰۴ء میں لکھ کر شائع کیا۔ عبداللہ قریشی نے اپنی کتاب کے ص ۳۳۴ پر لکھا ہے کہ اقبال نے فوق کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۷ راکتوبر ۱۹۰۴ء میں اس تذکرے کے سلسلے میں لکھا۔

'بھائی فوق۔ خود بھی اس گوہرِ نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانے میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں میں اتفاقیہ مل جاتا ہے'

بقول قریشی اقبال نے اسی کتاب سے متاثر ہو کر یہ غزل کہی۔ غزل کا دسواں شعر خط کے مذکورہ اقتباس کے عین مطابق ہے۔ اس طرح اس غزل کو اکتوبر ۱۹۰۴ء کے لگ بھگ کی قرار دیا جا سکتا ہے۔

غزل

(منسوخ)

۱۔ جو مضموں زندگی میں حرفِ موزوں بن کے نکلے ہیں — وہی طائر بھی آخر گنبدِ مدفن کے نکلے ہیں

۲۔ سبب اے ہم نشینو! کچھ نہ پوچھو میرے رونے کا — یہ ارماں ہیں کہ جو آنکھوں سے آنسو بن کے نکلے ہیں

۳۔ نہ تڑپایا کسی کو تیرے نظارے کے ارماں نے — کہ سارے دیکھنے والے تری چلمن کے نکلے ہیں

۴۔ کبھی اس راہ سے شاید سواری تیری گزری ہے — کہ میرے دل میں نقشِ پا ترے توسن کے نکلے ہیں

۵۔ کیا حیراں فرشتوں کو بھی تیرے دردمندوں نے — خدا جانے، تری محفل سے یہ کیا بن کے نکلے ہیں

۶۔ کوئی کیا جانے، ہے وسعت فزائیاں کی ہوا کیسی — تری درگاہ سے ذرے بیاباں بن کے نکلے ہیں

۷۔ مری جاں! داستاں میری کلیجہ تھام کر سُننا
کہ میرے حال پر آنسو مرے دشمن کے نکلے ہیں

۸۔ مسافر، من چلے ہوتے ہیں کیا راہِ محبت کے!
متاعِ دل کو لے کر واسطے رہزن کے نکلے ہیں

۹۔ کرامت دیکھ اے دستِ جنوں ابادِ محبت کی
عرب میں جا کے پرزے میرے پیراہن کے نکلے ہیں

۱۰۔ انگلستانِ جہاں میں مثلِ بلبل اڑتے پھرتے ہیں
قلم سے شعر گویا میرے، پریاں بن کے نکلے ہیں

۱۱۔ رفو اے بخیہ گر! چاکِ محبت ہو تو کیونکر ہو؟
مرے زخموں پہ آنسو دیدۂ سوزن کے نکلے ہیں

۱۲۔ پسند آئی نہ ان کو سیرِ نخلستانِ ایمن کی
مگر صحرائے یثرب میں وہ کیا بن ٹھن کے نکلے ہیں

۱۳۔ چلے جاتے ہیں سیدھے، پھر ادھر کا رخ نہیں کرتے
جو مثلِ بو نظارے چھوڑ کر گلشن کے نکلے ہیں

۱۴۔ جو اپنی کشتِ زارِ دل کو میں نے اے فلک دیکھا
ستارے بھی ترے، دانے مرے خرمن کے نکلے ہیں

۱۵۔ جنھوں نے مثلِ شبنم اس چمن میں آپ کو دیکھا
وہی عاشق کسی کے چہرۂ روشن کے نکلے ہیں

۱۶۔ تعلّق، پھول ہیں گویا، ریاضِ آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی، یہی دامن کے نکلے ہیں

۱۷۔ پرستش روزِ محشر ڈھونڈتا پھرتا ہے واعظ کو
صنم جو تھے، وہ پتھر وادیِ ایمن کے نکلے ہیں

۱۸۔ تماشا کی جو وسعت، میں نے اپنے دامنِ دل کی
ہزاروں دشت، اک گوشے میں اس دامن کے نکلے ہیں

۱۹۔ وہ مذبوحِ ازل ہوں میں کہ خنجر سب حسینوں کے
پرانے آشنا میری رگِ گردن کے نکلے ہیں

۲۰ مجھے اقبال! اس سیّد[عہ] کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں ہیں[عہ] وہ کچھ بن کے نکلے ہیں

اکتوبر ۱۹۰۴ء

حواشی ۔ اکتوبر ۱۹۰۴ء میں سیالکوٹ سے قاضی حمید الدّین کی ادارت میں ماہ نامہ الکاشف جاری ہوا۔ اس کے پہلے شمارے میں یہ غزل چھپی۔

عہ سیّد سے مراد ان کے استاد سید میر حسن شاہ ہیں۔

موجِ دریا

مضطرب رکھتا ہے میرا دلِ بے تاب مجھے
عین ہستی ہے تڑپ، صورتِ سیماب مجھے

موج ہے نام مرا، بحر ہے پایاب مجھے
ہو نہ زنجیر کبھی، حلقۂ گرداب مجھے

آب میں مثلِ ہوا جاتا ہے[ع۱] توسن میرا
خارِ ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے — جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہ رو کہ محبت ہے مجھے منزل سے — کیوں تڑپتی ہوں، یہ پوچھے کوئی میرے دل سے

زحمتِ تنگیِ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

غنچۂ[ع۲] آب میں گلشن کی تماشائی ہوں — اپنی ہستی کو مٹانے کی تمنائی ہوں
تشنۂ عشق ہوں، محرومِ شکیبائی ہوں — حوصلہ دیکھ کہ میں بحر کی شیدائی ہوں

زندگی جز و کی ہے کُل میں فنا ہو جانا
"درد[ع۳] کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

دکن ریویو نومبر دسمبر ۱۹۰۴ء

حواشی - یہ نظم دکن ریویو حیدر آباد بابت نومبر دسمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ متن کا اس سے مقابلہ کر لیا گیا ہے۔

ع۱ جب نظم رسالہ انسان امرتسر بابت جون ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی، اس پر کسی نقاد لکھنوی نے زمانہ جولائی ۱۹۱۳ء میں تنقید کی لکھا

"بیت کے دونوں مصرعوں میں زمانے کا تخالف پایا جاتا ہے - نہ اٹکا) ذوقِ سلیم کو کھٹکتا ہے۔" اس پر کسی 'شمشیرِ قلم' نے اپنے مضمون 'تنقیدِ نقاد' مشمولہ کتاب 'اقبالیات کے نقوش' مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور طبع اوّل ۱۹۷۷ء میں بڑے سخت الفاظ میں جواب دیا جو ص ۶۹۲ - ۶۹۱ پر ہے۔ اعتراض معمولی تھا۔ جواب سخت ہے شافی نہیں۔

ع۲ اس مصرع پر نقاد نے اعتراض کیا ہے۔
'غنچۂ و گلشن کو اس موقع سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی - بہر حال غنچۂ آب کی ترکیب کوئی معنی نہیں رکھتی،'

شمشیرِ قلم نے پھر سخت الفاظ میں جواب دیا ہے (ص ۶۹۳)

ع۳۵ یہ مصرع غالب کا ہے ۔

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں ؟
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں ؟
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا ؟ — غربت میں آ کے چمکا، گم نام تھا وطن میں ؟
تکمہ کوئی گرا ہے، مہتاب کی قبا کا ؟ — ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں ؟
حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی — لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی — نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب[ع]، یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی — پروانہ کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی
رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو — گل کو زبان دے کر تعلیمِ خامشی دی
نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی — چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی روشنی دی
رنگیں کیا سحر کو، بانکی دلھن کی صورت — پہنا کے لال جوڑا[ع]، شبنم کو آرسی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو — پانی کو دی روانی، موجوں کو بے کلی دی
اک مشتِ گل میں رکھا احساس کا شرارہ م — انساں کو آگہی کیا[ع]، ظلمت کو چاندنی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا، شاعر کا دل ہے گویا — واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیے ہیں، ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے

کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی　　جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

دسمبر ۱۹۰۴ء

حاشیہ - یہ نظم مخزن بابت دسمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔

صبح کا ستارہ

لطفِ ہمسائگیِ شمس و قمر کو چھوڑوں　　اور اس خدمتِ پیغامِ سحر کو چھوڑوں
عارضی حسن ہے دشمن ہے مرا نورِ سحر　　یہ ملا خسروِ خاور کا پیامی بن کر
میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی　　اس بلندی سے، زمیں والوں کی پستی اچھی
آسماں کیا، عدم آباد وطن ہے میرا　　صبح کا دامنِ صد چاک، کفن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا　　ساقیِ موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت، نہ یہ عزت، نہ یہ رفعت اچھی　　اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی
میری قدرت میں جو ہوتا تو نہ اختر بنتا
قعرِ دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا
واں بھی موجوں کی کشاکش سے جو دل گھبراتا　　چھوڑ کر بحر، کہیں زیبِ گلو ہو جاتا
ہے چمکنے میں مزا حسن کا زیور بن کر　　زینتِ تاجِ سرِ بانوئے قیصر بن کر
ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیبا جاگا　　خاتمِ دستِ سلیماں کا نگیں بن کے رہا
ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست　　ہے گہرہائے گراں مایہ کا انجام شکست
زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل　　کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل
ہے یہ انجام اگر زینتِ عالم ہو کر
کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر؟

کسی پیشانی کے[۴] افشاں کے ستاروں میں رہوں
کسی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں رہوں

اشک بن کر سرِ مژگاں سے اٹک جاؤں میں ق[۱]
کیوں نہ[۵] اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں

جس کا شوہر ہو رواں، ہو کے زرہ میں مستور
سوئے میدانِ وغا، حبِّ وطن سے مجبور

یاس و امید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو
جس کی خاموشی سے تقریر بھی شرماتی ہو

جس کو شوہر کی رضا تابِ شکیبائی دے
اور نگاہوں کو، حیا طاقتِ گویائی دے

زرد، رخصت کی گھڑی عارضِ گلگوں ہو جائے
کششِ حسن، غمِ ہجر سے افزوں ہو جائے

لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں
ساغرِ[۶] دیدۂ پرنم سے چھلک ہی جاؤں

صبر کا خون نکل آیا ہو جل کر مجھ میں م ایک طوفان ہو افکار کا مضمر مجھ میں
خاک میں مل کے حیاتِ ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز، زمانے کو دکھاتا جاؤں

دسمبر ۱۹۰۴ء

حواشی - یہ نظم مخزن دسمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ عبداللطیف اعظمی نے اپنی کتاب اقبال دانائے راز (ص ۲۲۰) میں جو مخزن فروری ۱۹۰۴ء لکھا ہے وہ صحیح نہیں۔

علہ بانگ میں اس بند کے دوسرے اور تیسرے شعر کے بیچ 'ق' لکھا ہے جو مخفف ہے قطعہ بند کا۔ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ غزل میں ہر شعر الگ اور آزاد ہوتا ہے۔ نظم میں توقع کی جاتی ہے کہ جملہ اشعار معنوی اعتبار سے مربوط ہوں گے۔ ان کا قطعہ بند ہونا کیا معنی! یہ تو ان کے لیے معمول کی صورت ہے۔

غزل

سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں
ہائے کیا اچھی[۱] کہی ظالم ہوں میں، جاہل ہوں میں

میں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی
جو نمودِ حق سے مٹ جاتا ہے وہ باطل ہوں میں

اے تماشائی! مری پستی کا نظارہ تو دیکھ م اسفلِ عالی نظر ہوں، ناقصِ کامل ہوں میں

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن، گوہر بدست — وائے محرومی خزف چینِ لبِ ساحل ہوں میں

تم نے تاکا دل کو لیکن اف رے شوقِ تیرِ عشق م دل سے کہتا ہے جگر، تو دل نہیں ہے، دل ہوں میں

ہے مری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل — جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں

تجھ سے پوشیدہ ہے لیلیٰ اور ہے لیلیٰ کوئی م کہہ رہا ہے دل ترا، لیلیٰ نہیں محمل ہوں میں

کشتِ آزادی کی بجلی تھی، مری تقلید ہی م پھونک ڈالی اپنی کھیتی، آہ کیا غافل ہوں میں

میں وہی ہوں، کھو گیا تھا جس کا دل روزِ الست م اب نہ پہچانو، تو تم جانو، وہی بے دل ہوں میں

ہے عبث اے برق! تجھ کو میرے حاصل کی تلاش م مجھ پہ آ کر گر، کہ اپنا آپ ہی حاصل ہوں میں

بزمِ ہستی! اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو — تو تو اک تصویر ہے محفل کی، اور محفل ہوں میں

جانتا ہوں جلوۂ بے پردہ ہے کاشانہ سوز م سادگی دیکھو کہ پھر دیدار کا سائل ہوں میں

تخم ریزی جس کی ہنگامِ صدائے کن ہوئی م اس پرانی مزرعِ زرخیز کا حاصل ہوں میں

ڈھونڈتا پھرتا ہے کیا، اقبال! اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں

دسمبر ۱۹۰۴ء

حاشیہ ۱ - یہ غزل سب سے پہلے مخزن دسمبر ۱۹۰۴ء میں چھپی

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا — نانکؒ نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا — سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا — ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے — پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے[1] سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے — میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا — نوحِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا — جنّت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

گوتم کا جو وطن ہے، جاپان کا حرم ہے — عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے
مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے — ہر پھول جس چمن[2] کا فردوس ہے ارم ہے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

فروری ۱۹۰۵ء

حاشیہ۔ یہ نظم اوّل مخزن فروری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کا عنوان 'میرا وطن' تھا۔
۱؎ حضرت معین الدین چشتی اجمیری۔
۲؎ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا اصرار ہے کہ نانک نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے پیرو انھیں غلطی سے غیر مسلم سمجھتے ہیں۔ (شرح بانگ درا ص ۱۲۷)

نیا شِوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو بُرا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
کچھ فکر پھوٹ کی کر، مالی ہے تو چمن کا — بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بِس بھری ہوا نے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو، خدا ہے
خاکِ وطن کا، مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آ غیریت[2] کے پردے اک بار پھر ہٹا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل[3] کی بستی — آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو م اس ہردوارِ دل میں لا کر جسے[4] بٹھا دیں
سندر ہو اس کی صورت چھب اس کی موہنی[5] ہو م اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہو مرادیں
زنّار ہو گلے میں، تسبیح ہاتھ میں ہو م یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں
پہلو کو چیر ڈالیں، درشن ہو عام اس کا م ہر آتما کو گویا، اک آگ سی لگا دیں
آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لے کے اس سے پانی م اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں
ہندوستاں لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے م بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو م آوازۂ اذاں[6] کو ناقوس میں چھپا دیں
اگنی ہے وہ جو نرگن، کہتے ہیں پیت جس کو م دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں[7] جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا م
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت[8] میں ہے

۱۹۰۵ء

حواشی۔ یہ نظم اولاً مخزن مارچ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی اس میں ہمارے متن کا آخری شعر نہ تھا۔ حیدرآباد کے عبدالصمد خاں کے بے نظیر کتب خانے میں ایک رسالہ شاہدِ سخن حیدرآباد جلد ۱، نمبر ۱۲ دسمبر ۱۹۱۳ء کا ہے۔ انھوں نے دکھایا کہ اس میں ایک صاحب محمد عبداللہ عطا، ساکنِ چرکھاری سنٹرل انڈیا نے یہ نظم اپنے نام سے ص ۲۳ تا ۲۵ پر چھاپ دی ہے۔ عنوان بھی نیا شوالہ ہے۔ ہمارے متن کے آخری

شعر کے علاوہ بقیہ تمام متداول اور منسوخ اشعار لیے ہیں۔ ع چہ دلاور است دزدے والی بات ہے۔ اسی رسالے میں اسی طرح پر ایک اور شاعر نذیر تلہری کی نظم "قومی نعرہ" ہے۔

بانگِ درا کے متن میں آخری شعر نیا اضافہ ہے۔ مخزن میں اس کے علاوہ جملہ اشعار تھے۔ وہ سب عطا چرکھاروی نے لے لیے۔

اقبال نے اس نظم میں مذاہب پر وطن پرستی کو ترجیح دی ہے۔ نظم میں حد درجے کی قومی یگانگت ہے لیکن شاعر نے بے احتیاطی کے سبب عدم توازن کا مظاہرہ کیا ہے۔ پہلے بند میں مذہبی مناظرے اور تعریض کا انداز ہے۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا نے اپنی انگریزی کتاب اقبال میں اس نظم پر جو تبصرہ کیا اس کا ترجمہ یہ ہے:

'اقبال کی نظم نیا شوالہ بدبختانہ (UNFORTUNATE) ہے۔ ہندوؤں سے یہ اپیل کرنا کہ وہ اپنی مذہبی نشانیوں کو چھوڑ دیں تاکہ غیر ہندوؤں سے مل سکیں، کیا ایسی ہی اپیل غیر ہندوؤں سے بھی کی جا سکتی ہے کہ اتحاد کی خاطر وہ اپنی رسوم، مذہبی رسوم عبادت کے طریقے اور مذہبی عقائد کو چھوڑ دیں؟'

(سچدانند سنہا: اقبال۔ ص ۱۹۴۔ رام نراین لال الہ آباد ۱۹۴۷ء)

مورتی کے لیے 'بت' کے لفظ میں جو عدمِ احترام اور تحقیر ہے وہ ہندوؤں کے لیے دلآزار ہے۔ یہ منطق کہ بت پرانے ہو گئے اس لیے انھیں چھوڑ دینا چاہیے ایسی ہی ہے جیسے مسلمانوں سے کہا جائے کہ کعبہ پرانا ہو گیا اس لیے اسے چھوڑ دو۔ ع پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے، جیسا اعتراض کر کے اقبال نے علامت کو حقیقت سمجھنے کی غلطی کی ہے۔ غالب نے باریکی سے کہا تھا۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود ۔۔۔ قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

مورتیوں کی پرستش کرنے والا کون سا ہندو، عیسیٰ و مریم کی تصویروں کی تعظیم کرنے والا کون سا عیسائی اور گروؤں کی تصویروں کا احترام کرنے والا کون سا سکھ یہ سمجھتا ہے کہ ان مورتیوں یا تصویروں میں الوہی یا کسی بھی قسم کی طاقت و قدرت ہے۔ ۵۵

انھیں اپنے معبود کی ایک علامت مانتا ہے اور بس۔ اقبال استعارے، علامت، ایمائیت، تمثیل اور پیکر میں ظاہر کو معنیٔ مقصود سمجھ بیٹھے۔

پہلے بند میں کئی مصرعوں میں ہندوؤں پر طنز ہے۔ توازن برقرار رکھنے کے لیے دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی میں مسلمانوں کو بھی لتاڑا ہے۔ یہاں بھی عدمِ توازن ہے۔ اگر یہ کہتے کہ مذہب نے واعظ کو جنگ و جدل سکھایا تب تو بات برداشت کی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ کہنا کہ خدا نے جنگ و جدل سکھایا خدا کے ساتھ زیادتی ہے۔

اگر پہلے بند میں ہندوؤں پر مناظرانہ اعتراض کرکے عدمِ توازن کا ثبوت دیا ہے تو دوسرے بند میں ضرورت سے زیادہ ہندوئیت اختیار کرکے عدمِ توازن دکھایا ہے۔ اس بند میں اقبال ایک قدامت پرست سناتن دھرمی پنڈت یا ظاہر دار برہمن ہوگئے ہیں۔ وطن کو اس حد تک دیوتا بنانا اور اس کی مورتی بنانا بھی بے اعتدالی ہے۔ چنانچہ انھیں بعد میں ان اشعار کو خارج کرنا پڑا کیونکہ ان میں بت پرستی کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھی۔ بہرحال خاص بات یہ ہے کہ اقبال اس نظم میں کسی طرح متعصب یا ہندو بیزار نہیں صرف غیر متوازن اور غیر معتدل ہیں نکتہ چینی میں بھی، عقیدت مندی میں بھی۔

ؑ جوش ملسیانی نے اپنی کتاب 'اقبال کی خامیاں' میں ص ۲۰ پر اعتراض کیا ہے کہ اقبال نے لفظ پریت کو بروزن فعول باندھا ہے حالانکہ ہندی تلفظ کے لحاظ سے بروزنِ فاع (= پیت) باندھنا چاہیے۔

نوعِ انساں کی محبت

(منسوخ)

نوعِ انساں کی محبت میں ہے مذہب کا کمال
امتیاز کاسۂ شیخ و برہمن میں نہیں

خاک اگر ناپاک بھی چھونے سے ہوجائے تو کیا؟
پاک ہے جو چیز وہ آب و گلِ تن میں نہیں

ہندوالے بھی کبھی کہتے تھے جانِ دردمند
وائے حرماں! اب وہ طائر اس نشیمن میں نہیں

یاد ہے تجھ کو کہ تو گل در گریباں تھا کبھی
آج خاشاکِ چمن بھی تیرے دامن میں نہیں

آج کل کے ساقیانِ سامری فن میں نہیں   وہ کرامت، شیشۂ دل جس سے ہو جائے دراز
رونق مے خانہ باقی گردشِ صہبا سے ہے
گردشِ صہبا وصالِ ساغر و مینا سے ہے

حاشیہ۔ یہ نظم روزگارِ فقیر ص ۳۱۸ - ۳۱۷ پر بغیر کسی عنوان کے دی ہے۔ بیاضِ اعجاز سے نقل کی گئی ہوگی۔ یہی باقیات طبعِ سوم ص ۵۲۷ پر ہے۔ حسبِ معمول ماخذ کا حوالہ نہیں دیا لیکن یقینی ہے کہ روزگار سے نقل کی گئی ہے۔ باقیات میں اس کے پہلے مصرع کے الفاظ کو لے کر عنوان بنا دیا ہے۔ نظم کا زمانہ معلوم نہیں۔ اس میں وہ پختگی ہے کہ ۱۹۰۵ء کے بعد کی تصنیف بھی ہو سکتی ہے۔ نیا شوالہ سے معنوی مناسبت کی بنا پر اسے یہاں رکھ دیا ہے۔ نیا شوالہ میں مذہبی تفریق ختم کر کے وطن پرستی کی تلقین کی تھی۔ اس نظم میں ایک قدم اور بڑھ کر پوری نوعِ انسانی کا درس دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظم ان کی ملت پرستی کے دور سے قبل کی ہے۔

داغ

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں   مہدیِ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر   چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر
آج لیکن ہم نوا! سارا چمن ماتم میں ہے   شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے
بلبلِ دہلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں   ہم نوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں
چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن، وہ شوخیِ طرزِ بیاں؟   آگ تھی، کافورِ پیری میں، جوانی کی نہاں
تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے   لیلیِ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز   کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز؟

تھی حقیقت سے نہ غفلت، فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

جو ہر رنگیں نوائی پا چکا جس دم کمال م پھر نہ ہوسکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال
کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر م داغ یعنی وصلِ فکرِ میرزا[2] و دردِ میر
شعر کا کاشانہ، لیکن آج پھر ویراں ہوا م دیدۂ خوں بار پھر منت کشِ داماں ہوا

کم نہیں محشر سے کچھ، ایسی صدا کی خامشی
آہ دل سوزی تو تھی، گو نکتہ[3] آموزی نہ تھی م

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں — اپنے[4] فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں[5]
تلخیِ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے — یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی — سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی
اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بت خانے سے — مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت — ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اُٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں — تو بھی رو اے خاکِ دلی! داغ کو روتا ہوں میں
اے جہاں آباد! اے سرمایۂ بزمِ سخن! — ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن
وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا — آہ[6]! خالی داغ سے کاشانۂ اُردو ہوا
تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں — وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اُٹھ گئے ساقی جو تھے، مے خانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا

آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل — مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل
کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زباں — ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانونِ عالم گیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے، گل چیں کا دنیا سے سفر

اپریل ۱۹۰۵ء

حواشی ۔ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی نے مطالعۂ داغ ص ۱۰۳ مطبوعۂ ۱۹۷۴ء میں داغ کے انتقال کی تاریخ ۱۶ر فروری ۱۹۰۵ء دی ہے جبکہ محمد عبداللہ قریشی نے معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۲۷ پر ۱۴ر فروری لکھی ہے ۔ ظاہر ہے اقبال نے انتقال کے فوراً بعد ہی یعنی فروری ۱۹۰۵ء ہی میں یہ مرثیہ لکھ دیا ہوگا۔ اس کی اشاعت مخزن اپریل ۱۹۰۵ء یادگارِ داغ نمبر میں ہوئی ۔

عـ۱ـہ اشارہ ہے امیر کے مینائی یعنی حضرت شاہ مینا کی اولاد میں ہونے کی طرف (شرحِ بانگِ درا ص ۱۳۹)

عـ۲ـہ میر و مرزا سے عموماً میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا مراد لیے جاتے ہیں لیکن جیسا کہ سرودِ رفتہ ص ۱۲۶ کے فٹ نوٹ میں واضح کیا گیا ہے اقبال نے مرزا سے مرزا غالب مراد لیا ہے ۔ فکرِ میرزا سے یہ ثابت ہو جاتا ہے، سودا دقتِ فکر کے لیے مشہور نہ تھے۔

عـ۳ـہ رثائی نظم میں یہ بیان دینا کہ مرحوم کی شاعری میں 'نکتہ آموزی' نہ تھی کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ شاید اسی لیے اس شعر کو حذف کر دیا۔

عـ۴ـہ جوش ملسیانی نے اپنی کتاب 'اقبال کی خامیاں' میں اعتراض کیا کہ اس شعر کے قوافی میں ایطائے جلی ہے ۔

غزل

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

مانندِ خامہ تیری زباں پر ہے حرفِ غیر
بیگانہ شے پہ نازشِ بے جا بھی چھوڑ دے

لطفِ کلام کیا؟ جو نہ ہو دل میں دردِ [ع۲] عشق
بسمل نہیں ہے تو، تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

شبنم کی طرح، پھولوں پہ رو، اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے عاشقی میں رسم، الگ سب سے بیٹھنا
بت خانہ بھی، حرم بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے

سودا [ع۱] گری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے، دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل [ع۳]
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

شوخی سی ہے سوالِ مکرّر میں اے کلیم!
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

ہاں، اے شرابِ عشق! یہ دن ہیں نمود کے م
ایسی اچھل کہ خلوتِ مینا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

مئی ١٩٠٥ء

حواشی۔ یہ غزل اوّلاً مخزن بابت مئی ١٩٠٥ء میں شائع ہوئی۔

ع۱ یاد کیجیے غالب کا شعر

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

ع۲ و ع۳ جوش ملسیانی نے اپنی کتاب "اقبال کی خامیاں" میں ص ٥٠ پر اعتراض کیا ہے کہ ان دونوں مصرعوں میں "بھی" کی جگہ "ہی" چاہیے۔ "بھی" حرفِ شرکت ہے اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اور کیا چیز چھوڑ دی ہے جس کے ساتھ شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دیا ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ اس غزل کے کئی اشعار کی ردیف میں "بھی" حشو ہو گیا ہے۔ مثلاً نمبر ٣، ٤، ٥، ٧، ١١، ١٢، ١٣ میں۔ پہلے اور دوسرے شعر میں قوافی لیلیٰ، عقبیٰ کے بعد "کو" کی ضرورت تھی۔ اس کے باوجود اس غزل میں کئی اشعار بہت اچھے ہیں۔ مثلاً نمبر ٢، ١٠ اور مقطع۔ شعر نمبر ٢ بیت الغزل ہے۔

رُباعی

(منسوخ)

واعظ! ترے فلسفے سے ہوں میں حیراں | منطق ہے تری نئی، نیا طرزِ بیاں
انسان کے واسطے ہے مذہب، لیکن | تو کہتا ہے، مذہب کے لیے ہے انساں

۱۹۰۵ء

حاشیہ ۔ یہ رباعی سب سے پہلے زمانہ کانپور بابت جون ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی جہاں سے لے کر اسے تبرکاتِ اقبال میں شامل کیا گیا ۔ حیرت ہے کہ باقیات کے کسی اور مجموعے میں نہیں ۔

ایک پرندہ اور جگنو

سرِ شام ایک مرغِ نغمہ پیرا | کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا
چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر | اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر
کہا جگنو نے، او مرغِ نوا ریز! | نہ کر بے کس پہ منقارِ ہوس تیز
تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی | اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
لباسِ نور میں مستور ہوں میں | پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
چہک تیری، بہشتِ گوش اگر ہے | چمک میری بھی فردوسِ نظر ہے
پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی | تجھے اس نے صدائے دلربا دی
تری منقار کو گانا سکھایا | مجھے گلزار کی مشعل بنایا
چمک بخشی مجھے، آواز تجھ کو | دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز | جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز
قیامِ بزمِ ہستی ہے انھیں سے | ظہورِ اوج و پستی ہے انھیں سے

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

جولائی ۱۹۰۵ء

حواشی ۔ یہ نظم مخزن جولائی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ رزاق میں ص ۱۲۳ پر اس نظم سے پہلے ایک نوٹ ہے کہ یہ نظم انگلستان کے شاعر ولیم کوپر کی نظم 'اے نائٹ انگیل اینڈ گلوورم' سے ماخوذ ہے لیکن حسن الدین احمد نے سازِ مغرب حصہ سوم حصہ انگریزی ص ۱۰۰-۱۱ پر اس کی ماخذ انگریزی نظم دی ہے اور اس کا مصنف ورڈس ورتھ کو ظاہر کیا ہے جو صحیح نہیں ۔ ڈاکٹر سید حامد حسین[1] استادِ انگریزی بھوپال نے اس نظم کو ولیم کوپر ہی کی لکھا ہے ۔ انگریزی نظم کا متن کتاب کے آخر میں ضمیمے میں دیا جا رہا ہے ۔ یہ اصلاً THE NIGTINGALE AND GLOW WORM, A FABLE کے عنوان سے ولیم کوپر کے مجموعۂ منظومات ۱۷۸۲ء میں چھپی[2]

بچہ اور شمع

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلکِ پروانہ خو
شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو

یہ مری آغوش میں بیٹھے ہوئے جنبش ہے کیا
روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا؟

اس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے
یہ کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے

---

[1] ڈاکٹر سید حامد حسین ، اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں مجلہ سیفیہ یادگارِ اقبال نمبر جلد ہفتم ۷۸-۱۹۷۹ء بھوپال ص ۶۷ تا ۶۹

[2] BILL HUTCHIN : THE POETRY OF WILLIAM COWPER PP 117-118, GROOM HELM, LONDON, 1983
مجھے یہ حوالہ میری یونیورسٹی کے صدر شعبۂ انگریزی ڈاکٹر وشونا تھن نے فراہم کیا۔

شمع اک شعلہ ہے، لیکن تو سراپا نور ہے
آہ! اس محفل میں یہ عریاں ہے، تو مستور ہے
دستِ قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا
تجھ کو خاکِ تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا
نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقابِ آگہی
ہے غبارِ دیدۂ بینا حجابِ آگہی
زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے، بے ہوشی ہے یہ

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
حسن، کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضوگستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت، شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں
ساکنانِ صحنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے
ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس
حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

۱۹۰۵ء

حاشیہ- یہ نظم مخزن ستمبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدہ کا یہ زیروبم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن، کہاں کھڑا ہوں میں

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لیے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روزِ تیز گام چلا
شفق نہیں ہے، یہ سورج کے پھول ہیں گویا
کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منارِ خواب گہہِ شہسوارِ چغتائی
فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل
کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل
نظارہ موج کو پھر وجہِ اضطراب ہے کیا!
م یہ کہنہ مشق، تو آموزِ پیچ و تاب ہے کیا؟

مقام کیا ہے، سرودِ خموش ہے گویا
شجر یہ، انجمنِ بے خروش ہے گویا
نمازِ شام کی خاطر، یہ اہلِ دل ہیں کھڑے
مری نگاہ میں، انسان پابہ گل ہیں کھڑے م

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے، ملاح جس کا گرم ستیز
سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور گئی
جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں، نہاں ہے یونہیں

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

شائع شدہ نومبر ۱۹۰۵ء

حاشیہ ۱- نقوش اقبال نمبر ا شمارہ ۱۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء میں رفیع الدین ہاشمی کا مضمون حیات نامۂ اقبال ہے۔ اس کے ص ۱۲ کے مطابق اقبال یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو لاہور سے یورپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے روانہ ہوئے۔ مندرجہ بالا نظم کے تیسرے شعر میں لکھا ہے کہ وہ راوی کے کنارے کھڑے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نظم اگست ۱۹۰۵ء تک لکھ دی گئی ہوگی۔ یہ مخزن نومبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔

التجائے مسافر

(بہ درگاہِ حضرت محبوبِ الٰہی، دہلی)

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو، وہ نام ہے تیرا — بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے، تیری کشش سے ہیں قائم — نظام مہر کی صورت، نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی — مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
ترے وجود سے روشن ہے راہِ منزلِ شوق م دیارِ عشق کا مصحف، کلام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی — بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا
خروشِ میکدۂ شوق ہے ترے دم سے م طلب ہو خضر کو جس کی وہ جام ہے تیرا
کرم، کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال م مرید پیرِ نجف ہے، غلام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زارِ تو ام
وگر کشادہ جبینم، گلِ بہارِ تو ام

کیا ہے تیرا مقدر نے، مدح خواں مجھ کو م کہے ہزار مبارک، مری زباں مجھ کو
چڑھا کے پھول، مرے رنگِ رفتہ کے سرِ قبر م اڑائے پھرتی ہے حیرت کہاں کہاں مجھ کو
بیاں کروں تپشِ عشق کو، تو آتشِ دل م شرارے دے، پئے تمہیدِ داستاں مجھ کو
میں تفتہ دل، ہوں پرانا نیاز مند ترا م دکھایا آج خدا نے یہ آستاں مجھ کو
مرے سفینے کو تو نے کنارہ بوس کیا م اماں نہ دیتا تھا جب بحرِ بے کراں مجھ کو
چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل — ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
تلاشِ مہر میں شبنم صفت اڑا کے، چمن م ذرا سا دیتا ہے، غنچے کا آشیاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
نظر ہے ابرِ کرم پر، درختِ صحرا ہوں — کیا خدا نے، نہ محتاجِ باغباں مجھ کو
فلک نشیں، صفتِ مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

رہوں میں خادمِ خلقِ خدا، جیوں جب تک م نہیں ہے آرزوئے عمرِ جاوداں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو
گریز، میرے دلِ دردمند کا ہے شعار م بہت ستاتا ہے اندیشۂ زیاں مجھ کو
بنایا تھا جسے، چن چن کے خار و خس میں نے چمن میں پھر نظر آئے وہ آشیاں مجھ کو
پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی رہے گا مثلِ حرم، جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو
وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجھ کو
مرا وہ یار بھی، معشوق بھی، برادر بھی م کہ جس کے عشق سے جنت ہے یہ جہاں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو
یونہی بنی رہے محفل مرے احبا کی م ہرا بھرا نظر آئے یہ بوستاں مجھ کو
بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا م ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو
قسم ہے اس کے دلِ دردمند کی آقا م تری ثنا کے لیے حق نے دی زباں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی، دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اشاعت اکتوبر ۱۹۰۵ء

حواشی۔ یہ نظم مخزن بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کی شانِ نزول اقبال کے دوست سید غلام بھیک نیرنگ نے بڑے ادبی رنگ سے بیان کی ہے جو رزاق کی کلیات، باقیاتِ اقبال سوم اور عبداللطیف اعظمی کی داناے راز میں موجود ہے۔ صرف اعظمی نے اس بیان کے ماخذ کی نشان دہی کی ہے۔ یہ مخزن اکتوبر ۱۹۰۵ء میں

ص ۴۹ تا ۵۲ پر چھپا ہے جس کے بعد نظم درج ہے۔ بیان کا خلاصہ یہ ہے۔ ولایت جانے کے لیے اقبال ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ساتھ میں نیرنگ اور شیخ محمد اکرام (جو اس وقت مخزن کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے) انھیں دہلی تک چھوڑنے آئے تھے۔ اسٹیشن پر خواجہ حسن نظامی اور منشی نذر محمد اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس نے ان کی پذیرائی کی۔ یہ سب منشی نذر محمد کے مکان پر مقیم ہوئے۔ کچھ دیر بعد اقبال اور ان کے دوست خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر پہنچے۔ اقبال نے احباب سے درخواست کی کہ وہ باہر صحن میں ٹھہرے رہیں اور خود عالمِ تنہائی میں مزار کے سرہانے بیٹھ کر یہ نظم پڑھی۔ بعد میں دوستوں کے اصرار پر اقبال نے صحن میں بیٹھ کر مزار کی طرف منھ کر کے یہ نظم دوبارہ پڑھی۔

چونکہ اقبال یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو لاہور سے چلے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نظم کی تخلیق اگست ۱۹۰۵ء میں ہوئی ہوگی۔

عـ۱ـہ جیسا کہ عبداللطیف اعظمی نے اقبال۔ دانائے راز ص ۳۳ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے، اس شعر میں ان کی نظم برگِ گل کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے لاہور سے بھیج کر درگاہ میں پڑھوائی تھی۔

عـ۲ـہ ان کے استاد سید میر حسن شاہ۔

عـ۳ـہ بڑے بھائی شیخ عطا محمد۔

عـ۴ـہ نظام الدین اولیا کے مزار کے سامنے کی دیوار پر اقبال کے تین اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو اشعار نظم برگِ گل کے ہیں اور تیسرا اس نظم کا یہ شعر ہے۔ (اعظمی ص ۳۵)

قطعہ[۱] (منسوخ)

قطرے کے منھ سے نام جو تیرا نکل گیا ۔۔۔ بادل سے گر کے روئے ہوا پر سنبھل گیا
عظمت[۲] ہے خاص، پاک مدینے کی خاک کو ۔۔۔ خورشید بھی گیا تو وہاں سر کے بل گیا

ستمبر ۱۹۰۵ء

حاشیہ - یہ قطعہ روزگار ص ۱۱۱ ۳ نیز باقیات ص ۲۷۰ پر دیا ہے - اقبال یورپ جاتے وقت جس وقت ۷ ستمبر ۱۹۰۵ء کو عدن کے پاس سے گزرے تو اس وقت کی کیفیت اپنے دوست مولوی انشا اللہ خاں مدیر 'وطن' کے نام ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کے خط میں لکھی - یہ پورا خط عبداللطیف اعظمی نے اپنی کتاب 'اقبال دانائے راز' میں ص ۲۷ تا ۴۷ پر درج کیا ہے - اس کے مطابق اقبال نے عدن کے قریب یہ شعر کہا :

اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرو   خورشید بھی گیا تو ادھر سر کے بل گیا

(اعظمی ص ۴۷)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی سرگزشتِ اقبال میں بھی یہ شعر دیا ہے - مندرجہ بالا قطعے میں اس کی ترمیم شدہ شکل ہے -

---

غزل

مثالِ پرتوِ مے طوفِ جام کرتے ہیں   یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں
خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم! تری   شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں
نیا جہاں کوئی اے شمع! ڈھونڈیے کہ یہاں   ستم کشِ تپشِ ناتمام کرتے ہیں
عجب تماشا ہے مجھ کافرِ محبّت کا   م   صنم بھی سن کے جسے رام رام کرتے ہیں
ہوا جہاں کی ہے بیکار آفریں کیسی !   م   کہاں عدم کے مسافر قیام کرتے ہیں!
نظارہ لالے کا تڑپا گیا مرے جی کو   م   بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں
رہینِ لذّتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرار   م   یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں
بھلی ہے ہم نفسو! اس چمن میں خاموشی   کہ خوش نواؤں کو پابندِ دام کرتے ہیں
غرض نشاط ہے، شغلِ شراب سے جن کی   حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں
بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ!   کہ ہم تو رسمِ محبّت کو عام کرتے ہیں
الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا!   کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں
میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں   جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری پستی سے ؎ نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں
ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو! جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں
نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیونکر ؎ پسندان کو وزیرِ نظام کرتے ہیں
جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

۱۹۰۵ء

حواشی - اقبال سفر یورپ کے سلسلے ص ۲۳ ستمبر ۱۹۰۵ء کو فرانس کے شہر مارسیلز پہنچے۔ اس سے پہلے بحر روم میں کچھ دن جہاز کا سفر کیا تھا - ۲۱ ستمبر کے قریب اٹلی کے قریب سے گزرے ہوں گے جیسا کہ آخر سے تیسرے شعر میں اشارہ ہے، اسی زمانے میں یہ غزل کہی - لندن سے ۲۵ نومبر کو اپنے دوست مولوی انشاء اللہ خاں، ایڈیٹر وطن کو ایک طویل خط لکھا جس میں یہ غزل شامل ہے - عبداللطیف اعظمی کے مطابق یہ خط اخبار وطن ۲۲ ر دسمبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا (دانائے راز ص ۵۱) اس کے علاوہ یہ خطوطِ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ہندوستانی ایڈیشن دہلی ۱۹۷۷ء ص ۱۰۰ میں بھی شامل ہے۔ اس پورے خط کو عبداللطیف اعظمی نے دانائے راز میں ص ۴۷ تا ۵۳ پر شائع کیا ہے -

-یہی غزل کچھ اشعار کے حذف کے ساتھ دکن ریویو بابت ستمبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی - ظاہر ہے کہ اسے اقبال نے جلد از جلد ستمبر کے آخر میں حیدرآباد بھیجا ہوگا - اس زمانے میں ڈاک پانی کے جہاز سے جاتی تھی - اکتوبر کے آخر میں یہ خط حیدرآباد پہنچا ہوگا اور رسالے کا شمارہ نومبر میں شائع ہوا ہوگا گو اس پر تاریخ ستمبر ۱۹۰۵ء دی ہوئی ہے -

۱؎ جوش ملسیانی نے اپنی کتاب 'اقبال کی خامیاں' ص ۸ - ۷ پر اس شعر پر کئی اعتراض کیے ہیں 'اے شمع' کے ساتھ فعلِ امر 'ڈھونڈ' آنا چاہیے نہ کہ 'ڈھونڈیے' 'ستم کش تپش ناتمام' کی ترکیب ایک معمہ ہے - 'کرتے ہیں' کے فاعل کا پتا نہیں -

عہ۲ یہ مصرع غالب کے اس مصرع پر مبنی ہے۔

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو؟ اک گو نہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

عہ۳ عبداللطیف اعظمی لکھتے ہیں:

"اس نظم کے بعد اقبال نے توسین میں لکھا مازنی اٹلی کے محسنین کا سرگروہ تھا۔ یہ شعر اس وقت لکھا گیا جب کہ اس ملک کا ساحل نظر کے سامنے تھا۔"

(دانائے راز ص ۵۲)

یوسف سلیم چشتی نے شرحِ بانگِ درا ص ۲۴۳ پر لکھا ہے کہ اس کے نام کا صحیح تلفظ 'مزینی' ہے۔ ضرورتِ شعری کی وجہ سے 'مازنی' باندھا گیا ہے۔ وہ ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۲ء میں جیل میں وفات پائی۔

عہ۴ وزیرِ نظام سے مراد مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد ہیں۔

عورت

(منسوخ)

چاند کی لے کر گولائیعہ۱، سانپ کا پیچ اور خم
گھاس کی پتّی کی ہلکی تھرتھراہٹ بیش و کم
بیدِ مجنوں کی نزاکت، بیل کے بل کی کجی
بانکپن طاؤس کا، نرمی گلِ کہسار کی
پیارے پیارے بھولے بھولے دیدۂ آہوئے چیں
جن پہ ہو رقص شعاعِ نورِ خورشیدِ جبیں
ابر سے آنسو، صبا سے بے وفائی لے اُڑا
سہم خرگوش اور چیتے سے لیا جور و جفا
سرد مہری یخ نے دی، سختی ملی الماس سے
تابتانِ آہنی دل کا دل سنگیں بنے
طوطیِ گلزار نے رنگینیِ منقار دی
قمریِ بے زار نے شیرینیِ گفتار دی
روزِ اوّل سے ودیعت نور کا جوبن ہوا
پرِ بلبلعہ۲ کا اضافہ اس پہ ہلکا پن ہوا
گندھ گندھا کر یہ مصالحہعہ۳ جب اکٹھا ہو گیا
دستِ قدرت نے بنایا ایک ڈھانچہ نور کا
آگ کا جوبن ہوا اور نور کی صورت بنی
شکل عورت کی بنی، کیا موہنی مورت بنی

حواشی۔ یہ نظم محض قلمی کلام اقبال میں ہے۔ ظاہرا مرتبِ بیاض نے کسی رسالے سے نقل کی ہوگی جس کا ہمیں علم نہیں۔ اس نظم میں عورت کو مختلف عناصر سے ترکیب دے کر بنایا گیا ہے۔ یہی نسخہ اس کے بعد آنے والی نظم 'محبت' کا ہے۔ جس کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ نظم 'عورت' کے خالق بھی اقبال ہو سکتے ہیں لیکن اس نظم میں اتنی فنی کمزوریاں ہیں کہ یہ ۱۹۰۵ء کی نہیں ہو سکتی۔ کئی سال پہلے کی ہونی چاہیے۔ محض نظم 'محبت' سے مماثلت کے سبب معذرت کے ساتھ یہاں دی جا رہی ہے۔

اس سے پہلے میں نے یہ نظم 'چشمۂ آفتاب' مرتبہ مصلح الدین سعدی، اقبال اکیڈیمی حیدرآباد میں اپنے مضمون 'کلام اقبال کی بیاض سے کچھ نیا کلام' میں شائع کی ہے۔ وہاں قرأت کے کچھ اختلافات ہیں۔ اب کی بار بیاض کو غور سے دیکھ کر صحیح قرأت دی ہے۔

ذیل میں تین فنی خامیوں کی نشان دہی کی جا رہی ہے۔

ع۱ے گولائی کی واؤ ساقط ہو رہی ہے جو جائز نہیں۔ بآسانی کہا جا سکتا تھا 'چاند کی گولائی لے کر' ممکن ہے شاعر نے اسی طرح کہا ہو۔

ع۲ے 'پر' کی 'ر' کو مشدد باندھا ہے جس کا جس کا کوئی جواز نہیں۔ بیاض کا کاتب اضافت کو یائے مجہول سے لکھتا ہے۔ مثلاً پہلے شعر میں 'طوطے گلزار' اور 'رنگینے منقار' لکھا ہے۔ یہاں "پرّے بلبل" لکھا ہے۔ اگر "پرے بلبل کے اضافہ" ہوتا تو یہ عیب دور ہو جاتا۔

ع۳ے وزن کا تقاضا ہے کہ یہاں اس لفظ کو 'مسالہ' لکھا جائے۔

محبّت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے

قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلّم سے

ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے

سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیا گر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے

لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ — چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی — وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب — تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے
پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں — چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے
چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا — اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی — حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی — ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں — مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے
مہوس نے یہ پانی ہستیِ نوخیز پر چھڑکا — گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں، ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا — گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

جنوری ۱۹۰۶ء

حاشیہ: یہ نظم مخزن جنوری ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے نظم عورت میں اسی طرح بہت سے عناصر کا آمیزہ کر چکے ہیں۔ وہ نقشِ اول تھا، یہ نقشِ ثانی ہے۔

پیام

اس نظم کے منسوخ اور متداول متون میں اتنا فرق ہے کہ دونوں کو الگ الگ دینے میں سہولت ہے۔ منسوخ متن کا عنوان پیغامِ راز تھا۔

پیغامِ راز
(منسوخ)

کیونکر نہ وہ جہان کو پیغامِ بزمِ راز دے — غم کی صدائے دل نشیں جس کا شکستہ ساز دے
قسمت سے ہو گیا ہے تو ذوقِ تپش سے آشنا — پروانہ وارِ بزم کو تعلیمِ سوز و ساز دے

اس عشقِ خانہ سوز کا شانِ کرم پہ ہے مدار
یاں قیدِ کفر و دیں نہیں جس کو وہ بے نیاز دے

غافل تجھے خبر نہیں لذّت فراغ میں ہے کیا
دنیا ادا پہ کر فدا، عقبیٰ بہائے ناز دے

مانندِ شمع نور کا، ملتا نہیں لباس اسے
جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جاں گداز دے

بکتا نہیں جہان میں ارزاں متاعِ کافری
قیمت میں اس کی خرقہ دے، تسبیح دے، نماز دے

پابندِ یک صنم نہ ہو، ہر لحظہ نو نیاز رہ
پوجا کو اس روش سے تو پیرہنِ نیاز دے

تارے میں وہ، قمر میں وہ، بجلی میں وہ، شفق میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

رفعت ہے عجز میں نہاں یعنی نیاز کر شعار
وہ محوِ ناز ہے اگر، تو بھی جواب ناز دے

ہو شوقِ سیرِ گل اگر، ایسا چمن تلاش کر
ہر غنچے کی چٹک جہاں لطفِ نوائے راز دے

محفل جو تھی بدل گئی ساقی! تجھے خبر بھی ہے
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

پیرِ مغاں! فرنگ کی مئے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

فروری ۱۹۰۶ء

حواشی ۔ مخزن فروری ۱۹۰۶ء میں اس نظم سے پہلے کے ادارتی نوٹ کا اقتباس یہ ہے۔
شیخ محمد اقبال صاحب کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرنٹی کالج میں پہنچے ہیں۔ اپنے نئے مشاغلِ علمی میں بے حد مصروف ہو گئے ہیں . . . . خدا بھلا کرے شیخ نذر محمد صاحب بی۔ اے (اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقۂ دہلی) کا، کہ ان کے ایک خط نے ذیل کے اشعار کہلوائے یہ گویا ان کے خط کا جواب ہے۔ معلوم نہیں انھوں نے خط میں کیا کیا لکھا تھا جس کے جواب میں یہ رنگین شعر نکلے ہیں۔ اس وقت ہم رازدار نہیں محض پیغامبر ہیں ہاں اتنا جانتے ہیں۔ ع۔ یہی اشعار زبانوں پہ ہیں رہنے والے[1]
یہ منشی نذر محمد اقبال کے وہی دوست ہیں جو اقبال کے یورپ جاتے وقت دہلی میں میزبان ہوئے تھے۔ مخزن میں اقبال کا جواب غزل کے انداز میں تھا

---

[1] ماخوذ از بیاضِ عماد ص ۸۷ - ۸۶

چنانچہ رزاق ، بیاض اور نوادر میں یہ غزلیات ہی کے ضمن میں ہے۔ پیغام کے لحاظ سے یہ عجب منتشر اور ٹوٹا پھوٹا ہے۔ اس میں کوئی مربوط پیغام ہے ہی نہیں ۔

اس منسوخ متن میں عجیب عروضی بازی گری بلکہ نٹ گری ہے ۔ اس کا بنیادی وزن مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن ہے۔ اقبال نے عروضی کتابوں میں پڑھ لیا ہوگا کہ مفتعلن کی جگہ مستفعلن یا مفاعلن یا مفعولن بھی لا سکتے ہیں۔ اقبال اس بات کو لے اُڑے۔ انھوں نے اپنی عروض دانی دکھانے کے لیے تین نظموں : پیغام راز' طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام' کوشش ناتمام میں کئی مصرعوں میں یہ کرتب دکھایا۔ اس وقت وہ یہ سمجھے کہ عربی عروض کی رو سے اس کا جواز ہو سکتا ہے لیکن عروض کی علت غائی ترنم یا موزونیت اس سے عنقا ہو جاتی ہے۔ بعد میں انھیں شعور ہوا تو بانگ درا میں ایسے سب مصرعوں میں اصلاح کر دی یا انھیں یک قلم خارج کر دیا۔ بانگ میں ان تینوں نظموں میں ایک بھی مصرع میں مفتعلن کی جگہ غیر مترنم زحافات والے ارکان نہیں لائے گئے۔ دیکھیے طلبۂ علی گڑھ کالج حاشیہ

مندرجۂ بالا غزل یا نظم 'پیغام راز' کی اچھی بھلی صورت بانگ درا میں حسب ذیل روپ میں نکھر آئی ۔

پیام

(متداول متن)

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا — بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے
شانِ کرم پہ ہے مدار عشقِ گرہ کشائے کا — دیر و حرم کی قید کیا' جس کو وہ بے نیاز دے
صورتِ شمع ' نور کی ملتی نہیں قبا اسے — جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جاں گداز دے
تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہِ سحر میں وہ — چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے
عشق بلند بال ہے رسم و رہِ نیاز سے — حسن ہے مستِ ناز اگر تو بھی جوابِ ناز دے
پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر — اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزمِ کہن بدل گئی — اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

حقیقتِ حُسن

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تونے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیّر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے، حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی، اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا، سوگوار گیا

مارچ ۱۹۰۶ء

حواشی ۔ یہ نظم مخزن مارچ ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ رزّاق بیاض اور کلام میں بھی ہے۔ ان میں اس کا عنوان 'حسن اور زوال' ہے۔ مخزن میں اس سے پہلے اقبال کا ایک نوٹ تھا جو رزاق ص -- اسے نقل کیا جاتا ہے ۔

" اصلی خیال جرمن نثر میں دیکھا گیا۔ میں نے ناظرین کے لیے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُردو نظم میں منتقل کر دیا ۔ اقبال "

بانگ میں اس نظم کا عنوان بدل کر حقیقتِ حسن کر دیا گیا۔ رزاق، بیاض، کلام اور بانگ میں کوئی اختلافِ متن نہیں۔

غزل

زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے، رم کے سوا کچھ بھی نہیں
گل تبسّم کہہ رہا تھا زندگانی کو، مگر
شمع بولی، گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں
آنسوؤں کی سبحہ گردانی سے ہے پیری میں کام م
صبح کے دامن میں شبنم کے سوا کچھ بھی نہیں

زائرِ کعبہ سے' اقبال! یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

حاشیہ۔ قلمی کلام حصّۂ دوم میں ص ۳۹ پر اس غزل پر 'راز ہستی' عنوان دیا ہے۔

عله اقبال نے ۲۷ جنوری ۱۹۱۶ء کو اکبر الہ آبادی کے ع فائے بر ہستی اگر مقصودِ ہستی ہو چکا' کی تعریف کرتے ہوئے لکھا 'میں نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر لکھا تھا' اور اس کے بعد اس شعر کو نقل کیا (اقبال نامہ جلد دوم ص ۵۱ - ۴۹ بحوالہ معاصرینِ اقبال کی نظر میں ص ۱۶۵)
اس غزل کا زمانہ معلوم نہیں۔ بانگِ درا میں اس کے مقام کی بنا پر اسے یہاں درج کیا گیا ہے

غزل

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری' مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

ملا محبّت کا سوز مجھ کو تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو' تری کوئی انجمن نہیں ہے

یہاں کہاں ہم نفس میسّر' یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا' کہاں کا جانا' فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری' کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

م جہاں میں سب کچھ ہے اک علاجِ قضائے چرخِ کہن نہیں ہے
ہے سلطنت جس کی دفن دلّی میں خود وہ کابل میں سو رہا ہے

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال! جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں' انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

حاشیہ۔ یہ غزل صرف بانگِ درا اور قلمی کلام میں ملتی ہے۔ مقطع سے پہلے کا شعر صرف نذرگار میں ص ۳۰۴ پر ہے جو انھوں نے بیاضِ اعجاز سے لیا ہوگا۔ معلوم نہیں اس شعر میں کس کی طرف اشارہ ہے۔ اقبال نے پہلی بار اکتوبر ۱۹۳۳ء میں افغانستان کا سفر کیا غزل میں اس محذوف شعر کے مقام کا علم بھی نہیں۔

عله اس شعر میں اقبال نے پہلی بار وطنیت کو چھوڑ کر ملّت پرستی دکھائی ہے۔ غزل کا زمانہ معلوم نہیں لیکن اس سے اگلی غزل اپریل ۱۹۰۶ء کی ہے اس لیے یہ اس سے قبل کی ہونی چاہیے۔

غزل

(منسوخ)

نظارۂ کہکشاں نے مجھ کو عجیب نکتہ یہ کل سمجھایا
ہزار گردش رہی فلک کو مگر یہ تارے بہم رہے ہیں

کوئی غرورِ شہنشہی سے یہ جا کے میرا پیام کہہ دے
کہ اس زیاں خانے میں سکندر رہے نہ دارا نہ جم رہے ہیں

قفس میں ہم اے صفیرا! اگلی شکایتوں کی حکایتیں کیا
خزاں کا دورہ ہے گلستاں میں نہ تو رہا ہے نہ ہم رہے ہیں

اگر تمنا ہو عافیت کی خدا سے بیگانگی نہ کرنا
جہاں میں تیرے ستم سے ایمن طیورِ بامِ حرم رہے ہیں

حاشیہ- غزل کے یہ چار اشعار روزگارِ فقیر ص ۲۵۴ سے ماخوذ ہیں۔ باقیاتِ اقبال طبعِ سوم میں ص ۵۹۸ پر بظاہر روزگار سے لے کر لکھے گئے ہیں۔ ان کا زمانہ معلوم نہیں۔ ان کی پختگی نیز پچھلی غزل کے مقطع اور موجودہ غزل کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع کی مماثلت کے پیشِ نظر اسے یہاں جگہ دی ہے۔ پچھلی غزل کے مقطع کے مصرعِ اول نیز اس غزل کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع کا جزوِ اول "جا کے میرا پیام کہہ دے" ہے۔ زیرِ نظر غزل سے پہلے کے ایک اور بعد کی دو غزلیں ایک ہی طویل وزن میں ہیں۔ اس طرح مسلسل چار غزلوں کا ایک ہی وزن ہے۔ ممکن ہے عرصے تک شاعر کی طبیعت میں اشعار اسی وزن میں ڈھل کر جلوہ گر ہو رہے ہوں۔

غزل

زمانہ دیکھے گا، جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے، گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے "سفر سے قائم ہے شان میری"
گہر یہ بولا "صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا"

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل، وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز، رہ کے پانی میں، عکس سروِ کنارِ جو کا

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے، نگار خانہ ہے آرزو کا

کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسمِ ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسمِ خاکی، غبار تھا کوئے آرزو کا

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں، تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا "اتنا بے درد کیوں ہے انساں؟
تری نگاہوں میں ہے تبسّم شکستہ ہونا مرے سبو کا"

ریاضِ ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں، تو عیب ہے میرے عیب جو کا

سپاس شرطِ ادب ہے، ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے، وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

اُڑایا ذوقِ تپش پتنگے سے شمع سے شوقِ اشک باری م
کہیں سے سیکھی نمازیں نے لیا کہیں سے سبق وضو کا

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو، گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

جو چاک میرے جگر کے دیکھے، کلی نے بادِ صبا کو پوچھا م
یہ آدمی ہے کہ گل ہے؟ منّت پذیر ہے سوزنِ رفو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رختِ سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا؟

جو گھر سے اقبال دور ہوں میں، تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر، وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

اپریل ۱۹۰۶ء

حاشیہ - یہ غزل مخزن اپریل ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔

غزل

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری کنارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلّم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں، وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں، میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

سکوں نا آشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یا رب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں

مرے پہلو میں دل ہے یا کوئی آئینہ جادو کا؟ م
تری صورت نظر آئی مجھے اپنے نظارے میں

جو نکلی نالہ بن کر غنچۂ منقارِ بلبل سے م
وہی نکہت، چمن سے اڑ کے جا چمکی ستارے میں

نہاں تھا تُو، تو روشن تھا چراغِ زندگی میرا ۔ مگر موجِ نفس پوشیدہ تھی تیرے نظارے میں
اتارا میں نے زنجیرِ رسومِ اہلِ ظاہر کو ۔ ملا وہ لطفِ آزادی مجھے تیرے سہارے میں
صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال! میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

دسمبر ۱۹۰۶ء

حاشیہ ۔ درگا سہائے سرور جہاں آبادی نے مخزن جولائی ۱۹۰۶ء میں ایک نظم فضائے برشگال اور پروفیسر اقبال" شائع کی جس میں اقبال سے تقاضا تھا کہ وہ کوئی نئی تخلیق پیش کریں۔ اس پر اقبال نے یہ غزل کیمبرج سے بھیجی ۔ یہ مخزن دسمبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ اس سے قبل ایڈیٹر کا نوٹ تھا جس میں اقبال کے خط کا یہ اقتباس شامل ہے۔
"گو مصروفیت کا ابھی وہی عالم ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ حضرت سرور جنہوں نے خاموشی کو توڑنا چاہا ہے کہیں ناراض نہ ہو جائیں، اس لیے ان کی نظم کے شکریے میں بہر دست یہ غزل بھیجتا ہوں ۔ امید ہے کہ عنقریب کچھ اور بھی بھیجوں گا"

قطرۂ اشک

(منسوخ)

پانی برس کے دھوتا ہے جب چہرۂ زمیں ۔ پھٹتا ہے آسمان پہ پردہ سحاب کا
اس پردہ سے نکلتا ہے مہرِ جہاں فروز ۔ نقشہ دکھاتا ہے صدفِ دُرِّ ناب کا
قطرے فضا میں، چند معلق ہیں آب سے ۔ پڑتا ہے ان پہ عکس رخِ آفتاب کا
قوسِ قزح کی چادرِ رنگیں کو اوڑھ کر ۔ پیرِ فلک دکھاتا ہے عالم شباب کا
فرطِ طرب سے محفلِ قدرت ہے جھومتی ۔ چھاتا ہے کائنات پہ نشہ شراب کا
سب مست ہو کے گرتے ہیں آغوشِ خواب میں
کرتے ہیں، یعنی، سجدہ خدا کی جناب میں
پہلو سے اُٹھے دردِ محبت کی جب گھٹا ۔ ہوتا یہی ہے حال دلِ داغ دار کا

بادل امنڈ امنڈ کے برستے ہیں آنکھ سے ڈھلتا ہے چہرہ سینۂ ہنگامہ زار کا
رہتا ہے ایک قطرہ معلق جو آنکھ میں پڑتا ہے اس میں عکس کسی شہسوار کا
آتا ہے حسن قوسِ قزح جھوم جھوم کے بندھتا ہے چرخِ دل پہ سماں خلدزار کا
آئینہ وار سینہ چمکتا ہے نور سے جلوہ دکھاتا ہے فلکِ زرنگار کا
کرتی ہیں دل میں رقص تمنا کی شوخیاں
ہوتی ہیں آشکار محبت کی خوبیاں

اے طفلِ اشک! اے مری الفت کی آبرو اے وہ کہ جس سے پایہ ہے برتر مجاز کا
مدت سے بزمِ عشق ہے ویراں پڑی ہوئی شعلہ بجھا ہے مشعلِ سوز و گداز کا
وقفِ خزاں ہوا چمنستانِ آبرو نغمہ نہیں وہ بلبلِ ہنگامہ ساز کا
وہ دل کہ جس میں جلوے تڑپتے تھے رات دن ہر تار اب شکستہ ہے اس دل کے ساز کا
ظلمت سرا بنی ہے شبستانِ آرزو جلوہ نہیں دل میں مرے جلوہ ساز کا
آباد آکے کر مری چشمِ خیال کو
میں تجھ سے دیکھتا ہوں کسی کے جمال کو

حواشی - یہ نظم صرف کلامِ اقبال میں پائی جاتی ہے۔ مرتبِ بیاض محمد انور خاں نے جگہ جگہ سے اقبال کے کلام کی نقل کی ہے۔ یہ نظم بھی کسی رسالے سے کی ہوگی۔ اس کی ذیل کی خصوصیات اس کے اقبال کی تصنیف ہونے پر دال ہیں۔

۱۔ ترکیب بند میں ہر بند کے شروع میں مطلع ہونا ضروری ہے۔ صرف اقبال نے یہ اجتہاد کیا کہ ترکیب بند کے پہلے شعر کو بھی غیر مقفیٰ رکھا مثلاً نظم عاشقِ ہرجائی، ایک آرزو، سرگزشتِ آدم، کوششِ ناتمام، عبدالقادر کے نام، نوعِ انساں کی محبت۔ قطرۂ اشک کی بھی یہی صورت ہے۔

۲۔ اس سے پہلی غزل کا ایک شعر ہے:

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

اس نظم کا قطرۂ اشک بھی محبت کا نتیجہ ہے، کسی اور دکھ درد کا نہیں۔ ع اے طفلِ اشک!

اے مری الفت کی آبرو- اور شاعر اس سے سوزش کی طلب کرتا ہے -

ع شعلہ بجھا ہے مشعلِ سوز و گداز کا

گویا یہ نظم معنوی اعتبار سے اقبال کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ اسی زمانے کی ہے جب اس سے پہلے کی غزل شرارے میں، کہی۔

غزل

(منسوخ)

لاکھوں طرح کے لطف ہیں اس اضطراب میں — تھوڑی سی دیر اور ہو خط کے جواب میں
زلفِ دراز، حسن پہ یوں طعنہ زن ہوئی — تیری طرح سے ہم نہ رہیں گے حجاب میں
حسرت بھری نظر کو جو ساقی نے رد کیا — ڈوبی غریب شرم سے جا کے شراب میں
کیوں وصل کے سوال پہ چپ لگ گئی تمھیں؟ — دو چار گالیاں ہی سنا دو جواب میں
اچھا ہوا، یہیں سے نکیرین چپ ہوئے — کچھ بات بڑھ چلی تھی سوال و جواب میں
آئینہ رکھ کے سامنے زلفیں سنوار تو — تیری بلا سے، کوئی رہے پیچ و تاب میں

تابِ نظارۂ رخِ روشن نہیں مجھے
جب بے نقاب تم ہو تو ہوں میں نقاب میں

دسمبر ۱۹۰۶ء

حواشی - یہ غزل اوّل "نشتر"، دسمبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی - اس غزل کا چوتھا اور چھٹا شعر داغ کے رنگ کا ہے۔ حیرت ہے اقبال نے ۱۹۰۶ء میں ایسے اشعار کہے ہوں گے۔

غزل

(منسوخ)

چمن ہے اپنا دلِ داغ دار، لالوں کا — بھلا ہو دونوں جہاں میں ستانے والو
سُنا ہے، صورت سینا نجف میں بھی لے دل! — کوئی مقام ہے غش کھا کے گرنے والو

مجھے حقیقت دیارِ لندن کی یہ اک جہان ہے گویا پری جمالوں کا
ولی بھی، رند بھی، شاعر بھی، کیا نہیں اقبالؔ؟
حساب ہے کوئی کم بخت کے کمالوں کا؟

میں - یہ چار اشعار روزگار ص ۲۵۶، ۲۵۵ پر شائع ہوئے ہیں - مرتب نے لکھا ہے -
' خیال غالب ہے کہ لندن میں کہے گئے '
یہی اشعار باقیات سوم ص ۵۸۸ پر ہیں -

فرد

(منسوخ)

حق میں آزادوں کے ہے قیدِ تعلق کیمیا بن گئی گوہر، جو موجِ آب زندانی ہوئی

میں - یہ شعر روزگار ص ۳۰۵ سے لیا گیا ہے - اس کا زمانہ معلوم نہیں -

تضمین

(منسوخ)

صحنِ گلشن سے ہوں گو میں آشیاں برباد دور
لالہ و گل سے نہیں میرا دلِ ناشاد دور
شبنمے را کز محیطِ بے کراں افتاد دور
در کنارِ لالہ و آغوشِ گل آرام نیست

میں - یہ چار مصرعے روزگار ص ۳۱۱ پر درج ہیں - وہیں سے لے کر باقیات سوم ص ۶۰۷ پر دیے گئے ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے دو مصرعوں پر مشتمل فارسی شعر کسی اور کا ہے جس پر دو اُردو مصرعے لگا کر بشکلِ مربع تضمین کی ہے - صحنِ گلشن سے دوری اشارہ ہو سکتا ہے وطن سے دوری کی جانب - اس کا زمانہ معلوم نہیں لیکن قیامِ یورپ ہی کا ہونا چاہیے -

سوامی رام تیرتھ

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے تاب تو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہرِ نایاب تو
آہ کھولا کس ادا سے تونے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو
مٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا
نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا
چشمِ نابینا سے مخفی معنیٔ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیمِ خام ہے
توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کا دارو[۱] ہے گویا مستیٔ تسنیمِ عشق
کیا کہوں زندوں سے میں اس شاہدِ مستور کی
دار کو سمجھے ہوئے ہیں جو سزا منصور کی ؎

جنوری ۱۹۰۷ء

حواشی۔ یہ نظم مخزن جنوری ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔

۱۔ جوش ملسیانی نے اپنی کتاب اقبال کی خامیاں ص ۵ پر اعتراض کیا کہ دارو مونث ہے لہٰذا مذکر باندھنا غلط ہے۔

انگریزی کتاب 'پنجاب کے عظیم ہندو' میں پنڈت رام لال تارہ نے سوامی رام تیرتھ پر سوانحی مضمون لکھا ہے۔ اس کا طویل خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

"سوامی رام تیرتھ کا اصلی نام تیرتھ رام تھا۔ یہ گاؤں مراری والا ضلع گجرانوالہ کے گوسائیں ہیرا نند کے گھر ۱۸۷۳ء میں دیوالی کے دن پیدا ہوئے۔ گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھنے کے بعد گجرانوالہ میں مقیم والد کے دوست بھگت دھنا رام کی نگہداشت میں بھیج دیے گئے۔ تیرتھ رام نے دھنا رام کو اپنا گرو مانا۔ اپریل ۱۸۸۸ء میں تیرتھ رام نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ صوبے میں ۳۸ واں مقام ملنے کی وجہ سے انھیں ناامیدی ہوئی۔ مئی ۱۸۸۸ء میں انھوں نے فارمن کرسچین کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ مالی وسائل نہ تھے۔ انھوں نے ایک روپیہ مہینہ پر ایک چوبارہ کرائے پر لیا۔ انھیں کچھ روپیہ دھنا رام

بھیج دیتے تھے، کچھ ٹیوشن پڑھا کر حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے ایف اے معمولی نتیجے کے ساتھ پاس کیا۔ ان کا زیادہ وقت مذہب، روحانیت اور مراقبے میں گزرتا تھا۔ معاشی جدوجہد سے ان کی صحت پر اثر پڑا اور وہ بی اے میں فیل ہو گئے۔

انھیں بھگوان کرشن کی سانولی رنگت سے تعلق کی وجہ سے کالے رنگ سے عشق تھا۔ ایک دفعہ یہ راوی کے کنارے گھوم رہے تھے کہ اپنے راستے میں ایک کالے ناگ کو دیکھا۔ یہ پذیرائی کے لیے ہاتھ پھیلا کر دوڑ پڑے کہ میرے پربھو تو جس روپ میں بھی آئے، میں تجھے خوش آمدید کہتا ہوں، اسی موقع پر انھیں حال آگیا اور وہ وہیں گر پڑے۔ بعد میں انھوں نے اپنی تعلیم پر توجہ دی۔ رات کو سڑک کے بجلی کے کھمبے کی روشنی میں پڑھنے لگے اور مارچ ۱۸۹۳ء میں بی اے فرسٹ ڈویزن میں پاس کیا۔ اس کے بعد[1] گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے میں داخلہ لیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ روحانی مدارج میں ترقی کرنے لگے۔ لوگ ان کے لیکچر سننے کو آتے تھے۔ یہ باربار رہائش گاہ تبدیل کرتے تھے۔ لالہ رام سرن داس (بعد میں آنریبل رائے بہادر) کے اصرار پر ان کی کوٹھی میں آگئے اور انھیں پڑھانے لگے۔

۱۸۹۵ء میں سوامی رام تیرتھ نے ریاضی میں ایم اے پاس کیا اور کرسچین کالج میں عارضی لیکچرر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر ایونگ انھیں پسند کرتے تھے۔ ایک بار کالج ہال میں ان کا لکچر کرایا گیا۔ اس میں انھوں نے دعویٰ کیا۔

'ایک بار میں عیسیٰ مسیح بن کر پیام دینے آیا تھا۔ مجھے غلط سمجھا گیا اس لیے میں دوبارہ حاضر ہوا ہوں۔

اناالحق قسم کے اس دعوے پر مسیحی لوگ ناراض ہوئے اور انھیں کالج سے برطرف کر دیا گیا۔ انھوں نے انگلستان میں مزید تعلیم کے لیے اسکالرشپ کی درخواست دی

---

[1] واضح ہو کہ ۱۸۹۳ء میں اقبال نے انٹرنس پاس کر انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا تھا۔ اس طرح تیرتھ رام گورنمنٹ کالج میں اقبال سے چار سال سینیر تھے۔

لیکن وہ منظور نہ ہوئی۔ تب یہ مرے کالج سیالکوٹ میں پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ لیکن ایک سال کے بعد پھر فارمن کرسچین کالج میں ریاضی کے سینیر پروفیسر ہو کر واپس آگئے۔

ان کی اہلیہ، بیٹا مدن موہن اور بھتیجا ان کے ساتھ رہتے تھے لیکن یہ تنہا نظر آتے تھے۔ گھنٹوں آنکھیں بند کیے مراقبے میں بیٹھے رہتے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے۔ ایک دفعہ یہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہردوار، رشی کیش اور ہمالیہ تک گئے اور بہ مشکل واپس آنے کو تیار ہوئے۔ کچھ دنوں بعد پھر ہردوار گئے اور آخر کار گھر بار تیاگ کر سنیاس لے لیا، تب جپ کرنے لگے۔ ملک کے طول و عرض میں لوگوں کو ویدانت کا درس دیتے پھرے۔ پھر خیال آیا کہ ویدانت کا نور ملک کے باہر بھی پھیلانا چاہیے۔ چنانچہ یہ امریکہ چل دیے۔ جب ان کا جہاز امریکہ پہنچنے کو تھا تو پڑوس کے ایک مسافر نے پوچھا کہ تم امریکہ میں کسی کو جانتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا 'ہاں میرا ایک دوست ہے جو وہاں میرا تمام انتظام کرے گا۔' ہمراہی نے پوچھا 'وہ کون ہے؟' انھوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا 'وہ تم ہو' چنانچہ یہی ہوا۔ اس اجنبی ہمراہی نے امریکہ میں ان کی میزبانی کی۔

سوامی جی نے امریکہ کو ویدانت کی روشنی سے خیرہ کر دیا۔ امریکیوں میں ان کی مقبولیت دیکھ کر مسیحی پادریوں کو ان سے حسد ہونے لگی۔ انھوں نے ہنگامہ کھڑا کرنا چاہا لیکن ناکام ہوئے۔ امریکہ سے واپس آکر یہ رشی کیش کے پاس لکشمن جھولا آگئے۔ وہاں سے اپنے گرو دھنا رام کو نومبر ۱۹۰۶ء میں خط لکھا کہ "آپ اور میں ایک ہیں۔ مزید کچھ لکھنے کو نہیں ہے۔" یعنی وہ پوری طرح ہمہ اوستی ہو گئے تھے۔ نومبر ۱۹۰۶ء میں دیوالی کے دن کٹ گھاٹ کے پاس وہ گنگا میں نہانے کے لیے داخل ہوئے۔ پہاڑی ندی میں سیلاب آیا ہوا تھا، موجیں زوردار تھیں۔ سوامی جی پانی میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ کنارے سے چیلے چلّائے کہ آگے نہ جائیے لیکن یہ بڑھتے رہے اور وسط دریا میں پہنچ کر غائب ہو گئے۔ تین دن تک ندی میں ان کے جسد خاکی کی تلاش کی گئی، نہ ملا۔ لوگوں نے سوچا کہ لاش بہہ کر نیچے چلی گئی ہوگی، لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب تین دن کے

بعد ان کا جسدِ خاکی عین اسی مقام سے برآمد ہوا جہاں وہ غرقاب ہوئے تھے۔ وہ سمادھی کے آسن میں تھے، آنکھیں بند تھیں۔ روح خالق کے پاس چلی گئی تھی۔"[۱]

ان کی موت کے بارے میں معاندانہ اور معتقدانہ ہر قسم کے بیانات ملتے ہیں۔ پہلے مخالفانہ بیانات ملاحظہ ہوں:

اقبال نے نظم میں تو سوامی رام تیرتھ کو یہ خراجِ عقیدت پیش کیا لیکن نثر میں وہ کچھ اور کہتے ہیں۔

پروفیسر خواجہ عبدالحمید اپنی کتاب یادِ اقبال میں ص ۷۱ پر لکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے رام تیرتھ کی سوانح لکھی تو اقبال سے بھی ان کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ سوامی جی برھم چریہ کے پرچار کے لیے امریکہ گئے۔ وہاں ایک مریدنی ضرورت سے زیادہ فیض یاب ہوئی تھیں۔ واپسی پر سوامی جی اس عورت اور بچے کو امریکہ ہی چھوڑ آئے۔ وہ برھم چریہ کو نباہ نہ سکے اور بجائے اس کے کہ وہ غلط تعلیم اور غلط اصول کو چھوڑتے، انھوں نے اپنی ناکامی کو چھپانا چاہا۔

راقم الحروف کو اس بیان پر حیرت ہوتی تھی۔ اقبال کی نظم کے پیشِ نظر ایسا لگتا تھا کہ پروفیسر خواجہ عبدالحمید نے تحقیق کیے بغیر ایک بازاری گپ درج کر دی ہے لیکن اقبال کے نثری بیان کی توثیق ایک اور ذریعے سے ہوئی۔ حال میں مجھے جناب ایس۔ایل۔پراشر ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ کالج آف آرٹ، چنڈی گڑھ ملے۔ یہ صاحب ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں ایم۔اے انگریزی کیا۔ کالج کے دنوں میں اکثر اقبال کے پاس جا بیٹھتے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اقبال نے ان سے

---

[۱] Pt. RAM LAL TARA, "SWAMI RAM TIRATH" INCLUDED IN PANJAB'S EMINENT HINDUS (NEW BOOK SOCIETY PUBLISHERS, P.B 47, 1ST ED. DEC 1943) PP12 TO 126 [PP 121 TO 126]

اس مضمون کا عکس مجھے کالی داس گپتا رضا نے فراہم کیا۔

کہا تھا کہ سوامی رام تیرتھ کے ایک امریکی خاتون سے ناجائز تعلقات تھے۔ اسی کے احساسِ جرم GUILT COMPLEX کی وجہ سے انھوں نے دریا میں ڈوب کر خودکشی کرلی۔

یہ بات کو ایک قدم اور آگے بڑھانا ہے۔ امریکہ میں مسیحی پادری سوامی رام تیرتھ سے حسد کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بہتان تراشی کی ہوگی جسے اقبال اپنی نجی صحبتوں میں بیان کرتے تھے۔ اگر رام تیرتھ کے بارے میں ان کی یہی رائے تھی تو اظہارِ زاری کے لیے منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی

سید نذیر نیازی نے اپنی کتاب دانائے راز میں رام تیرتھ کے حالات میں لکھا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں امریکہ سے واپسی کے بعد گنگا کے کنارے ایک غار میں رہتے تھے۔ ایک روز دریا میں لیٹے تھے۔ پانی کا ایک ریلا آیا اور انھیں بہا لے گیا۔

یہ ایک عجیب بیان ہے۔ میں نے رشی کیش اور لکشمن جھولا دیکھا ہے۔ وہاں کوئی غار نہیں۔ دریا میں لیٹنا کیا معنی؟ بعض ہستیوں کے بارے میں طرح طرح کی روایات مشہور ہوجاتی ہیں۔ مختلف راوی ان میں رنگ آمیزی کردیتے ہیں۔ اب تین عقیدت مندانہ بیانات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے پنڈی داس کی سوانح عمری 'سوامی رام تیرتھ' سے لے کر ان کے حالات لکھے ہیں:

"۲۰ راکتوبر ۱۹۰۶ء کو وہ اپنے معمول کے مطابق ہردوار گئے تھے۔ ایک دن اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ دریائے گنگا کے کنارے بیٹھے ہوئے ویدانت کا درس دے رہے تھے۔ دفعتاً انھوں نے غسل کا ارادہ کیا اور تیرتے ہوئے دور نکل گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان پر اسی حالت میں رام کی محبت کا آغاز ہوا اور عین دریا میں جذب و مستی کی حالت طاری ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لہروں میں ڈوب گئے۔ تین دن کے بعد ان کی نعش خود بخود کنارے پر آگئی۔"[۱]

۱۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی، تلمیحات و اشاراتِ اقبال (انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۷۰ء) ص ۳۵۲

یوسف سلیم چشتی شرح بانگِ درا میں بالکل یہی بات تقریباً انھیں الفاظ میں کہتے ہیں ان کے یہاں اضافہ یہ ہے کہ عین دریا میں سمادھی لگا دی اور غرقاب ہوگئے۔

عابد علی عابد نے بھی تلمیحات اقبال میں یہی بیان دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ایک دن تیرتے ہوئے گنگا میں دور تک نکل گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حالت جذب و مستی میں وہ نذرِ آب ہوگئے اور انھوں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش نہیں کی ہے[1]

مشہور محقق کالی داس گپتا رضا کے والد سوامی رام تیرتھ سے ملے ہیں۔ رضا صاحب اپنے والد مرحوم سے روایت کرتے ہیں کہ سوامی رام تیرتھ طغیانی زدہ ندی میں تیرتے ہوئے آگے بڑھے جارہے تھے۔ کنارے سے چیلوں نے شور کیا کہ آگے نہ بڑھیے، خطرہ ہے۔ سوامی جی نے جواب دیا "مجھے تو ہر طرف برہم ہی دکھائی دیتا ہے۔" اور وہ مزید آگے بڑھ گئے اور غرقاب ہوگئے۔

ان کے چیلے نارائن سوامی ان کے ساتھ امریکہ گئے تھے اور واپسی پر بھی ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ انھوں نے رام تیرتھ کی سوانح حیات لکھی ہے جسے سوامی رام تیرتھ مشن نے لکھنؤ سے ۱۹۴۳ء میں شائع کیا۔ اندرجیت لال نے اُردو میں ایک کتابچہ 'سوامی رام تیرتھ' لکھا جو ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے ص ۴۷ پر نارائن سوامی کے حوالے سے رام تیرتھ کی موت کا حال دیا ہے جسے سب سے مستند سمجھنا چاہیے۔ اندرجیت لال نے مجھے ۲۳ر اپریل ۱۹۸۶ء کے خط میں اس کا خلاصہ لکھا۔ نارائن سوامی رام تیرتھ کے آخری دن ان کے ساتھ تھے۔ رشی کیش میں پانی میں نہاتے ہوئے رام تیرتھ پتھر سے پھسل کر دریا میں غوطہ کھانے لگے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ گنگا کا پانی اب بے قابو ہوکر سر کے اُوپر سے بہنے لگا ہے تو زور سے بولے 'اگر تیری قسمت میں اس طرح مرنا تھا تو یہی

---

[1] ص ۳۲-۳۱ بحوالہ توقیر احمد خاں "اقبال اور سنسکرت" مشمولہ فکر و فن سہ ماہی شملہ بابت مئی جولائی ۱۹۸۶ء ص ۲۷

نارائن سوامی لکھتے ہیں "مجھے ہر لمحے کے وقفے کے بعد اوم کی آواز آہستہ آہستہ سنائی دی اور سوامی رام کا جسم منجدھار میں زور شور سے بہنا شروع ہو گیا۔ جوں جوں ان کا جسم بہتا گیا۔ سوامی رام توں توں اپنے آپ کو سمیٹتے گئے اور اپنے کو دھیان میں لین کرتے گئے لیکن بے سود۔ نعش جب گنگا کے بیچ میں سے کنارے پر لائی گئی تو سوامی رام کا جسمِ مبارک بالکل سمادھی کی حالت میں تھا۔ دونوں بازو سیدھے دونوں گھٹنوں پر، اور آلتی پالتی لگائے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند اور گردن کھڑی تھی۔ منھ اس طرح کھلا تھا گویا اس لمحہ سوامی رام کے ہونٹ اوم اوم بولتے دکھائی دے رہے ہوں"۔

تو حقیقت یہ ہے کہ سوامی رام تیرتھ نہاتے ہوئے پھسل کر ندی میں گر پڑے اور ڈوب گئے۔ لاش سمادھی کی حالت میں تھی اس میں عقیدت مندانہ مبالغہ ہو سکتا ہے۔

درگا سہائے سرور کی نظم 'نوحۂ وفاتِ سوامی رام تیرتھ' زمانہ فروری ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ نظم نوائے سرور مرتبہ ڈاکٹر حکم چند نیر (بنارس ۱۹۶۷ء) میں شامل ہے۔ اس میں ایک شعر ہے:

آشنا بحرِ حقیقت کا ہے ایسا کون سا　　　ہو گیا دریا میں، دریا مل کے قطرہ کون سا؟

منوّر لکھنوی نے سوامی رام تیرتھ پر اپنی نظم میں کہا:

گنگا کی گود میں ہے اب تک سمادھی اس کی　　　اب تک مقام اس کا 'بام ہمالیہ' ہے

اندر جیت لال مطلع کرتے ہیں کہ کرپال سنگھ مہاراج کے لڑکے درشن سنگھ کی نظم کا ایک شعر ہے:

کس کو ملتے ہیں بھلا ایسے خوش اقبالی کے دن　　　زندگی، سنیاس، اور نروان دیوالی کے دن

رام تیرتھ ۱۸۷۳ء میں دیوالی کے دن پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۰ء میں دیوالی کے کے دن سنیاس لیا اور ۱۹۰۶ء میں دیوالی کے دن انتقال کیا۔

غزل

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا، وہ راز اب آشکار ہوگا

گزر گیا اب وہ دور ساقی! کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان مے خانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خار زار ہوگا

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیرِ مے خانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

جنھوں نے میری زبانِ گویا کو محشرستانِ صدا کا جانا
م مرا وہ دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوتِ مزار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

کہا جو قمری سے میں نے اک دن، یہاں کے آزاد پا بہ گل ہیں
تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

نہ پوچھو اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ راہگزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

مارچ ۱۹۰۷ء
حاشیہ - یہ غزل مخزن مارچ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی - ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے

سرگزشتِ اقبال ص ٦٦ (لاہور ۱۹۷۷ء) میں اس غزل کو ۱۹۰۸ء کی لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔

بیاضِ عماد میں اس غزل کی ابتدا میں نوٹ ہے۔

"معارفِ ملت جلد اول میں اس غزل کا عنوان 'مژدہ' دیا ہے۔"

طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام

(منسوخ متن)

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
غربت کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

مرغانِ زیرِ دام کے ہنگامے سُن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

مستورِ مے درونِ جام، پرتوِ مے برونِ جام
اِس کا مقام اور ہے، اُس کا مقام اور ہے

یوں تو پلانے آتے ہیں محفل کو ساقیانِ ہند
لیکن انھیں خبر نہیں، یہ تشنہ کام اور ہے

جس بزم کی بساط ہو سرحدِ چیں سے مصر تک
ساقی ہی اُس کا اور ہے، مے اور، جام اور ہے

تمکیں جو ہے سکوں سے ہے، آتی ہے کوہ سے صدا
کہتا تھا مورِ ناتواں، لطفِ خرام اور ہے

اے بزمِ دورِ آخری! کس کی تلاش ہے تجھے
تو سبزۂ حجاز ہے، تیرا امام اور ہے

جذبِ عرب کے بل پہ ہے انجمِ قوم کا قیام
یثرب کے آفتاب کا، یعنی، نظام اور ہے

باقی ہے زندگی میں کیا، ذوقِ نمو اگر نہ ہو
حرکتِ آدمی ہے اور، حرکتِ جام اور ہے

شمعِ سحر یہ کہہ گئی، ہے ساز زندگی کا سوز
اہلِ محفلِ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

فانوس کی طرح جیو، آتش بہ پیرہن رہو
اے جلنے والو! لذّتِ سوزِ دوام اور ہے

عجلت کرو نہ میکشو، بادہ ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

بانگِ درا کا متداول متن

طلبۂ علی گڑھ کے نام

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے — عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے
طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم — یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے
آتی تھی کوہ سے صدا، رازِ حیات ہے سکوں — کہتا تھا مورِ ناتواں، لطفِ خرام اور ہے
جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا — اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیشِ جاوداں، ذوقِ طلب اگر نہ ہو — گردشِ آدمی ہے اور، گردشِ جام اور ہے
شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز — غم کدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

جون ۱۹۰۷ء

حواشی ۔ اس نظم کے منسوخ متن اور متداول متن میں اتنی بڑی تبدیلیاں ہیں کہ دونوں کو الگ الگ دینا زیادہ مناسب ہے۔ یہ نظم اقبال نے یورپ سے علی گڑھ کالج کے طلبہ کو بھیجی تھی۔ منشی احمد دین نے صرف یہ لکھا ہے۔

"ہندوستان میں ۱۹۰۷ء سیاسی ہلچل کا سال تھا اور اقبال نے انگلستان سے ہی اپنا نقطۂ نظر پیش کر دیا تھا۔"

(احمد دین ص ۱۶۰)

عبداللطیف اعظمی اور کھل کر کہتے ہیں:

"علی گڑھ کالج میں یوروپین اسٹاف کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے اور اقبال نے انگلستان سے ہی اپنا نقطۂ نگاہ پیش کر دیا تھا۔"

(اقبال دانائے راز، ص ۲۲۴ - ۲۲۳)

عتیق صدیقی واشگاف لکھتے ہیں کہ ٹرسٹیوں کے ایک گروہ کا مطالبہ یہ تھا کہ کالج کے یوروپین اسٹاف اور یوروپین پرنسپل کو خارج کر دیا جائے۔

(اقبال جادوگرِ ہندی نژاد۔ ص ۴۷)

طلبہ کے نام پیغام کے طور پر یہ غزل نما نظم، بالخصوص منسوخ متن، ڈھیلی اور غیر واضح ہے۔ اس سے طلبہ نے کیا معنی نکالے ہوں گے اور کون سا پیغام حاصل کیا ہوگا؟ صرف آخری شعر میں ایمائی انداز میں کہا ہے کہ ابھی تک ہماری قوم ذہنی اور علمی اعتبار سے ناپختہ ہے، درس گاہ کمزور ہے اس لیے ابھی انگریز اساتذہ (اہلِ کلیسا) کی سربراہی قبول کرتے رہو۔

عروض کی روح کو غلط سمجھنے کا مظہر اقبال کی تین نظموں کا ابتدائی متن ہے۔ پیام، زیرِ نظر نظم اور کوششِ ناتمام، ان تینوں نظموں کا ابتدائی مرکزی وزن مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن ہے۔ انھوں نے عربی فارسی کی قدیم عروضی کتابوں میں پڑھ لیا ہوگا کہ مفتعلن کی جگہ مستفعلن یا مفعولن بھی لا سکتے ہیں۔ پھر کیا تھا۔ انھوں نے ترنم اور آہنگ کو بالائے طاق رکھ دیا اور لگے عروضی کرتب دکھانے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 'طلبۂ علی گڑھ' کا قدیم متن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی اوگھٹ گھاٹی میں بولڈروں پر کودتے پھاندتے، گرتے پڑتے چلے جا رہے ہیں۔ طلبہ کو پیغام اور ایسے آہنگ میں؟ جب اقبال کو ہوش مندی آئی تو متداول نقش کی سبک روی پیدا کر دی۔

احمد دین کی طبعِ اوّل میں اس نظم کا ذکر "سیاسیات" کے عنوان کے تحت کیا گیا۔ نظم کے آخر میں یہ تبصرہ ہے۔

"وسعتِ نظر، اتحادِ ملی، ذوقِ نمود، سوزِ دل اور قوتِ عمل کا بے بہا مشورہ دیا اور ساتھ ہی سبک سری اور بے ہنگام شورشوں سے متنبہ بھی کر دیا:

عجلت کرو نہ مے کشو بادہ ہے نارسا ابھی رہنے دو خم کے منھ پہ تم خشتِ کلیسا ابھی"
(ص ۲۴۳)

۵ جوش ملسیانی نے اپنی کتاب 'اقبال کی خامیاں' میں اعتراض کیا ہے کہ اس مصرع میں اقبال نے 'طرز' کو مذکر باندھا ہے جب کہ تصویرِ درد کے مصرع، ع چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری، میں مونث۔ کوئی ایک طریقہ چاہیے۔

پس نوشت: عروضی نوٹ۔ اس نوٹ کے اضافے کا محرک ماہرِ اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا میرے نام مکتوب مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۶ء ہے۔ وہ مطلع کرتے ہیں کہ اقبال نے اس وزن میں زحافات کی آزادی کا مظاہرہ اردو نظموں اور غزلوں کے علاوہ دو فارسی غزلوں میں بھی کیا ہے۔

پیراہنِ وجودِ من چہ آتشِ جنوں گرفت ______ سینہ بہ برق در کنم دیدہ بہ نیشتر زنم

اے گل چو خارِ آمدو آزاد چوں رسیدہ ______ تو ہم زخاکِ ایں چمن مانندِ ما دمیدہ

آزاد صاحب علامہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انھوں نے ایک بات چیت کے دوران میں والدِ محترم سے کہا تھا کہ میں نے علمِ عروض سبقاً سبقاً پڑھا ہے"

پھر آزاد صاحب نے انوارِ اقبال میں مشمولہ ایک مکتوب بہ نام کیپٹن منظور حسین ۱۹۱۸ء کی طرف توجہ دلائی۔ مکتوب سے پہلے مرتب جناب بشیر احمد ڈار کا یہ نوٹ ہے۔

"کیپٹن منظور حسین نے اپنی نظموں کا ایک مختصر مجموعہ 'پیامِ غربت' کے عنوان سے چھپوایا جس کے سرورق پر اقبال کا یہ شعر لکھوایا گیا۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے ______ غربت کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

اس مجموعے کا ایک نسخہ انھوں نے علامہ اقبال کی خدمت میں ارسال کیا۔ مندرجہ ذیل خط اسی کے جواب میں لکھا گیا"، خط کے یہ جملے قابلِ ذکر ہیں۔

"سرِ عنوان شعر (اوروں کا ہے پیام اور... الخ) جہاں تک مجھے یاد ہے میرا ہے۔ اس نظم میں بہت سے اغلاط چھپ گئے تھے۔ دوسرے مصرع میں 'غربت' کی جگہ لفظ 'عشق' ہے۔ غربت سے بحر شعر کا درست نہیں رہتا۔ نظرِ ثانی میں میں نے اسے درست کر دیا ہے۔ آپ بھی دوسری ایڈیشن میں تصحیح کر لیں"

یہ انکشاف بڑا پریشان کن ہے کہ اقبال اس وزن میں مفتعلن کی جگہ دوسرے ارکان کو بعد میں ناجائز قرار دینے لگے۔ قدر بلگرامی نے قواعد العروض میں اس وزن میں مفتعلن کی جگہ مفاعلن یا مفعولن لانے کو جائز قرار دیا ہے۔ (قواعد العروض، لکھنو ۱۳۰۰ھ ص ۵۶-۱۵۴)

یاس یگانہ نے چراغِ سخن میں لکھا ہے کہ بحرِ رجز میں خبن (مفاعلن)، طے (مفتعلن)، رفع (فاعلن)، تسکین (مفعولن) سے ہر جگہ کام لیا جا سکتا ہے۔ فاعلن کے جواز میں مرزا اوج کی بقیاس الاشعار سے فارسی شعر کی سند پیش کی ہے۔ (چراغِ سخن، نولکشور پریس لکھنو ۱۹۲۱ء ص ۹۶)

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ عروضی کتب کے لحاظ سے مندرجہ بالا وزن میں اقبال کی آزادیاں جائز ہیں۔ اقبال کا انھیں خارج از بحر قرار دینا درست نہیں۔ ہاں جہاں تک موزونیت و ترنم کا سوال ہے، یہ نامستحسن ہیں۔

اخترِ صبح

ستارہ صبح کا روتا تھا اور کہتا تھا ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شے اماں مجھی کو تہِ دامنِ سحر نہ ملی
بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی!
نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی

کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبینِ سحر! غمِ فنا ہے تجھے! گنبدِ فلک سے اتر
ٹپک بلندیِ گردوں سے ہمرہِ شبنم مرے ریاضِ سخن کی فضا ہے جاں پرور
میں باغباں ہوں، محبت بہار ہے اس کی
بنا، مثالِ ابد پائدار ہے اس کی

حاشیہ - یہ نظم رزّاق کے مقدمے ص ۱۱۵-۱۱۴، بیاض اور بانگِ درا میں ہے۔ تینوں میں متن کا کوئی فرق نہیں۔ رزّاق میں اس کا عنوان ستارۂ صبح ہے۔ نظم کا صحیح زمانہ معلوم نہیں۔ بانگ میں اس کے وقوع کی مناسبت سے یہاں لکھا گیا ہے۔ بیاض میں یہ دو جگہ ص ۱۶۵ اور ۱۷۱ پر ہے۔

حسن و عشق

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہیں دل میرا

تو جو محفل ہے، تو ہنگامۂ محفل ہوں میں حسن کی برق ہے تو، عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے تو مرے اشک ہیں شبنم تیری شامِ غربت ہوں اگر میں، تو شفق تو میری
میرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے تیری تقریر سے پیدا مری حیرانی ہے
حسن کامل ہے ترا، عشق ہے کامل میرا

میرے بے تاب تخیل کو دیا تو نے قرار — ہے مرے باغِ سخن کے لیے تو بادِ بہار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں — نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال — تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال

قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

حاشیہ - یہ نظم رزاق کے مقدمے بیاض اور بانگ درا میں یکساں متن کے ساتھ ہے۔ اس کی ہیت قابلِ توجہ ہے۔ مثنوی کے اشعار سے مسبّع جیسے بند بنائے ہیں۔ ہر بند کا ٹیپ کا مصرع باہم مقفّیٰ ہے۔

پیش کش بہ .....

(منسوخ)

نغمۂ رنگیں سمجھ یا نالۂ پیہم سمجھ — اس نوا کو یا نوائے بربطِ عالم سمجھ
پیش کش ہے دردمندوں کی یہی دو چار اشک — خواہ موتی، خواہ صبحِ عشق کی شبنم سمجھ
درد کے پانی سے ہے سرسبزیٔ کشتِ سخن — فطرتِ شاعر کے آئینے میں جوہر غم سمجھ
دل کو لیکن مانعِ خدمت نہیں افسردگی — اس نگیں کو تا ابد زندانیٔ خاتم سمجھ

ہے ترے دم سے شرر آباد خاکستر مری
واسطے تیرے، طبیعت ہے چمن پرور مری

گلستاں بن کر مہک اٹھا دلِ پُرخوں میرا — ہے سرودآموزِ بلبل نالۂ موزوں مرا
گردشِ پیہم مبارک ساغرِ خورشید کو — ہو گیا پابندِ مینا بادۂ گل گوں مرا
زخمۂ الفت سے ہے تارِ رگِ جاں نغمہ خیز — یعنی تیرے سحر سے پیدا ہوا افسوں مرا
میرے نظّارے میں پیدا ہو گیا اندازِ نو — اور ہی میری زمیں ہے، اور ہی گردوں مرا
ہے تری منت طلب میری بہارِ شاعری — تازہ تر ہے میرے دامن میں گلِ مضموں مرا
عشق لیکن دردِ محرومی سے پاتا ہے کمال — ہجرِ لیلیٰ سے ہوا آوارہ تر مجنوں مرا

ہے ترے نورِ خفی سے محفل افروزی مری
تیرے قدموں پر تصدّق ہے جگرسوزی مری

حاشیہ۔ یہ نظم روزگار میں ص ۳۴۴ تا ۳۴۶ پر دی ہے۔ ظاہرا وہیں سے لے کر باقیات سوم میں ص ۵۲۹ تا ۵۳۰ پر دی ہے۔ اس کا زمانہ معلوم نہیں لیکن چونکہ اقبال حسنِ یورپ سے بہت خیرہ ہوئے تھے اور وہیں ان پر عشق کا بھوت زیادہ چڑھا ہوا تھا اسی لیے اسے اس قبیل کی نظموں کے بیچ جگہ دی جا رہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نظم کی حسینہ کوئی یورپی نہ ہو بالکل عطیہ بیگم ہوں جیسا کہ اقبال کی کئی عشقیہ نظموں کے لیے قیاس کیا جاتا ہے۔

کلی

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگیں اپنا کھول دیتی ہے کلی سینۂ زرّیں اپنا
جلوہ آشام ہے صبح کے میخانے میں زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں
سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے!
میرے خورشید! کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب بہرِ نظّارہ تڑپتی ہے نگاہِ بے تاب
تیرے جلوہ کا نشیمن ہو مرے سینے میں عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں
زندگی ہو، ترا نظّارہ مرے دل کے لیے روشنی ہو تری، گہوارہ مرے دل کے لیے
ذرّہ ذرّہ ہو مرا پھر طرب اندوزِ حیات ہو عیاں جوہرِ اندیشہ میں پھر سوزِ حیات
اپنے خورشید کا نظّارہ کروں دور سے میں صفتِ غنچہ، ہم آغوش رہوں نور سے میں
جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کر دوں

حاشیہ۔ یہ نظم بیاض میں، رزاق کی کلیات کے مقدّمے میں ص ۱۱۵ پر نیز بانگ درا میں ملتی ہے۔ رزاق کے یہاں اس کا عنوان 'غنچۂ ناشگفتہ اور آفتاب' ہے جب کہ بیاض اور بانگ میں کلی ہے۔ تینوں کے متن میں کوئی فرق نہیں۔

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے — تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر — ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا — چلنا، چلنا، مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب — تارے، انساں، شجر، حجر سب

ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟

کہنے لگا چاند، ہم نشینو! — اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھیرے ذرا کچل[۱] گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

حاشیہ۔ یہ نظم بیاضِ رزاق کے مقدمے (ص ۱۰۹-۱۰۸) نیز بانگ میں ملتی ہے۔ تینوں میں متن کا کوئی فرق نہیں۔

۱ جوش ملسیانی نے اپنی کتاب 'اقبال کی خامیاں' میں اعتراض کیا ہے کہ "کچل گئے" کی جگہ "کچلے گئے" کا مقام ہے (ص ۴۸)

وصال

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے — خوبیِ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے
خود تڑپتا تھا، چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں — تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا شرماتا تھا میں

میرے پہلو میں دلِ مضطر نہ تھا سیماب تھا ارتکابِ جرمِ الفت کے لیے بے تاب تھا
نامرادی محفلِ گل میں مری مشہور تھی صبح میری آئینہ دارِ شبِ دیجور تھی

از نفس در سینۂ خوں گشتہ نشتر داشتم
زیرِ خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتم

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں
عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے
غازۂ الفت سے یہ خاکِ سیہ آئینہ ہے اور آئینے میں عکسِ ہمدمِ دیرینہ ہے
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
ضو سے اس خورشید کی، اختر مرا تابندہ ہے چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا واسوختی

حاشیہ۔ عطیہ بیگم (عطیہ فیضی) کی انگریزی کتاب 'اقبال' فروری ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے شائع ہوئی اس کے اُردو ترجمے میں ص ۳۱ پر نظم خود اقبال کے خط میں درج ہے۔ اس کے نیچے 'اقبال' میونک، لکھا ہے۔ خط پر تاریخ درج نہیں۔ عطیہ کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ۲۷ تا ۲۹ اگست ۱۹۰۷ء کو میونک میں تھے لیکن اس وقت تو عطیہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب 'محمد اقبال' ایک ادبی سوانح حیات' (دہلی ۱۹۸۳ئ) میں اس نظم کا ذکر دو جگہ پر کیا ہے۔ ص ۶۳ پر لکھتے ہیں کہ عطیہ اپنی والدہ کی علالت کی وجہ سے ۱۹۰۷ء میں ہندوستان واپس آئیں اور ۱۹۰۸ء میں دوبارہ یورپ چلی گئیں۔ اقبال نے اپنی نظم 'وصال' انھیں بمبئی بھیجی تھی۔ ص ۹۰ پر وہ ۔۔۔۔ کی گود میں بلی دیکھ کر' کے سلسلے میں کہتے ہیں:

"عین ممکن ہے کہ یہ نظم بھی اسی شخصیت سے متعلق ہو جس کو اقبال نے اپنی نظمیں 'وصال' اور 'نوائے غم' لکھ کر بھیجی تھیں۔ بلکہ میرا اندازہ تو یہ ہے کہ اس دور کی کہی ہوئی بعض

اور نظمیں مثلاً حسن و عشق، گل اور فراق کی محرک بھی وہی شخصیت ہی ہے جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے"۔ فٹ نوٹ ص ۹۰

گزشتہ باب میں عطیہ کا ذکر ہے۔ گویا آزاد کے نزدیک نظم وصال کی مخاطب عطیہ ہیں۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے شرحِ بانگِ درا میں اس نظم کی شرح میں لکھا،

'گل سے شاعر کا محبوب مراد ہے' ص ۲۰۴

اس میں خالص تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ شاعر نے بڑے دل کش انداز میں وارداتِ عاشقی کا بیان کیا ہے، لیکن شرح ختم کرنے کے بعد جب مقدمہ لکھنے بیٹھے تو اس نظم کا مطلع لکھ کر جو نوٹ دیتے ہیں اس تاویل کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔

"اقبال کے آئندہ کلام کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے کہ وہ گل 'قرآنِ حکیم کا پیغام ہے جس کی اشاعت وہ آخری وقت تک کرتے رہے"۔ (ص ۱۵)

سلیمیٰ

جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں نے
خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں

صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں

جس کی چمک ہے پیدا، جس کی مہک ہویدا
شبنم کے موتیوں میں، پھولوں کے پیرہن میں

صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ! تیری، کمال اس کا

حاشیہ۔ بیاض میں اس نظم کو نظام المشائخ رجب ۱۳۲۸ھ م جون جولائی ۱۹۱۰ء سے نقل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تصنیف اس سے پہلے کی ہے کیونکہ بانگ میں قیامِ یورپ کے دور میں دی ہے۔

بیاض رزاق اور قلمی کلام میں اس نظم کا عنوان 'لامکاں کا مکاں' ہے۔ نظم کا

زمانہ معلوم نہیں۔ بانگ میں اس کے وقوع کی بنا پر اسے یہاں رکھ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے ایک مضمون میں دعویٰ کیا ہے کہ یہ نظم عطیہ کے لیے لکھی گئی۔ عرب میں سلمٰی ایک مشہور حسینہ تھی۔ وہاں ہر معشوقہ کو سلمٰی کہہ دیتے ہیں۔ اقبال نے اسے سلیمٰی بنا لیا۔ ان کا قیاس ہے کہ اس نظم کا عنوان اصلاً عطیہ ہی رہا ہوگا جسے اپنی دوسری شادی (۱۹۱۳ء) کے بعد حسینہ کر دیا۔ یہی نظم پنڈی بہاء الدین ضلع گجرات پنجاب کے رسالہ صوفی جلد ۳ نمبر ۴۷، فروری ۱۹۱۵ء میں ص ۶ پر شائع ہوئی۔ اکبر حیدری اسے اسی نظم کی پہلی اشاعت سمجھتے ہیں لیکن یہ اس سے پہلے نظام المشائخ میں ۱۹۱۰ء میں شائع ہو چکی تھی۔ ؎۱

غزل

یوں تو اے بزمِ جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے ۔۔۔ اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں ؎۲ میں تھی

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک ۔۔۔ مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

کس قدر اے مے! تجھے رسمِ حجاب آئی پسند ۔۔۔ پردۂ انگور سے نکلی تو میناؤں میں تھی

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آ سکتا تھا علم ۔۔۔ اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

محفلِ ہستی میں آزارِ تہی دستی نہ ہو م ۔۔۔ یہ بھی اک میری جوانی کی تمناؤں میں تھی

فتنۂ محشر کسی صورت ہو بے تابِ نمود م ۔۔۔ مشورت یہ آج تیرے ناشکیباؤں میں تھی

میں نے اے اقبال! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

حاشیہ ۱۔ غزل کے زمانے کا علم نہیں لیکن بانگ میں اس کے وقوع سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ ۱۹۰۷ء کی تخلیق ہے۔ اس غزل کے پانچ اشعار بانگِ درا میں ہیں اور دو منسوخ اشعار روزگار فقیر ص ۳۰۲ پر دیے ہیں۔

؎۲ جوش ملسیانی نے "اقبال کی خامیاں" ص ۶ پر اعتراض کیا ہے کہ تماشہ کی جمع تماشوں ہوتی

؎۱ ڈاکٹر اکبر حیدری: اقبال کی ایک نظم سلیمٰی۔ ہماری زبان یکم مئی ۱۹۸۰ء ص ۲

ہے۔ "تما شاؤں" نہیں۔

۲؎ جرمنی میں اقبال کو کم از کم تین نہایت حسین نوعمر استانیوں نے پڑھایا۔ عطیہ کی ڈائری میں ان کا ذکر یوں ہے:

"یہ دونوں جوان اور بے حد خوب صورت لڑکیاں وگیے ناست اور سینےشل ان کو برابر سبق دیتی ہیں ¹... شام کو ... رین کے مکان پر گئے۔ ان کی بیٹی بہت قابل اور بہت زیادہ حسین اقبال کی پروفیسر رہ چکی ہیں ²"

خیال ہوتا ہے کہ اس شعر میں انھیں استانیوں کی طرف اشارہ ہے۔

۳؎ اس شعر میں اقبال نے صریحاً وہ اعتراف کیا ہے جو ہر شخص کے دل میں ہوتا ہے کہ وہ مرفہ الحال رہے۔ ظاہر ہے کہ بعد میں انھوں نے اس اعتراف کو مٹانے کے لیے شعر کو خارج کرنا مناسب سمجھا۔

فرد

اس کے عارض پر سنہری بال ہیں ہو طلائی استرا اس کے لیے

حواشی - عطیہ کی ڈائری میں ہائیڈل برگ کے نوٹ میں لکھا ہے۔

رات کھانے پر ایک لڑکی کو دیکھ کر مجھ سے کہتے ہیں:

اس کے عارض پر سنہری بال ہیں ہو طلائی استرا اس کے لیے

ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ³

اس نوٹ کی تاریخ ۳۱ راگست ۱۹۰۷ء تا ۴ ستمبر ۱۹۰۷ء ہو سکتی ہے۔ غالباً اوائل ستمبر

۱؎ کسری منہاس: اقبال اور قیام یورپ۔ نقوش اقبال نمبر ۲ شمارہ ۱۲۳ دسمبر ۱۹۷۷ء ص ۵۸۸ لڑکیوں کے نام WEGEN AST اور SENESHAL تھے۔

۲؎ ایضاً ص ۵۹۱ ۳؎ ایضاً ص ۵۹۲

کا واقعہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال نے 'زندہ رود' حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور' میں ص ۱۲۳ پر لکھا ہے کہ ہائیڈل برگ میں ہوسٹل میں رات کے کھانے پر یہ شعر ۲۲ راگست ۱۹۰۷ء کو کہا گیا۔

کوششِ ناتمام

فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تابِ صبح
چشمِ شفق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لیے

رہتی ہے قیسِ روز کو لیلیِ شام کی ہوس
اخترِ صبح مضطرب تابِ دوام کے لیے

کہتا تھا قطبِ آسماں قافلۂ نجوم سے
ہمرہو! میں ترس گیا لطفِ خرام کے لیے

آئی صدا یہ چاند کی بزمِ طواف پیشہ سے
صبحِ ازل سے ہے سفر رہتا قیام کے لیے

قلبِ حزیں سے مانگ کے لائی ہے داغِ جستجو
بادِ بہار لالۂ شعلہ بجام کے لیے

سوتوں کو ندیوں کا شوق، بحر کا ندیوں کو عشق
موجۂ بحر کو تپش ماہِ تمام کے لیے

حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لیے

راہِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

قدرت کا اک فریب ہے لطفِ حصولِ مدعا
خارِ امید کی خلش روح کا تازیانہ ہے

مصروفیت طیور کی شوقِ فراغ سے نہیں
محنت کا ذوق باعثِ تعمیرِ آشیانہ ہے

خاکِ چمن نے کر دیا رازِ امید آشکار
کاوشِ دل ہے مدعا، گل کی کلی بہانہ ہے

قمری و عندلیب کو شرطِ حیات ہے وہ شور
گوشِ غلط شنو میں جو نالۂ عاشقانہ ہے

حاشیہ۔ روزگار ص ۳۳۴ کے مطابق اس نظم کا عنوان اصلاً '۔۔۔۔۔ کے نام' تھا۔ محذوف نام کسی محبوبہ کا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ نظم عاشقانہ نہیں۔ اس نظم کا صحیح زمانہ معلوم نہیں۔

پہلے دو متروک اشعار کو خارج کرنے کی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کے دوسرے مصرع میں شکستِ ناروا ہے دوسرے بند کے پہلے دو منسوخ شعروں میں وہی عروضی بازی گری ہے جو نظم 'پیام' اور 'طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام' میں تھی۔ ان میں گئی جگہ مفتعلن کی جگہ مستفعلن لائے ہیں۔ متداول کلام میں انھوں نے ایسے عروضی اعتبار سے جائز لیکن غیر مترنم اشعار کو خارج کر دیا۔ دیکھیے طلبۂ علی گڑھ کالج کا حاشیہ۔

عشرتِ امروز

نہ مجھ سے کہہ کہ اجل ہے پیامِ عیش و سرور
نہ کھینچ نقشۂ کیفیتِ شرابِ طہور
فراقِ حور میں ہو غم سے ہمکنار نہ تو
پری کو شیشۂ الفاظ میں اتار نہ تو
مجھے فریفتۂ ساقیِ جمیل نہ کر
بیانِ حور نہ کر، ذکرِ سلسبیل نہ کر
مقامِ امن ہے جنت، مجھے کلام نہیں
شباب کے لیے موزوں ترا پیام نہیں
شباب آہ! کہاں تک امیدوار رہے!
وہ عیش، عیش نہیں، جس کا انتظار رہے
وہ حسن کیا کہ جو محتاجِ چشمِ بینا ہو
نمود کے لیے منت پذیرِ فردا ہو
عجیب چیز ہے احساس زندگانی کا
عقیدہ "عشرتِ امروز" ہے جوانی کا

حاشیہ۔ یہ نظم بیاض، کلام اور بانگ میں ملتی ہے۔ تینوں میں کوئی اختلافِ متن نہیں۔ نظم کا صحیح زمانہ معلوم نہیں۔

انسان

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا

حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے؟

ہے گرمِ خرام موجِ دریا   دریا سوئے بحر جادہ پیما
بادل کو ہوا اڑا رہی ہے   شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے
تارے مستِ شرابِ تقدیر   زندانِ فلک میں پا بہ زنجیر
خورشید، وہ عابدِ سحر خیز   لانے والا پیامِ "برخیز"
مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر   پیتا ہے مئے شفق کا ساغر
لذت گیرِ وجودِ ہر شے   سرمستِ مئے نمودِ ہر شے

کوئی نہیں غم گسارِ انساں
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں!

حاشیہ۔ یہ نظم بیاض میں، رزّاق کے مقدمے ص ۱۱۱، ۱۱۰ پر نیز بانگ میں ہے۔ رزّاق میں پوری نظم ایک بند کے طور پر لکھی گئی ہے یعنی تیسرا شعر بھی مثنوی کی طرح تسلسل میں ہے۔ آخری شعر ٹیپ کے طور پر لکھا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اختلافِ متن نہیں۔

جلوۂ حسن

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنّا بے تاب   پالتا ہے جسے آغوشِ تخیّل میں شباب
ابدی بنتا ہے یہ عالمِ فانی جس سے   ایک افسانۂ رنگیں ہے جوانی جس سے
جو سکھاتا ہے ہمیں سر بہ گریباں ہونا   منظرِ عالمِ حاضر سے گریزاں ہونا
یعنی وہ آگ تأثر کو لگا دیتا ہے   م اور دل کو شررِ آباد بنا دیتا ہے
دور ہو جاتی ہے ادراک کی خامی جس سے   عقل کرتی ہے تأثر کی غلامی جس سے

آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے؟
خاتمِ دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں؟

دورۂ عصر کی ہستی کو مٹاتا ہے خیال ؎ ہر گھڑی ایک نیا دہر بناتا ہے خیال

حاشیہ۔ یہ نظم بیاض اور بانگ میں ملتی ہے۔ اس کا صحیح زمانہ معلوم نہیں۔

ایک شام

(دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے پر)

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا آغوش میں غم کو لے کے سو جا

حاشیہ۔ یہ نظم ہائیڈل برگ جرمنی میں کہی گئی۔ سعید اختر درانی کے مطابق اقبال کا مکان دریائے نیکر کے بالکل کنارے پر تھا (ص ۴۰)۔ عطیہ فیضی کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگست ۱۹۰۷ء میں ہائیڈل برگ میں تھے۔ یہ نظم اس مہینے یا اس کے آس پاس کہی گئی ہوگی۔ بیاض اور رزاق میں اس نظم کا عنوان "خاموشی" ہے۔ رزاق میں اس کے قبل یہ نوٹ ہے۔

"یہ اشعار چاندنی رات میں دریائے ٹینکر (کذا) (ہائیڈلبرگ جرمنی) کے کنارے موزوں ہوئے تھے"۔ تقریباً یہی نوٹ بیاض میں ہے اور وہاں بھی دریا کا نام ٹینکر لکھا ہے۔ رزاق کے صحت نامے میں ٹینکر کو نیکر بنانے کی ہدایت ہے۔ مرتب بیاض نے صحت نامہ پر توجہ نہیں کی۔ نام کے ہجے NECKAR ہیں۔

تنہائی

تنہائیِ شب میں ہے حزیں کیا؟ انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟

یہ رفعتِ آسمانِ خاموش — خوابیدہ زمیں، جہان خاموش
یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار — فطرت ہے تمام نسترن زار
آوارہ یہ چاند، رات خاموش — صہبائے نظارہ دے گوش
یہ بوئے گلِ قمر، یہ مہتاب — خم خانۂ دہر کی مے ناب
موتی خوش رنگ پیارے پیارے — یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
کس شئے کی تجھے ہوس ہے اے دل!
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

حاشیہ - اس نظم کو بانگ میں اس کے وقوع کی بنا پر یہاں درج کیا گیا ہے۔ پہلی نظم 'ایک شام' اور اس نظم کی بحر، فضا اور تاثر بالکل یکساں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی نظم کے دو ٹکڑے کر دیے گئے ہیں۔ بہر حال قیاس یہ ہے کہ یہ نظم بھی اسی موقع پر کہی گئی جس پر پہلی نظم۔

فراق

تلاشِ گوشۂ عزلت میں پھر رہا ہوں میں — یہاں پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہوں میں
شکستہ گیت میں چشموں کے دلبری ہے کمال — دعائے طفلکِ گفتار آزما کی مثال
ہے تختِ لعلِ شفق پر جلوسِ اخترِ شام — بہشتِ دیدۂ بینا ہے حسنِ منظرِ شام
سکوتِ شام جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے
یہ کیفیت ہے مری جانِ ناشکیبا کی — مری مثال ہے طفلِ صغیرِ تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز — صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز
یونہی میں دل کو پیامِ شکیب دیتا ہوں
شبِ فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

حاشیہ۔ رزاق، بیاض اور کلام میں اس نظم کا عنوان 'کنجِ تنہائی' ہے۔ اسے یہاں بانگ درا کے مطابق درج کیا گیا ہے۔

غزل

(منسوخ)

نظارۂ ماہ کا سامانِ بےخودی ہے مجھے — یہ چاندنی ہے کہ گردوں سے مے برستی ہے
وہ سیرِ دل کی کرے، ذوقِ جستجو ہو جسے — جہاں کو جس نے بسایا یہ اس کی بستی ہے
میں اس دیار کے، یخچم کے ساکنوں صدقے — جہاں کے کوچوں میں غیرت ہے تنگ دستی ہے
ہزاروں نقش مٹے اک ترے بنانے کو — تری نمود سے غافل! نمودِ ہستی ہے

حاشیہ۔ روزگار ص ۲۶۶ کی یہ غزل ظاہراً بیاضِ اعجاز سے لی گئی ہے۔ اس کے زمانے کا کوئی علم نہیں۔ تیسرے شعر سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ قیامِ یورپ ہی میں کہی گئی ہوگی اس میں بھی چاندنی کا اسی طرح مذکور ہے جیسے نظم 'ایک شام' اور تنہائی میں۔ پھر بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

قطعہ (کذا)

(منسوخ)

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر — اور فیضِ آستاں بوسی سے گُل برسر قمر
روشنی لے کر، تری موجِ غبارِ راہ سے — دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر
کاروانِ قوم کو ہے تجھ سے زینت اس طرح — جس طرح گردوں پہ صدرِ محفلِ اختر قمر

شمعِ بزمِ اہلِ ملت را چراغِ طور کُن
یعنی ظلمت خانۂ ما را سراپا نور کُن

۹ر جون ۱۹۰۸ء

حاشیہ۔ عطیہ بیگم فیضی کی انگریزی کتاب 'اقبال'، فروری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔

اس کا اردو ترجمہ ضیاالدین برنی نے اقبال اکیڈیمی کراچی سے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا۔ دونوں میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ اس کتاب میں عطیہ لکھتی ہیں:

"۱۹۰۸ء میں مجھے دوبارہ یورپ جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے ہمراہ میری بہن رفیعہ سلطان نازلی بیگم آف جنجیرہ اور ان کے خاوند ہز ہائنس نواب احمد خاں بھی تھے۔ اس وقت اقبال نے ہم سے ملاقات کی اور مندرجہ ذیل قطعہ میری بہن کی بیاض میں تحریر کیا" ص ۳۰۔

ان کی بیاض میں اقبال کے خط میں یہ اشعار لکھے ہیں اور ان کے نیچے ۹ رجون ۱۹۰۸ء لندن لکھا ہے۔ آخری شعر سے قطع نظر پہلے کے اردو اشعار بالکل قصیدے کے رنگ میں ہیں نظم کو قطعہ کہنا درست نہیں۔ یہ ترکیب بند کا ایک بند ہے۔ راقم الحروف نے باقیات کی مختلف کتابوں کی تقلید میں قطعہ کا عنوان رہنے دیا ہے۔ یہ اشعار فیضی کی کتاب کے علاوہ باقیات طبع اوّل ص ۸۳ اور طبع سوم ص ۱۹۸۔ رخت ص ۱۳۴، اور نوادر ص ۲۹۵ پر بھی دیے ہیں۔ کہیں کوئی اختلاف متن نہیں۔

پیامِ عشق

(غزل)

سُن اے طلبگارِ دردِ پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں، تو سراپا ایاز ہو جا
نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں، کمالِ شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں، تو بھی آئینہ ساز ہو جا
غرض ہے پیکارِ زندگی سے، کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو، ادا مثالِ نماز ہو جا

دیارِ خاموشی دل میں ایسا ستم کشِ دردِ جستجو ہو
کہ اپنے سینے میں آپ پوشیدہ صورتِ حرفِ راز ہو جا
نہ ہو قناعت شعار، گلچیں! اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں، تو اور دامن دراز ہو گا
گئے وہ ایام، اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمع سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا
وجود افراد کا مجازی ہے، ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملّت پہ، یعنی، آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز، اقبال! آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا، غبارِ راہِ حجاز ہو جا

اکتوبر ۱۹۰۸ء

حواشی۔ اسے رزّاق میں غزل کے طور پر دیا ہے لیکن کلام، بیاض، مخزن، نیچرل شاعری مرتبہ صفدر مرزاپوری اور بانگ درا میں اسی پر "پیامِ عشق" عنوان دے کر اسے نظم کے طور پر پیش کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ہے غزل ہی جس کا ہر شعر آزاد ہے اور جس میں مقطع بھی موجود ہے۔

یہ مخزن اکتوبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ زیرِ نظر مجموعے کو اقبال کی واپسیِ یورپ پر ختم کرنا ہے۔ چونکہ بانگ درا میں اسے قیامِ یورپ کے دور میں جگہ دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اقبال کی ہندوستان سے واپسی سے پہلے ہی کہی گئی ہوگی۔

عبد القادر کے نام

۱۔ اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
۲۔ ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط — اسی ہنگامے سے محفل تہہ و بالا کر دیں

۳- پھونک ڈالا تھا کبھی دفترِ باطل جس نے م حدّتِ دم سے اسی شعلے کو پیدا کر دیں
۴- اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
۵ جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں
۶- تنِ آتش زدۂ شوق کو مانندِ سرشک م قطعِ منزل کے لیے آبلۂ پا کر دیں
۷- اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
۸- رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اٹھالیں اپنا سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمی کر دیں
۹- درد ہے سارے زمانے کا ہمارے دل میں م جنس کم یاب ہے، آ! نرخ کو بالا کر دیں
۱۰- دیکھ! یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بے کار قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
۱۱- زاہدِ شہر کہ ہے سوختہ طبعی میں مثال خشک ہے، اس کو غریقِ نمِ صہبا کر دیں
۱۲- بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو، ایسا کہ گداز جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں
۱۳- سنگ رس شاخِ چمن ہم نے نشیمن کے لیے م اپنے بیدردوں کو آمادۂ ایذا کر دیں
۱۴- گرم رکھتا تھا ہمیں سردیِ مغرب میں جو داغ چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں
۱۵- شمع کی طرح جئیں بزمِ گہِ عالم میں خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ہرچہ در دل گذرد، وقفِ زباں دارد شمع
۱۶ سوختن، نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

اشاعت مخزن دسمبر ۱۹۰۸ء

حواشی- یہ نظم مخزن دسمبر ۱۹۰۸ء میں عبدالقادر کے نام، کے عنوان سے چھپی۔ رزاق میں اس کا عنوان 'پیامِ عمل' ہے لیکن خدابخش لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مجھے لکھا کہ مخزن میں یہ عنوان نہیں۔ رختِ سفر میں ص ۱۰ پر لکھا کہ اس نظم کا اصلی عنوان 'پیامِ عمل' تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ عنوان مخزن کے بعد وجود میں آیا ہے۔ رختِ سفر ص ۱۸۹ پر مخزن سے لے کر حسبِ ذیل نوٹ دیا ہے۔

" اس نظم کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہوئے مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ ایسی نظم اور ایسے خیالات کا مخاطب مجھے بنایا گیا ہے اور ایسے بلند ارادوں میں

مجھے شریک کیا گیا ہے .....

اگر میرے نصیب میں کوئی خدمت ملک کی لکھی ہے تو مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ کوئی جواب اس خط کا مجھ سے بن نہیں پڑتا، خصوصاً جب جنابِ اقبال کے اشعارِ آبدار کے مقابل اپنی نثر کی خشکی اور بے مائگی پر نظر کرتا ہوں"۔

اس نوٹ میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں اوّل یہ کہ سعدیٰ و سلیمیٰ کے پردے میں الفتِ حجاز کا اشارہ کیا ہے۔ عبدالقادر نے 'ملک' کی خدمت کی توفیق مانگی۔ دوسرے یہ کہ یہ نظم خط کے ساتھ انھیں ملی جس کے معنی ہیں کہ اقبال نے یورپ سے روانگی سے قبل یہ نظم مخزن کو بھیجی ہوگی گو مدیر نے اسے شائع کیا دسمبر ۱۹۰۸ء کے شمارے میں۔ اگست ستمبر اور نومبر ۱۹۰۸ء کے مخزن کے شماروں میں اقبال کی ولایت سے واپسی پر استقبالیہ نظمیں چھپی تھیں جو رختِ سفر کے آخر میں دی ہیں۔

ع ۱ جوش ملسیانی نے اپنی کتاب 'اقبال کی خامیاں' ص ۷۴ پر اس مصرع کی فارسیت پر طنز کرتے ہوئے پوچھا ہے کہ یہ کہاں کی زبان ہے۔

ع ۲ یوسف سلیم چشتی بتاتے ہیں کہ ۱۹۰۸ء میں دمشق سے مدینے تک ریل آگئی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے (شرحِ بانگِ درا ص ۲۲۷)

ع ۳ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے 'ایسا' لکھ کر بادہ کو مذکر باندھا ہے لیکن میرے خیال میں غالباً 'ایسا' کا تعلق دوسرے فقرے سے ہے یعنی شعر کی نثر یوں کی جائے گی۔

"بادہ دیرینہ اور گرم ہو، ایسا کہ جگرِ شیشہ و مینا نہ و مینا گداز کردیں"

یہاں 'ایسا' بہ معنی 'اس طرح' ہے۔ کردیں کا فاعل ہم (اقبال اور عبدالقادر) محذوف ہے۔

ع ۴ یہ شعر بیدل کا ہے (اکبر حسین قریشی: تلمیحات و اشاراتِ اقبال ص ۲۸۵)

صقلیہ

(جزیرۂ سسلی)

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا
آدمی آزاد، زنجیرِ توہم سے ہوا

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

آہ اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو

زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے

ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام
موجِ رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں؟
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں

درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا، میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

اگست ۱۹۰۸ء

حواشی - یہ نظم مخزن اگست ۱۹۰۸ء میں 'جزیرۂ سسلی' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کے قبل مدیر کا ایک نوٹ تھا جس کا آخری حصہ یہ ہے۔

" ہمارے دوست (اقبال) فرماتے ہیں کہ وہ رات کے وقت جہاز میں اس جزیرہ کے پاس سے گزرے اور اس کی روشنیوں کو دیکھ کر بعض خیالات اور جذبات نے یکایک ان کی طبیعت سے ہجوم کیا۔ یہ نالۂ موزوں ان ہی خیالات اور جذبات کا نتیجہ ہے۔"

(بحوالہ رخت سفر نقش ثانی ص ۱۹۰)

اقبال ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء کو یورپ سے دہلی پہنچے۔ سسلی کے سامنے سے جولائی کے پہلے ہفتے میں گزرے ہوں گے اور یہ نظم اسی وقت کی تصنیف ہوگی۔

عـلـه یوسف سلیم چشتی نے شرح بانگ درا میں لکھا ہے :

ابن بدروں اندلس کا مشہور ادیب اور شاعر تھا جس نے غرناطہ کی تباہی پر مرثیہ لکھا تھا[1]

بانگِ درا حصہ دوم میں اقبال کے قیام یورپ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ کا کلام ہے۔ ہم نے اس حصے کی تین نظموں کو اس کتاب میں جگہ نہیں دی کیونکہ وہ قیام یورپ کے بعد کی ہیں۔ اقبال نے سہواً انھیں قیام یورپ کی سمجھ لیا۔ وہ نظمیں یہ ہیں ۔

۱۔ ۔۔۔۔ کی گود میں بلی دیکھ کر ۲۔ عاشق ہرجائی

۳ ۔ نوائے غم

ایک ایک کو لیجیے :

---

[1] شرح بانگ درا ص ۲۲۹ - سلطانیہ بک ڈپو - دہلی

۱ - ..... کی گود میں بلی دیکھ کر۔ ذکرِ اقبال میں مرزا جلال الدین کے حوالے سے لکھا ہے : ایک دفعہ بمبا دلیپ سنگھ نے شالامار میں چائے کا انتظام کیا۔ اس کی کی آسٹریلین سہیلی کے علاوہ ایک اور یورپین خاتون بھی موجود تھی۔ ایک نے علامہ کی خدمت میں باغ کا ایک پھول پیش کیا۔ دوسری نے ایک خوب صورت بلی پال رکھی تھی جو اس کی گود میں بیٹھی تھی۔ علامہ کی دو نظمیں "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" اور "..... اس کی گود میں بلی دیکھ کر" اسی موقع کی یاد میں لکھی گئی تھیں۔

اقبال نے ۱۹۱۱ء کو عطیہ بیگم کے نام خط میں لکھا۔

"میں نے اپنے دوست سردار امراؤ سنگھ کو (میرا خیال ہے، آپ انھیں جانتی ہیں) لکھا ہے کہ مجھے اپنے ان اشعار کے انگریزی ترجمے کی ایک کاپی بھیج دیں۔ جو میں نے مس گوٹس مان کے (شہزادی دلیپ سنگھ کی ایک دوست) شالامار باغ سے ایک حسین پھول کو توڑ کر مجھے پیش کرنے پر لکھے تھے۔"

شہزادی بمبا دلیپ سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی تھیں۔ مس گوٹس مان جرمن خاتون ہوں گی یعنی شہزادی کی یوروپین دوست۔ اس طرح مرزا جلال الدین کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ بلی والی خاتون آسٹریلین سہیلی تھیں۔ جس سال یہ واقعہ ہوا، اقبال نے غالباً اسی سال مندرجہ بالا خط لکھ کر نظم کے انگریزی ترجمے کی کاپی حاصل کرنی چاہی ہوگی۔ اس طرح یہ نظم ۱۹۱۱ء کی تصنیف ہے۔ اگر اس سے پہلے کی بھی ہو تو یورپ سے واپسی کے بعد کی ہے۔

۲ - عاشقِ ہرجائی۔ اقبال نے ۱۷ر جولائی ۱۹۰۹ء کو لاہور سے عطیہ بیگم کے نام جو خط لکھا، اس کے ایک حصے کا ترجمہ یہ ہے۔

"اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے   کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

بہت سے لوگوں نے میرے بارے میں اسی طرح کے بیانات دیے ہیں اور میں اکثر اپنے اوپر ہنستا ہوں ..... اب میرا ارادہ ایسے بیانات کا حتمی جواب

دینے کا ہے جو آپ جلد مخزن میں شائع دیکھیں گی۔ لوگ میرے بارے میں جو سوچتے ہیں اسے میں نے عمدگی سے لکھ دیا ہے۔ میرا جواب ابھی نظم ہونا ہے۔"

اقبال کی دو ہی نظمیں 'زہد اور رندی' اور 'عاشقِ ہرجائی' ایسی ہیں جن میں اوّل ان کے بارے میں دوسروں کی رائے اور پھر ان کا (اقبال) جواب منظوم ہے۔ چونکہ مندرجہ بالا خط میں نظم 'زہد اور رندی' کا آخری شعر موجود ہے اس لیے ظاہر ہے کہ خط میں عاشقِ ہرجائی کی طرف اشارہ ہے یعنی ۱۷؍جولائی ۱۹۰۹ء کو یہ نظم نامکمل تھی۔ پروفیسر محمد عثمان نے "حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور اور دوسرے مضامین" (لاہور۔ ۱۹۶۴ء) میں لکھا تھا۔

بانگِ درا میں کئی نظمیں جو یورپ سے واپسی کے کئی سال بعد کی ہیں انھیں قیامِ یورپ کے حصّہ دوم میں درج کیا۔ نوائے غم اور عاشقِ ہرجائی ایسی دو نظمیں ہیں۔

۲۔ نوائے غم۔ اقبال نے عطیہ بیگم کو لاہور سے ۱۴؍دسمبر ۱۹۱۱ء کو ایک خط جس میں اپنی چار تازہ غیر مطبوعہ نظمیں شامل کی ہیں۔ انھیں میں نوائے غم شامل ہے اس نظم میں جو افسردگی اور یاسیت ہے وہ یورپ میں متوقع نہ تھی یورپ سے واپسی کے بعد کے ماحول کے عین مطابق ہے۔

ایسی تخلیقات جو زیرِ نظر کتاب کے دور کی نہیں معلوم ہوتیں

اس مجموعے میں اقبال کی یورپ سے واپسی یعنی جولائی ۱۹۰۸ء تک کی تخلیقات کو تاریخی ترتیب سے پیش کرنا مقصود رہا ہے۔ تخلیقات کی تصنیف کے زمانے کا اندازہ ان کی اوّلیں اشاعت سے کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اقبال نے انھیں کہنے کے بعد ایک دو مہینے کے اندر شائع کر دیا ہوگا۔ بانگ میں ایسی کئی تخلیقات ہیں جن کی رسالوں میں اشاعت کا علم نہیں۔ وہ شائع ضرور ہوئی ہوں گی کیونکہ رزّاق کی کلیات، بیاض اور کلامِ اقبال میں انھیں رسالوں ہی سے نقل کیا ہوگا، لیکن ان رسالوں کا پتا نہیں چل سکا ہے۔ ایسی چیزوں کے زمانے کا تخمینہ بانگِ درا میں ان کے وقوع کی بنا پر کیا گیا۔ لیکن منسوخ کلام میں بکثرت ایسی تخلیقات

میں جو باقیات کے حالیہ مجموعوں سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئیں یا کم از کم ہمیں ان کی اشاعت کا علم نہیں۔ ایسی چیزوں کا سب سے بڑا گنجینہ روزگارِ فقیر ہے۔ میں نے ان کے معیارِ فن اور موضوع کو دیکھ کر تاثراتی طور ان کے زمانے کا قیاس کیا ہے۔ بعض صورتوں میں میرے قیاس میں کئی سال تک کا سہو ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ گزشتہ اوراق میں ایسی چیزیں شامل کر لی گئی ہوں جو جولائی ۱۹۰۸ء کے بعد کی تخلیق تھیں۔

باقیاتِ اقبال طبع سوم (ممکن ہے طبع دوم میں بھی) میں بیشتر بغیر تاریخ کی تخلیقات روزگارِ فقیر سے لی ہیں لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جن کا ماخذ کچھ اور ہے۔ افسوس کہ مرتبِ باقیات نے بیشتر صورتوں میں اپنے ماخذ کی نشان دہی نہیں کی۔ ذیل میں روزگار فقیر اور باقیاتِ اقبال کی چند ایسی نظموں اور غزلوں کو درج کیا جاتا ہے جن پر کوئی تاریخ نہیں دی جن کی پختگی کو دیکھ کر زیادہ تر قیاس یہ ہے کہ یہ سفرِ یورپ سے بعد کی ہوں گی لیکن ضعیف امکان یہ بھی ہے کہ وہ پہلے کی ہوں۔ یہ سب منسوخ کلام کا جزو ہیں۔

طائرِ شام

لبریز ہے سرود سے تیرے سکوتِ شام — طائر کہاں ہے؟ ایک طلسمِ نوا ہے تو
انساں کی ہے جو شام وہ تاروں کی ہے سحر — خوابیدہ ہیں نجوم، ازل کی صدا ہے تو

حاشیہ۔ یہ اشعار روزگار ص ۳۴۷ میں منظومات کے متفرق اشعار کے عنوان سے دیے ہیں۔ ان کا عنوان 'طائرِ شام' ہے۔ باقیات ص ۱۷۱ پر انھیں 'سکوتِ شام' کے عنوان سے دیا ہے۔

غزل

تری شکست ہی منظور تھی اسے اے دل — بنا دیا مجھے نازک تر آبگینے سے
جہاں سے ملتی تھی اقبال روحِ قنبر کی — تجھے بھی ملتی ہے روزی اسی خزینے سے
ہمیشہ وردِ زباں ہے علی کا نام اقبال — کہ پیاس روح کی بجھتی ہے اس نگینے سے

حاشیہ ۔ اس کے پہلے اور تیسرے شعر کو روزگار ص ۳۵ پر نامکمل غزل کے طور پر درج کیا ہے ۔ باقیات کا ماخذ کچھ اور ہوگا ۔ وہاں ص ۴۵۵ پر اس کے تین اشعار درج ہیں
سلہ کہا جاتا ہے کہ ایک جواہر کا مزاج تر ہوتا ہے ۔ اس کے نگینے کو منہ میں رکھنے سے پیاس بجھ جاتی ہے ۔

غزل

نقش ہے تقدیر تیرے خامۂ تدبیر کا
ہے بغل پروردۂ امروز ہر فردا ترا
اک گھڑی میں شاخ سے پھوٹا کھِلا مرجھا گیا
کیا یہی محبوب تھا اے بلبلِ شیدا ترا!

روزگارِ فقیر ص ۳۰۶

غزل

مرے نالے تو ایسے تھے کہ پتھر بھی پگھل جاتے
الٰہی! تیری دنیا میں کوئی درد آشنا بھی ہے؟
پسند آیا مجھے اے گل! ترا اندازِ خاموشی
کہ تو اس باغ میں خاموش بھی، خونیں نوا بھی ہے

روزگارِ فقیر ص ۳۰۶
باقیات ص ۵۰۳

غزل

طور پر تو نے جو اے دیدۂ موسیٰ! دیکھا
وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہو کر
میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ
اُٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر
عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا
حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر
خلق معقول ہے، محسوس ہے خالق اے دل!
دیکھ نادان ذرا آپ سے غافل ہو کر

باقیات سوم ص ۴۵۲

ذیل کی چند تخلیقات اتنی پختہ ہیں کہ ان کے جولائی ۱۹۰۸ء سے پہلے کی تخلیق ہونے کا امکان کم سے کم ہے۔ ذیل میں ان کی محض نشان دہی کی جاتی ہے۔

غزل

قدسیوں کو رشک اس جمعیتِ خاطر پہ ہے — کچھ نہیں کھلتا کہ میں کس پریشانوں میں ہوں

چار اشعار کی یہ غزل روزگار ص ۳۰۸ پر ہے

غزل

دیکھ اے غافل یہ دنیا جائے آسائش نہیں — اس چمن سے کر گیا ہے آہوئے آرام رم

تین اشعار کی یہ غزل روزگار ص ۳۱۰ اور باقیات ص ۶۰۸ پر ہے۔

غزل

ٹٹ گرائنہ سکھلا گیا اسرارِ حیات — آبرو چاہے تو کر سختی خارا پیدا

سات اشعار کی یہ غزل روزگار ص ۲۹۹ - ۲۹۸ پر نیز باقیات ص ۵۸۸ - ۵۸۷ پر ہے

غزل

کھول دروازۂ خلوت گہہِ ناز اے ساقی! — دیکھ تو مجمعِ اربابِ نیاز اے ساقی!

سات اشعار کی یہ نہایت پختہ اور خوشگوار غزل روزگار ص ۳۰۳ ، ۳۰۲ نیز باقیات ۵۹۳ - ۵۹۲ پر ہے۔ یہ غزل اور اس سے پہلے کی غزل یورپ سے واپسی کے بعد ہی کی ہونی چاہئیں۔ معلوم نہیں اقبال نے انھیں مجموعوں میں کیوں شامل نہیں کیا۔

نظم

جوشِ نمود سے ہوا حسنِ بہار بے حجاب — (مصرع نہیں ہے) ....

اترے چمن کے بھیس میں کلیوں کے بھیس میں نجوم — کرتی ہے سیرِ بوستاں بن کے نسیم ماہتاب

یہ نظم روزگار ص ۳۵۰ اور باقیات ص ۶۰۵-۶۰۴ پر ہے بہاریہ قصیدہ یا بہاریہ غزل معلوم ہوتی ہے۔

روزگار و باقیات میں کچھ اور تخلیقات بھی ایسی ہیں جن کے زمانے کا علم نہیں لیکن ان کی پختگی اتنی زیادہ ہے کہ وہ جولائی ۱۹۰۸ء سے بعد ہی کی ہو سکتی ہیں ایسی منظومات کا ذکر قطع کیا جاتا ہے

اختلافاتِ نسخ

چاہیے تو یہ تھا کہ اختلافِ نسخ میں صرف ان متون کا احصار کیا جائے جو علامہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوئے ہوں یا قلمی صورت میں موجود میں آچکے ہوں۔ ان کے انتقال کے بعد کے باقیات کے مجموعوں کو نظرانداز کر دینا چاہیے تھا، لیکن ایسا ایک وجہ سے نہیں کیا گیا۔

اقبال کا کلام ان کی زندگی میں رسالوں میں شائع ہوا ہے ان میں سے بہت کم کو میں براہِ راست دیکھ سکا۔ انجمنِ حمایتِ اسلام کی ایک بھی روداد مجھے دستیاب نہ ہوسکی۔ باقیات کی کتابوں کے ابتدائی مرتبین نے، نیز شوقیہ بیاضوں کے مالکوں نے محذوف کلام کو علامہ اقبال کی زندگی کے کسی رسالے یا مجموعے ہی سے نقل کیا ہوگا۔ ثانوی ماخذ کے طور پر باقیات کے مجموعوں اور دو قلمی بیاضوں پر دارومدار کرنا پڑا ہے۔ اگر میں اصل ماخذ کی تلاش اور انتظار میں رہتا تو یہ کام کبھی پورا نہ ہو پاتا۔

باقیات کے مجموعوں کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے تدوینِ متن کے تقاضے کو نظرانداز کر کے اپنے فوری ماخذ کی نشان دہی نہیں کی۔ یہ کم و بیش یقینی ہے کہ ایک مجموعے نے بہت کچھ اپنے پیش رو مجموعوں سے نقل کیا ہے۔ جن صورتوں میں انھوں نے کسی قدیم رسالے کا حوالہ دیا ہے وہاں بھی ضروری نہیں کہ واقعی اسی رسالے سے لیا ہو۔ لیا ہوگا کسی دوسرے مجموعے سے، حوالہ دیا ہے مخزن یا زمانہ کا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی رسالے یا روداد کا حوالہ دینے والے دو مجموعوں کے متن میں فرق پایا جاتا ہے۔ ان مجموعوں میں ایسی نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں جن کا زمانہ معلوم نہیں۔ اگر باقیات کے ابتدائی مجموعے ان رسالوں یا مجموعوں کی نشاندہی کر دیتے جہاں سے انھوں نے ان تخلیقات کو لیا ہے تو ان کا زمانہ متعین کرنے میں سہولت ہوتی۔

یہ ایک افسوسناک صورتِ حال ہے کہ اقبال پر ہزار ڈیڑھ ہزار کتابیں لکھی جانے کے باوجود

ان کے کلام کا کوئی ایسا جامع اشاریہ نہیں بنا جس میں ان کی زندگی کے ان سب رسالوں اور مجموعوں کی نشان دہی کی گئی ہوتی جن میں ان کی کوئی تخلیق چھپی ہو۔ محمد انور خاں نے اپنی بیاض میں اقبال کی دو نظمیں 'قطرۂ اشک' اور 'سورت' دی ہیں۔ وہ کسی رسالے ہی سے لکھوں گی۔ کس سے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں۔ کلامِ اقبال کے اشاریے اس باب میں بالکل ناکام ہیں۔

میں نے اختلافِ متن دینے سے پہلے کوشش کی ہے کہ نظم یا غزل کی ابتدائی اشاعت کی نشان دہی کر دی جائے۔ نیز یہ بھی واضح کیا ہے کہ دو مخطوطوں اور باقیات کے مختلف مجموعوں میں اس تخلیق کی صورتِ حال کیا ہے۔

یہ نشان (ـــہ) اشارہ کرتا ہے اس کتاب کے متن میں دیے ہوئے حوالہ نمبر کی طرف۔ آئندہ اوراق میں ہمارے متن سے مراد اس کتاب میں پیچھے دیا ہوا متن ہے۔ نیز 'مطابقِ متن' سے مراد ہے اس کتاب کے متن کے مطابق۔ کاش کتابت و طباعت کے حلقۂ کامِ نہنگ سے گزرنے کے باوجود میرا پیش کیا ہوا متن کا ہر نازک اختلاف قارئین تک صحیح سلامت پہنچ سکے۔

کبوتروں سے متعلق اشعار

یہ اشعار سب سے پہلے رسالہ الزبیر، اقبال نمبر ۱۹۷۷ء، نمبر ۲، ص ۱۱ پر چھاپے گئے وہاں سے لے کر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ میں نقل کیے۔ میرا ماخذ یہی ہے۔ سید نذیر نیازی کی کتاب "دانائے راز، سوانحِ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال" میں ص ۶۸ پر اس بند کے محض پہلے دو مصرعے باختلافِ متن دیے ہیں۔

ـــہ دانائے راز ص ۶۸۔ جی میں آئی

ـــہ دانائے راز میں دوسرا مصرع یوں ہے۔

ع کوئی کالا، کوئی اسپید ہے، دو مٹیالے

غزل

ع آب تیغ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا

یہ غزل سب سے پہلے گلدستہ زبان، دہلی بابت ستمبر ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی جہاں سے لے کر بشیر الحق دیسنوی نے رسالہ آج کل بابت یکم مئی ۱۹۴۵ء میں درج کی۔ اس کے علاوہ تبرکات رخت، سرور، نوادر اور باقیات میں ملتی ہے۔

لہ نوادر: ع آب تیغ یار نے، تھوڑا سا لے کر رکھ دیا بقیہ سب میں مطابقِ متن

لہ سرود، باقیات اور نوادر: قبر پہ آج کل، تبرکات اور رخت: قبر پر

لہ سرود، باقیات اور نوادر: ہماری آج کل، تبرکات اور رخت: ہمارے

لہ آج کل اور تبرکات: کی، سہوِ کتابت بقیہ سب: کے

لہ نوادر: تیرے بقیہ سب: تیرا

لہ نوادر: پہنچا بقیہ سب: بھیجا

غزل

ع کیا مزہ بلبل کو آیا شیوۂ بےداد کا

یہ غزل سب سے پہلے گلدستہ زبان، دہلی بابت نومبر ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی جہاں سے لے کر بشیر الحق دیسنوی نے رسالہ آج کل بابت ۱۵/ جولائی ۱۹۴۴ء میں شائع کی۔ یہ قلمی کلام، تبرکات، باقیات اور نوادر میں بھی ہے۔

لہ باقیات: مزا۔ 'آج کل' میں واضح نہیں کہ مزہ لکھا ہے یا مزا۔ مزا پڑھنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ لغت کے اعتبار سے مزہ میں ہائے مختفی ہے، الف نہیں۔

لہ باقیات: رگِ دل بقیہ سب مع آج کل: مری رگ

غزل

ع جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں

یہ غزل اصلاً گلدستۂ زبان دہلی بابت فروری ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی. وہاں سے لے کر بشیر الحق دیسنوی نے آج کل بابت ۱۵/جولائی ۱۹۴۴ء میں اور پھر تبرکات میں شائع کی. یہ کلام، سرود، نوادر اور باقیات میں بھی شامل ہے. بیاض میں اس کے دو شعر یعنی مطلع اور ع۲ ہیں.

۱ه تبرکات: بتا، سہو کتابت

۲ه آج کل، کلام، تبرکات اور نوادر: کے لیے سرود اور باقیات: کس لیے

۳ه نوادر: کے بقیہ سب: سے

۴ه تبرکات: ہیں، سہو کتابت بقیہ سب: ہوا

غزل

ع تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے

جگن ناتھ آزاد کے مطابق یہ غزل سب سے پہلے رسالہ شورِ محشر بابت دسمبر ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی (رسالہ اکادمی، لکھنؤ بابت جنوری فروری ۱۸۹۶ء ص ۱۳) اس کے بعد محمد دین فوق کے گلدستہ بہارِ سخن (۱۹۰۱ء) میں شامل ہوئی

وہاں سے لے کر غفار شکیل نے نوادرِ اقبال ص ۳۱، ۳۰ پر شائع کی. اس میں ۱۳ شعر ہیں یعنی ہمارے متن کے نمبر ۹ - ۱۰ - ۱۴ کو چھوڑ کر اس کے بعد خدنگِ نظر لکھنؤ بابت مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی جہاں سے اسے تبرکاتِ اقبال میں نقل کیا گیا ہے. اس میں صرف پانچ شعر ہیں یعنی ۱ - ۱۵ - ۲ - ۸ - ۱۶. کلام میں آٹھ شعر ہیں ۱، ۲، ۳، ۴، ۸، ۱۳، ۱۴، ۱۵ ارزاق میں صرف دو شعر ۱۵ اور ۸ ہیں رختِ سفر میں صرف شعر ۱۵ ہے. سرودِ رفتہ میں ۱۲ شعر ہیں یعنی ۲ - ۱۳ - ۱۴ کو چھوڑ کر یہ تینوں

روزگار میں دیے ہیں۔ باقیات میں پورے ۱۶ اشعار ہیں لیکن دو حصوں میں۔ شروع میں بہارِ گلشن جلد دوم سے لے کر ۱۳ شعر دیے ہیں۔ بعد میں روزگار کے حوالے سے بقیہ تین شعر۔ عجیب بات یہ ہے کہ نوادر اور باقیات نے ۱۳ شعر مبینہ طور پر بہارِ گلشن جلد دوم سے لیے ہیں لیکن دونوں میں اختلاف ہے۔

۱؎ سرود: جادو نگاہِ چشم خریدارِ دل میں تھا۔ نوادر: جادو نگاہِ چشم خریدارِ دل ہی تھا بیاض عماد، تبرکات اور باقیات، مطابقِ متن

۲؎ نوادر، کیا ہیں نشانِ تیزِ کمانِ ہلال کے، 'تیز' سہو کتابت معلوم ہوتا ہے، 'تیر' صحیح ہے۔
سرود و باقیات: مطابقِ متن

۳؎ روزگار میں حکیم احمد شجاع نے لکھا ہے کہ یہ مصرع ع 'قطرے گرے تھے جو عرقِ انفعال کے' ہے، اکثر لوگ اسے غلط پڑھتے ہیں (ص ۴۲، ۴۳) عبداللطیف اعظمی 'اقبال دانائے راز' (ص ۲۵) میں لکھتے ہیں کہ جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب 'اقبال اور کشمیر' (ص ۳۶، سری نگر، ۱۹۷۷) میں غلام رسول مہر اور سید فقیر وحیدالدین کے حوالے سے 'قطرے گرے تھے جو عرقِ انفعال کے' کو ہی صحیح بتایا ہے۔

۴؎ سرود: بے دی اور گالیاں

۵؎ سرود: بگڑے میاں۔ ظاہرا سہوِ کتابت

۶؎ نوادر: تھے۔ سرود اور باقیات: ہو

۷؎ روزگار: ڈوپٹہ (ص ۲۷۶) سرود اور باقیات: دوپٹہ

۸؎ باقیات: کانٹا

فلاحِ قوم
(منسوخ)

اس نظم کا نقشِ اول فروری ۱۸۹۶ء میں 'انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند' میں پیش کیا گیا۔

اس وقت اس میں ۲۵ شعر تھے۔ نظرِ ثانی کے بعد کشمیری میگزین لاہور میں شائع ہوئی۔ تب اس میں ۲۷ شعر ہو گئے (بحوالہ اقبال دانائے راز، ص ۲۱۵)

بیاض میں اس کا عنوان نظمِ اقبال ہے اور اس میں پورے ۲۷ شعر ہیں۔

نوادر میں اس نظم کو براہِ راست کشمیری میگزین ۱۹۰۹ء سے لیا ہے اور وہاں اس کا عنوان 'ترقی و تعلیم' دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً اس کا عنوان 'فلاحِ قوم' تھا، نظرِ ثانی کے بعد 'ترقی و تعلیم' کر دیا گیا۔ رزاق کے مقدمے میں یہ نظم درج ہے۔ وہاں اس میں محض ۱۱ شعر ہیں۔ باقیاتِ اقبال طبعِ اوّل میں اس نظم کے انھیں ۱۱ شعروں کو غزل کے عنوان سے دیا ہے حالانکہ اس میں غزل کی کوئی خصوصیت نہیں۔ باقیات طبعِ سوم میں پورے ۲۷ شعر ہیں۔

۱؎ رزاق، بیاض، نوادر: جاں بھی کہ جیسے۔ سرود اور باقیات: مطابقِ متن

۲؎ بیاض، نوادر: مجھ کو۔ سرود، باقیات: بسکہ

۳؎ بیاض، نوادر: مری۔ رزاق، سرود و باقیات: مرے

۴؎ سرود و باقیات: انھی۔ بیاض، نوادر: انھیں

۵؎ بیاض، نوادر: کے ہوئے۔ سرود و باقیات: سے ہوئی

۶؎ نوادر: مشوں (سہوِ کتابت)

۷؎ نوادر: اب۔ بقیہ سب: اک

۸؎ سرود اور باقیات: خوشی سے آکے خدا جانے کیا کہا اس نے، بیاض، نوادر: مطابقِ متن

۹؎ بیاض، نوادر: کرم سے اس کی وہ صورت فلاح کی نکلے۔ سرود، رزاق، باقیات: مطابقِ متن

۱۰؎ باقیات: ہو گیا ہے مصوں (سہوِ کتابت) سرود و نوادر: ہو گیا مصنّوں

۱۱؎ بیاض: کو۔ سہوِ کتابت۔ بقیہ سب: کا

۱۲؎ بیاض، نوادر: کو۔ رزاق، سرود اور باقیات: میں

غزل

(منسوخ)

ع   تصور بھی جو بندھتا ہے تو خالِ روئے جاناں کا

یہ غزل سب سے پہلے رسالہ شورِ محشر لاہور بابت دسمبر ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔ وہاں سے لے کر اول سرودِ رفتہ میں اور پھر باقیات طبعِ سوم میں درج کی گئی ۔ دونوں میں کوئی اختلافِ متن نہیں۔ محمد عبداللہ قریشی نے حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں، طبعِ اول مئی ۱۹۸۲ء لاہور، میں ص ۰، پر یہ پوری غزل نقل کی ہے۔

لہ فوق کا مضمون حالاتِ اقبال مشمولہ نوادر نیز رزاق ص ۳۲ : اس پر نہیں نازاں ۔ سرود باقیات اور حکیم احمد شجاع کا مضمون مشمولہ نقوش ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۱۱ : نازاں نہیں اس پر

کشمیر سے متعلق قطعات

ان قطعات میں سے پہلے آٹھ کشمیری گزٹ بابت ۱۵/ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئے۔ عبداللطیف اعظمی کی توقیت کے مطابق کشمیری میگزین اکتوبر ۱۹۰۹ء میں رباعیاتِ اقبال کے عنوان سے آٹھ رباعیات شائع ہوئیں (دانائے راز ص ۰،) یہ بیاضِ عماد اور نوادر میں ہیں نمبر ۳، ۴، ۵، ۸، رزاق کے دیباچے میں ہیں۔ ۱، ۲، ۴، ۵، ۶، ۷، باقیاتِ اقبال طبعِ اوّل وسوم میں ہیں۔ نمبر ۹ باقیات سوم ص ۰، ۲ پر ہے، ۸، ۹ تبرکات میں شائع ہوئے، سرود میں یہ نو کے نو ہیں، آٹھ ص ۲۲۵، ۲۲۶ پر اور نواں ص ۲۴۵ پر۔ اس طرح نواں قطعہ صرف تبرکات، سرود اور باقیات طبعِ سوم میں ہے۔

لہ بیاض، نوادر : ہیں۔ سرود : ہے

۲ہ نوادر : خفا، بقیہ سب : جفا

۳ہ نوادر : ہائے گل ظاہرا سہو کتابت

۴ہ نوادر : ع چشمِ اغیار میں بھی بڑھتی ہے اس سے توقیر ۔ بقیہ سب : مطابقِ متن

۵ہ بیاض : کے، بقیہ : کی

غزل
(منسوخ)

ع ضد سے قمری نے کہا تم کو گلِ تر کا جواب

یہ غزل پہلے روزگار میں ص ۲۶۴ تا ۲۶۵ پر شائع ہوئی، پھر باقیات میں ص ۴، ۵ تا ۶، ۵ پر

لہ باقیات : روز کہتا تھا کہیں مرتے نہیں ، روزگار : مطابقِ متن
۲ہ روزگار : راحت ۔ باقیات : رافت

غزل نامکمل
(منسوخ)

کس طرح ٹل گئی اللہ ہماری آئی

یہ غزل روزگار اور باقیات میں ہے ۔ باقیات میں آخری دو نامکمل اشعار کے مصرعِ ثانی
نہیں دیے صرف یہ مکمل اشعار ص ۵۹۱ پر درج کیے ہیں ۔

غزل
(منسوخ)

ع کام بلبل نے کیا ہے مانی بہزاد کا

یہ غزل روزگار ص ۳۰۱ ، ۳۰۰ پر ملتی ہے جہاں بیاضِ اعجاز سے لی گئی ہو گی ۔
باقیات ص ۲ ، ۵ - ۱۷ ، ۵ کا ماخذ روزگار ہونا چاہیے ۔

لہ باقیات : آتی ۔ روزگار : آئی
۲ہ باقیات سوم : یاد آتا ۔ روزگار ۔ یا آتا

غزل

(منسوخ)

ع دو گھڑی کے ابال ہوتے ہیں

یہ غزل روزگار ص ۲۸۲ تا ۲۸۴ اور باقیات ص ۴۲۴ - ۴۲۳ پر ہے۔ بیاضِ اعجاز سے روزگار میں۔ اور روزگار سے باقیات میں لی گئی ہوگی۔

لہ باقیات: کا۔ روزگار: کے

۲ہ دانائے راز از نذیر نیازی ص ۸۴؛ کس طرح کے ظاہرا سہوِ حافظہ

۳ہ باقیات: پھر کا۔ سہوِ کتابت

۴ہ باقیات: شعرِ اقبال سے نہ ہو حیراں۔ روزگار مطابق متن۔ باقیات کا مصرع زیادہ چست ہے لیکن وہاں ماخذ کا ذکر نہیں۔ روزگار زیادہ معتبر ہے۔

غزل

(منسوخ)

ع تیرے مریض کو تپِ فرقت ہے کیا لگی

اس غزل کو بیاضِ اعجاز سے لے کر روزگار میں ص ۲۹۲ - ۲۹۱ پر درج کیا گیا۔ ظاہرا وہیں سے لے کر باقیات ص ۵۸۶ - ۵۸۵ پر نقل کی گئی۔ باقیات میں ص ۵۰۱ پر الگ سے مطلع و مقطع درج ہیں۔ نذیر نیازی کی دانائے راز میں ص ۵۰ پر چوتھا شعر نقل کیا گیا ہے۔

غزل

(منسوخ)

ع خارِ صحرا نہ سہی، دشت کے پتھر ہی سہی

اس غزل کے دو اشعار (پانچواں اور مقطع) شیخ عبدالقادر نے اپنے مضمون اقبال کی شاعری کا ابتدائی دور میں درج کیے۔ جگن ناتھ آزاد کے مطابق یہ مضمون روزنامہ امروز لاہور (اقبال نمبر)

۲۶/اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا (رسالہ اکادمی لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۸۶ء ص ۲۷) وہاں سے لے کر ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب "زندہ رود، حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور" لاہور ۱۹۷۹ء میں ص ۹۷ پر درج کیے لیکن یہ ان سے پہلے سرود میں ص ۱۱۲ پر دیے جا چکے تھے۔ انھیں دو شعروں کو محمد عبداللہ قریشی نے حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں' لاہور مئی ۱۹۸۲ء میں ص ۶۷ پر درج کیا ان دو اشعار کو چھوڑ کر بقیہ آٹھ روزگار ص ۲۵۹ پر دیے ہیں۔ پورے دس اشعار باقیاتِ اقبال میں ص ۱۳۴ تا ۴۳۳ پر ہیں۔

لہ مصرعِ اول - حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں: مجھ کو۔ بقیہ سب میں: مجھے زندہ رود میں شیخ عبدالقادر کے حوالے سے مصرعِ اولیٰ یوں ہے ع خوب سوجھی ہے تہِ دام پھڑک جاؤں گا'۔ سرود اور باقیات میں مطابق متن

۲ہ عبدالقادر اور زندہ رود: میں چمن میں نہ رہوں گا۔ سرود و باقیات: مطابقِ متن

۳ہ عبدالقادر، زندہ رود: شعر کہنا نہیں اقبال کو آتا لیکن۔ سرود، باقیات اور حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں: مطابقِ متن

۴ہ عبدالقادر، زندہ رود: آپ کہتے ہیں۔ سرود، باقیات اور حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں: مطابقِ متن۔

غزل

(منسوخ)

ع میرے تپِ دروں کا بیاں قصہ خواں نہ ہو

یہ غزل پہلی بار روزگار ص ۲۸۸ تا ۲۹۰ پر شائع ہوئی۔ وہاں بیاض اعجاز سے لی گئی۔ باقیات میں یہ ص ۵۸۳ تا ۵۸۴ پر ہے لیکن وہاں نامکمل شعر نہیں

لہ باقیات: آسماں۔ سہوِ کتابت

غزل

(منسوخ)

ع جس کو شہرت بھی ترستی ہے وہ رسوا اور ہے

اس غزل کا پانچواں شعر یوں تو اے صیاد ...... رزاق (ص ۲۴) رخت (ص ۱۱۱) اور نوادر (ص ۲۹۸) میں ملتا ہے۔ بقیہ اشعار روزگار میں ص ۲۶۸ تا ۲۷۰ پر دیے گئے۔ باقیات سوم میں یہ غزل دو حصوں میں ص ۴۳۹ اور ص ۵۹۴ پر دی گئی ہے۔ نذیر نیازی کی دانائے راز میں ص ۸۵ پر اس کا مطلع اور مقطع نقل کیا گیا ہے۔

لہ دانائے راز، ترستی تھی۔ بقیہ سب میں: ترستی ہے

لہ دانائے راز، تڑپ اٹھے۔ روزگار۔ پھڑک جائیں

نالۂ یتیم

یہ نظم سب سے پہلے انجمن حمایت اسلام کی رپورٹ بابت ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد رزاق اور احمد دین کی کتاب میں آزادی کے بعد اقبال کے منسوخ کلام کے سبھی مجموعوں میں شامل ہے۔ بند نمبر ۲۰، انجمن لاہور میں اک ..... صرف ایک مجموعے سرود رفتہ ص ۱۰ میں ملتا ہے جہاں روئداد انجمن سے نقل کیا گیا ہے۔ ۲۴ واں بند احمد دین کے یہاں نہیں

لہ رزاق، رخت اور سرود: ایسا۔ احمد دین، باقیات اور نوادر: اپنا

لہ رزاق اور باقیات: نغمہ سرائے۔ بقیہ سب میں: نغمہ سرائی،

لہ سرود: اب۔ بقیہ سب: یوں

لہ باقیات: اسلام۔ بقیہ سب۔ امید

لہ احمد دین: فقط۔ بقیہ سب: مگر

لہ رخت: یاری اندر۔ بقیہ سب: دوستی از

لہ رخت: گو۔ بقیہ سب: کو

۸ سرود : باد - بقیہ سب : یاد

۹ احمد دین : نور - بقیہ سب : سوز

۱۰ سرود : خنداں ہے پیشانی - بقیہ سب : ہے خندہ پیشانی

۱۱ احمد دین : تصوّر - بقیہ سب : تبسّم - احمد دین میں بھی پانچویں مصرع میں تبسّم ہے .

۱۲ احمد دین : ہے تونے کیا . نوادر اور باقیات : یہ تونے کیا - زراق ، رخت اور سرود : تونے یہ کیا

۱۳ صرف نوادر : شجاعت . ظاہراً سہوِ کتابت

۱۴ زراق ، احمد دین ، کی - باقیات ، سرود ، نوادر : مطابق متن 'کا'

۱۵ ، ۱۶ سرود کے علاوہ سب میں ردیف 'سکتی' ہے . صرف سرود میں سکتے ہے چونکہ تین فاعل آمد ، لذت ، زیر و بم ہیں اس لیے فعل میں جمع کا صیغہ چاہیے . آخری فاعل زیر و بم مذکر ہے اس لیے فعل کو جمع مذکر ہونا چاہیے یعنی 'سکتے' ، اگر زیر و بم کو مونث باندھا گیا ہوتا تو تینوں فاعل مونث ہوتے اور اس صورت میں فعل جمع مونث کا صیغہ ہوتا یعنی 'سکتیں نہیں' ، سکتی واحد ہے .

۱۷ سرود : انسان کا تھا - بقیہ سب : انسان کا تھا وہ

۱۸ احمد دین میں مصرعِ ثانی میں بھی یہ پہلو ہے جو سہوِ کتابت ہے

۱۹ زراق ، احمد دین : ہو - بقیہ سب : ہوں

۲۰ احمد دین : تیرے - بقیہ سب : تیری . صحیح تر 'تیرے' ہے کیونکہ مصرع کی نثر ہوگی (یہ زمین) تیری فخرِ پابوسی سے آسماں سا ہوگئی . فخر مذکر ہے اس لیے 'تیرے فخر' مرجح ہے ہاں فارسی اضافت نہ ہوتی تو 'تیری پابوسی کے فخر سے' کہا جاتا . فی الحال بیشتر مستند مجموعوں میں 'تیری' ہونے کی وجہ سے اسی کو شاعر کا متن ماننا ہوگا .

۲۱ تمام مجموعوں میں بہ شمولِ رخت 'بربادی' چھپا ہے لیکن رخت کے اغلاط نامہ میں اسے 'آبادی' بنانے کی ہدایت ہے . معنوی اعتبار سے 'آبادی' بہتر ہے لیکن چونکہ سبھی متون میں 'بربادی' دیا ہے اس لیے ہم نے یہی رکھا .

۲۲ نوادر ص ۱۱۸ پر اس بند کا دوسرا اور تیسرا مصرع حذف ہوگیا ہے .

۲۳ؔ باقیات، نوادر: ان۔ بقیہ سب: ہم

۲۴ؔ سرود کے علاوہ بقیہ سب: بڑی۔ سرود: بڑے۔ یہی صحیح ہے کیونکہ مذکر کام سے پہلے مذکر بڑے آنا چاہیے نہ کہ مونث ابڑی۔

۲۵ؔ باقیات، نوادر: کہیں۔ بقیہ سب: کبھی

خدا حافظ

منشی محبوب عالم کے سفر یورپ پر الوداعی نظم

(منسوخ)

یہ نظم سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں پیسہ اخبار لاہور میں شائع ہوئی پھر منشی محبوب عالم کے 'سفر نامۂ یورپ، بلادِ روم و شام و مصر' ۱۹۰۸ء میں ص ۱۸ - ۱۷ پر یہ سرود، تبرکات (ص ۵۹) رخت (طبع ثانی ص ۱۸۴) اور باقیات (طبع سوم ص ۵۲) میں بھی ملتی ہے۔

۱ؔ رخت اور تبرکات: کی۔ سرود و باقیات: کا

۲ؔ یہ شعر سرود اور باقیات میں نہیں

رخت۔ تبرکات: اور موجوں۔ رخت۔ اور وہ موجوں

۳ؔ رخت اور تبرکات: آئے گا (سہوِ کتابت) سرود و باقیات: آیئے گا

۴ؔ تبرکات: کفرو بجو۔ بقیہ میں: کفر ابجو

۵ؔ سرود اور باقیات میں سفر کا قافیہ پہلے مصرع میں اور حضر دوسرے میں ہے۔ رخت اور تبرکات میں اس کے برعکس ہے۔ چونکہ آخری دونوں نے اصل سفر نامے سے نقل کیا ہے اس لیے ان کے متن کو ترجیح دی گئی۔

۶ؔ یہ شعر تبرکات میں چھوٹ گیا ہے۔

۷ؔ تبرکات میں سہواً کی حذف ہو گیا ہے۔

شمعِ ہستی

(منسوخ)

یہ نظم رسالہ معارف علی گڑھ زیرِ ادارتِ مولوی وحید الدین سلیم بابت ستمبر ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔ وہاں سے لے کر لطف اللہ بدوی نے اقبال ریویو کراچی جنوری ۱۹۶۵ء میں 'اقبال کی ایک فراموش شدہ نظم' کے عنوان سے چھاپ دیا۔ حیرت ہے کہ یہ اقبال کے غیر متداول کلام کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ اسی نظم کو بشیر احمد ڈار نے انوارِ اقبال طبع دوم ۱۹۷۷ء لاہور کے آخر میں شامل کیا ہے۔ طبعِ اول میری نظر سے نہیں گزری۔ انوارِ اقبال کا متن بہتر ہے۔ اقبال ریویو اور انوارِ اقبال دونوں میں ایک ایک شعر ایسا ہے جو دوسرے میں نہیں۔

ؔ۱ اقبال ریویو میں 'تیرا' چھپنے سے چھوٹ گیا ہے۔

ؔ۲ انوار: سروتن۔ اقبال ریویو سروبُن۔ قافیے کا تقاضا بُن ہی کا ہے۔

ؔ۳ یہ شعر اقبال ریویو میں نہیں۔

ؔ۴ اقبال ریویو: لہلائی۔ سہوِ کتابت

ؔ۵ انوارِ اقبال میں یہ شعر غیر حاضر ہے۔ اس سے پہلے خطِّ فاصل کھینچ کر اس بند کے دو حصے کر دیے ہیں۔

ؔ۶ اقبال ریویو، آرگن۔ انوار: ارگن جو وزن کے لحاظ سے درست ہے۔

ؔ۷ اقبال ریویو: ہیں' جو سہوِ کتابت ہے۔

قطعاتِ تاریخِ طباعت

مثنوی عقدِ گوہر یعنی موتیوں کا ہار

پیرزادہ محمد حسین نے مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ کیا اور اس کا نام عقدِ گوہر یعنی موتیوں کا ہار رکھا۔ کتاب ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۱ء میں طبع ہوئی۔ اس کے آخر میں اقبال کے یہ قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔ جناب کسریٰ منہاس نے اپنے مضمون اردو اور تاریخ گوئی، مشمولہ نقوش اقبال نمبر اوّل۔ شمارہ ۱۲۱، بابت ستمبر ۱۹۷۷ء میں یہ سب قطعات دیے ہیں۔ یہ باقیاتِ اقبال طبعِ سوم

۱۹۷۸ء ص ۴۸۰ تا ۴۸۳ پر بھی شامل ہیں۔

غزل

(منسوخ)

ع کتنے غافل جہان والے ہیں

اس غزل کے پانچ شعر روزگار ص ۲۷۹ میں بیاضِ اعجاز سے لے کر دیئے ہیں۔ باقیات میں محض ۱، ۲، ۵ ہیں جس سے ظاہر ہے کہ اس کا ماخذ روزگار نہیں کچھ اور ہے۔

غزل

(منسوخ)

ع تم نے آغازِ محبت میں یہ سوچا ہو گا

یہ غزل بہارِ گلشن جلد دوم مرتبۂ محمدؐ دین فوق سے لی گئی۔ اس کے علاوہ کلامِ اقبال، سرود، نوادر اور باقیات طبعِ سوم میں بھی ہے۔ کلام میں محض پانچ شعر ہیں۔ نوادر ص ۳۲ پر اس کا ماخذ بہارِ گلشن ۱۹۰۱ء مرتبۂ محمدؐ دین فوق دیا ہے۔ وہاں شعر [5] موجود نہیں۔ سرود ص ۲۴۰ اور باقیات ص ۴۲۳ - ۴۲۲ میں جملہ آٹھ شعر ہیں۔ باقیات میں بھی اس کا ماخذ بہارِ گلشن جلد دوم دیا ہے جس کے معنی ہیں نوادر میں ایک شعر نقل ہونے سے رہ گیا۔

[1] سرود: نہیں۔ سہوِ کتابت [2] سرود، نوادر، باقیات: مرا۔ کلام: مرے [3] باقیات: تم۔ بقیہ سب: تجھ

غزل

(منسوخ)

ع کہ بت بن گئے آج سب برہمن بھی

یہ غزل روزگار ص ۲۹۸ - ۲۹۷ پر اور باقیات ۵۰۸ - ۵۰۷ پر ہے۔ اس کا مقطع مشہور

ہے چنانچہ جاوید اقبال نے زندہ رود، حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور' ۹، ۱۹ء میں اسے ص ۰ ۷ پر درج کیا ہے۔ ان کا ماخذ روزگار جلد دوم ص ۲۹۸ ہے۔

فرد

اقبال میرے نام......ممکن نہیں شکست

لہ بیاض : دیکھنا۔ سرود و باقیات : دیکھیے۔

عیشِ جوانی

(منسوخ)

یہ نظم سب سے پہلے صفدر مزار پوری کی مرتبہ 'نیچرل شاعری' میں ص ۲۶ تا ۲۸ پر دی گئی۔ وہاں سے نوادر ص ۲۲۲ تا ۲۲۹ پر نقل کی گئی اور نوادر سے باقیات ص ۵۱۷ تا ۵۲۳ پر۔ نیچرل شاعری کے اختلافاتِ متن مجھے ڈاکٹر سید سلیمان حسین، شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی سے ملے۔

لہ باقیات : نکھڑی۔ سہوِ کتابت

ٰٰ٢ باقیات : ریحان۔ نیچرل شاعری اور نوادر : ریعان

۳ نوادر، باقیات : بھینی بھینی۔ نیچرل شاعری : بھینے بھینے

۴ نوادر : میں وہ بیلے کی بہار۔ باقیات : ہیں بیلے کی بہار، نیچرل شاعری : ہیں وہ بیلے کے ہار

۵ نوادر، باقیات : خرام۔ نیچرل شاعری : خمار

۶ نوادر : لطف یکجائی سامانِ لذتِ بوس و کنار۔ ناقص قرات و کتابت۔ نیچرل شاعری اور باقیات : مطابقِ متن

۷ باقیات : کملائے

۸ نوادر : آسماں دونِ شعار۔ باقیات : آسمانِ دون شعار

۹ نوادر: ٹوٹتی: نیچرل شاعری لوٹتی۔ یہ شعر اور اس کے بعد کے دو شعر باقیات میں حذف ہو گئے ہیں۔

۱۰ نوادر اور باقیات: اب ہٹ کر۔ نیچرل شاعری: ہے کروٹ

گلِ خزاں دیدہ

(منسوخ)

یہ نظم سب سے پہلے صفدر مرزا پوری کی مرتبہ نیچرل شاعری میں شائع ہوئی۔ وہاں سے نوادر ص ۲۱۸ تا ۲۲۱ پر نقل کی گئی۔ باقیات میں یہ ص ۵۱۳ تا ۵۱۶ پر ہے۔ نیچرل شاعری میں اس کے اختلافاتِ نسخ کی تفصیل مجھے ڈاکٹر سلیمان حسین شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے بہم پہنچائی۔

۱ نوادر: خرق۔ سہوِ کتابت

۲ باقیات: کو۔ نیچرل شاعری اور نوادر: میں

۳ باقیات: بادۂ گل۔ نیچرل شاعری اور نوادر: پردۂ گل

۴ نیچرل شاعری: گہوارہ جناں۔ سہوِ کتابت۔ نوادر: گہوارۂ جناں۔ باقیات۔ گہوارہ جنباں

۵ باقیات میں 'فتاں' حذف ہے اور یہاں خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ کاتب اس لفظ کو پڑھ نہ سکا ہوگا۔

۶ باقیات: تھالیاں میں بھی۔ سہوِ کتابت۔ نیچرل شاعری اور نوادر: تھابیاباں میں

اشکِ خوں

دورِ حاضر میں یہ مرثیہ سب سے پہلے سرودِ رفتہ میں چھپا۔ وہاں صراحت ہے کہ یہ مطبعِ خادم التعلیم سے کتابچے کی شکل میں چھاپا گیا تھا۔ سرود میں اسی سے نقل کیا گیا ہے۔ باقیات

طبعِ سوم میں بھی مرثیے کو مطبع خادم التعلیم سے نقل کیا گیا ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ سرود اور باقیات میں کہیں کہیں اختلافِ متن ہے یعنی نقل میں احتیاط نہیں کی گئی۔ دوسری طرف قاضی فضل حق قریشی کے پاس مطبعِ مفیدِ عام لاہور کا مطبوعہ مرثیہ ہے جس سے انھوں نے سرود اور مفیدِ عام کے اختلافاتِ نسخ اپنے مضمون 'باقیاتِ اقبال' رسالہ اردو کراچی شمارہ ۳، ۱۹۶۹ء میں دیے۔ ذیل کی تفصیل میں مفیدِ عام سے مراد اسی مضمون کے اندراجات ہیں۔

۱؎ مفیدِ عام: سے۔ سرود و باقیات: کے

۲؎ مفیدِ عام: خوار۔ سرود و باقیات: خار

۳؎ باقیات: راہ گزار۔ سرود: رہ گزار

۴؎ سرود: کوئی نہ۔ باقیات: نہ کوئی

۵؎ سرود و باقیات: ہوتی۔ مفیدِ عام: پھرتی

۶؎ باقیات: دیوانہ وار۔ سرود: پروانہ وار

۷؎ سرود و باقیات: آکے لگے۔ مفیدِ عام: آگئے لگے

۸؎ سرود و باقیات: ہو رہی۔ مفیدِ عام: رو رہی

۹؎ سرود: ہم چشم: باقیات: ہو چشم

۱۰؎ سرود: ہو۔ باقیات: ہوں

۱۱؎ سرود: تیرے۔ باقیات: تیری

۱۲؎ مفیدِ عام: نہریں۔ سرود و باقیات: موجیں

۱۳؎ مفیدِ عام: خزینوں۔ سرود و باقیات: نگینوں

۱۴؎ سرود و باقیات: بکی تھی۔ مفیدِ عام: میں اک۔ دوسرے مصرع کی 'تھی' کے پیشِ نظر پہلے مصرع میں 'تھی' نہیں آنا چاہیے۔

۱۵؎ مفیدِ عام: پر۔ سرود و باقیات: تک

۱۶؎ سرود و باقیات: پاس۔ سہوِ کتابت۔ مفیدِ عام: یاس

۱۷؎ سرود و باقیات: ایسے۔ مفیدِ عام: اپنے

۱۸؎ مفیدِعام : کوسوزاں ۔ سرود و باقیات ۔ فروزاں
۱۹؎ باقیات : درخشاں ۔ سرود : دُرافشاں
۲۰؎ مفید عام : ہاں اسے ۔ سرود و باقیات : اُسے
۲۱؎ سرود و باقیات : سے ۔ مفید عام ۔ میں
۲۲؎ مفید عام : صدمہ پڑا وہ آکے ۔ سرود و باقیات : مطابقِ متن
۲۳؎ مفید عام : تیری ۔ سرود و باقیات : تیرا
۲۴؎ سرود : تم ۔ مفیدِ عام و باقیات : ہم
۲۵؎ باقیات : ایسا جو آئے ۔ سرود : آئے جو ایسا
۲۶؎ مفید عام : کِھلتا تھا جس پہ تو بہ ۔ سرود و باقیات : زینت تھی جس سے تجھ کو
۲۷؎ سرود و باقیات : دور ۔ مفید عام : [illegible]
۲۸؎ مفیدِ عام : تیری ۔ سرود و باقیات : تیرا
۲۹؎ باقیات : بجائے ۔ سرود و مفیدِ عام : مثال

دردِ دل

یا

یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے

(منسوخ)

یہ نظم احمد دین کی اقبال، قلمی کلام، سرود، نوادر اور باقیات میں مکمل ہے۔ رزاق کی کلیات میں اس کے چار بند علیحدہ نظموں کے طور پر ہیں بہ تفصیلِ ذیل۔

نظم شام ص ۳۵ دراصل بند ششم ۔ ٹیپ کی بیت یہ ہے

خامشی زا ہے ترا انتظارا ۔۔۔ آہ یہ حُسنِ انجمن آرا

نظم ہلال عید ص ۴۸ دراصل پہلا بند جس کا چھٹا شعر حذف ہے۔ بیاض ص ۱۲۸ میں بھی یہ نظم

اسی طرح ہے اور اسے مخزن دسمبر ۱۹۰۴ء سے نقل کیا ہے۔ مخزن میں بھی نو شعر ہیں۔
نظم دنیا ص ۹۷-۹۶ دراصل گیارھواں بند۔ ہمارے متن کے لحاظ سے ترتیب اشعار یوں ہے
۱، ۵، ۷، ۳، ۲، ۶، ۹۔ اس طرح ہمارے متن کے لحاظ سے شعر ۴، ۸ حذف ہیں۔ ٹیپ میں
ہمارے متن کے دسویں بند کی بیت ہے۔
نظم مفلسی ص ۹۸-۹۷۔ دراصل دسواں بند ہے۔ ہمارے متن کے لحاظ سے ترتیب اشعار یہ
ہے ۱، ۲، ۳، ۵، ۸، ۹، ۶۔ اس طرح ہمارے متن کے شعر ۴، ۷ حذف ہیں۔ ٹیپ ہمارے متن
کے نویں بند کی بیت ہے۔ یہی کیفیت بیاض اور رخت کی ہے۔
رختِ سفر میں بھی یہی کیفیت ہے:
ص ۱۰۴ ہلالِ عید رزاق کی تفصیل سے
ص ۱۱۲۔ بند ششم کا صرف شعر ۹
عید آئی ہے اے لباسِ کہن اب ترے چاک پھر سلائیں گے
ص ۱۳۲-۱۳۱ شام رزاق کی تفصیل سے
ص ۱۳۳-۱۳۲ دنیا رزاق کی تفصیل سے
ص ۱۳۳ مفلسی رزاق کی تفصیل سے جس کے معنی ہیں کہ رخت کا ماخذ رزاق ہے۔ بیاضِ
عماد میں ص ۸۶ پر شام، رزاق کے مطابق
بیاضِ عماد میں ص ۱۰۹ پر 'دنیا' رزاق کے مطابق ہے لیکن اس میں ہمارے متن کا شعر ۸ بھی
ہے جو رزاق میں نہیں۔ بیاض میں کل نو شعر ہیں۔ ٹیپ کے دوسرے مصرع میں سہواً قافیہ 'ہے
خار پسند' لکھ دیا گیا ہے۔
بیاضِ عماد میں ص ۱۴۳ پر 'مفلسی' رزاق کے مطابق ہے
کلامِ اقبال میں یہ نظم چار جگہ ہے۔ گیارھواں بند 'دنیا' کے عنوان سے ہے۔ پھر پوری نظم، پھر
چھٹا بند شام کے عنوان سے اور پھر دسواں بند مفلسی کے عنوان سے۔ پنجۂ فولاد لاہور کے مختلف
شماروں میں بعض نظموں کے عنوان اس نظم کے بندوں کی طرح ہیں۔ کوشش کے باوجود پنجۂ فولاد
کے شمارے نہیں مل سکے لیکن قریب بہ یقین ہے کہ ذیل کی نظمیں درد دل کے حسب ذیل بند ہیں۔

۱ ۔ پنجۂ فولاد لاہور بابت ۱۹/اپریل ۱۹۰۲ء نظم 'میں کون ہوں (بحوالۂ اقبال دانائے راز از عبداللطیف اعظمی ص ۲۱۸)

یہ ہماری نظم کا چوتھا بند ہونا چاہیے۔ پہلا مصرع ہے۔ ع ستم گوشِ باغباں ہوں میں

۲ پنجۂ فولاد ۱۹/اپریل ۱۹۰۲ء نظم 'دنیا کیا ہے (بحوالۂ ایضاً)

یہ بالیقیں ہماری نظم کا گیارھواں بند ہے جس کا پہلا مصرع ہے ع یمنِ خار خار ہے دنیا

۳ پنجۂ فولاد ۲۳/اپریل ۱۹۰۲ء نظم 'ایک یتیم بچے کی فریاد (بحوالۂ ایضاً ص ۲۱۹) اعظمی نے اس کا نام 'ایک بچے کی فریاد' لکھا ہے جب کہ پورا نام 'ایک یتیم بچے کی فریاد' ذیل کی کتاب میں ہے۔
K.A WAHEED, A BIBLIOGRAPHY OF IQBAL اقبال اکیڈیمی کراچی طبع اوّل جنوری ۱۹۶۵ء

یہ نظم بھی 'دردِ دل' کا کوئی بند ہونی چاہیے۔

۴ پنجۂ فولاد ۲۳/اپریل ۱۹۰۲ء جلد ۲ عـ۱۶ ص ۹ نظم 'شام کی آمد' مندرجہ بالا دونوں حوالوں کے ساتھ۔ یہ دردِ دل کا چھٹا بند ہونا چاہیئے۔

نظم دردِ دل بانگ درا میں شامل نہیں کی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے چار بندوں میں ترمیم کی دو منزلیں ہیں ایک چار بندوں کا وہ متن جو رزاق اور رخت سفر میں ہے دوسرے مکمل نظم کا متن یہ معلوم نہیں کہ ان میں مقدم کون ہے لیکن ظاہرا شام والے بند کی یہ ٹیپ قدیم ہونی چاہیے۔

خامشی زا ہے تیرا نظارہ — آہ یہ جشنِ انجمن آرا

اور یہ بیت اصلاح کے بعد کی ہوگی

تیری تاخیر ہوگئی آخر — میری تقدیر سو گئی آخر

رودادِ انجمن ضمیمہ دیکھا جائے تو صحیح صورت حال معلوم ہو۔

اب چند غیر اہم اغلاط کتابت کو چھوڑ کر اختلافات نسخ ملاحظہ ہوں

۱ رزاق بیاض اور رخت: رکوعِ نیاز۔ بقیہ میں جبینِ نیاز

۲ رزاق اور رخت میں یہ شعر حذف ہے۔

۳ رزاق و رخت: خواب سے۔ بقیہ میں: خواب کو۔ بیاض میں پہلے 'کو' لکھا۔ بعد میں اسے کاٹ کر 'سے' لکھ دیا۔

۴؎ احمد دین و نوادر: بزجبین. قلمی کلام، سرود و باقیات: ہرجبین

۵؎ نوادر: ترے۔ بقیہ سب: تری

۶؎ باقیات، ہستیِ سوز۔ بقیہ، خامشی سوز۔ باقیات طبع اول اور سرود میں یہ شعر حذف ہے

۷؎ یہ شعر قلمی کلام میں حذف ہے

۸؎ قلمی کلام: یہ۔ بقیہ سب، نہ

۹؎ احمد دین میں اس بند کے شعر ۸ اور ۹ کے بجائے محض ایک شعر ہے جو ہمارے متن کے شعر ۸ کے مصرع اولیٰ اور شعر ۹ کے مصرع ثانی کو ملا کر بنایا گیا ہے

ستم ناروا سے مرتا ہوں — اک مٹے شہر کا نشاں ہوں میں

بقیہ سب کتابوں میں دو اشعار مطابق متن ہیں۔

۱۰؎ احمد دین: میں۔ بقیہ سب: سے

۱۱؎ رخت، لاتی۔ بیاض، احمد دین، زراق، باقیات، سرود، نوادر: آتی
قلمی کلام میں جہاں پوری نظم دی ہے وہاں 'لاتی' ہے اور جہاں محض ایک بند 'شام' کے عنوان سے ہے وہاں 'آتی' ہے۔

۱۲؎ زراق، بیاض، کلام، احمد دین: بھر غنچۂ گل۔ سرود، باقیات: بھر کے غنچہ و گل

۱۳؎ احمد دین، سرود، نوادر، باقیات میں دوسری ٹیپ ع تیری تاثیر ہوگئی آخر ہے۔ زراق اور رخت میں پہلی ٹیپ یعنی ع خامشی زا ہے تیرا نظارا ہے۔

قلمی کلام میں جہاں پوری نظم مندرج ہے وہاں دوسری بیت کی ٹیپ ہے۔ ص ۹۹ پر جہاں ایک بند 'شام' کے عنوان سے ہے وہاں پہلی ٹیپ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اصلاً نظارہ والی بیت تھی بعد میں شاعر نے 'گئی آخر' کی بیت لکھ دی۔ اس طرح پہلے شعر کے دوسرے مصرع ع خواب لے کر چمن میں آتی ہے اور نئی ٹیپ کے دوسرے مصرع ع میری تقدیر سو گئی آخر، کا رشتہ مضبوط ہو گیا۔

۱۴؎ باقیات: ہوگئی۔ بقیہ سب: سوگئی

۱۵؎ قلمی کلام: موت کی نہ جائے۔ بقیہ سب: جائے موت کی د

۱۶؎ یہ شعر قلمی کلام میں حذف ہے

۱۷؎ مختلف کتب میں اس مصرع کی یہ صورتیں ہیں

احمد دین ع ہوں نفس درکفن مثالِ صبا

قلمی کلام ع ہوں نفس درکفن مثالِ سحر

سرود ع ہوں نفس درنفس مثالِ سحر

باقیات، نوادر ع ہوں نفس دونفس مثالِ سحر

۱۸؎ احمد دین: میری ہو۔ بقیہ سب: ہو میری

۱۹؎ باقیات: جان۔ بقیہ سب۔ نان

۲۰؎ سرود: مطابق 'ہی'۔ بقیہ سب: ہے

۲۱؎ قلمی کلام: اٹھ گئی آہ قدرداں اپنی۔ بقیہ سب میں گئے، اپنے

۲۲؎ کلام: اشکِ پُرنم، بقیہ سب، چشمِ پُرنم

۲۳؎ رزاق، بیاض، رخت (جہاں مفلسی الگ نظم کے طور پر ہے): ہائے تیرے۔ بقیہ سب، مفلسی کے

۲۴؎ بیاضِ عماد: ایک نقرہ ہے جلا بُجھا تیرا، سہوِ کتابت

۲۵؎ رزاق، بیاض اور رخت میں اس بند کا ٹیپ کا شعر یہ ہے

ہے جو دل میں نہاں کہیں کیوں کر ہائے، تیرے ستم سہیں کیوں کر

ان کتابوں میں پوری نظم تو ہے نہیں جستہ جستہ بند ہیں۔ یہ بیت دراصل نویں بند کی ٹیپ ہے اور یہ بند رزاق اور رخت میں ہے ہی نہیں۔

۲۶؎ رزاق اور رخت میں یہ شعر حذف ہے دونوں میں اس بند کے اشعار کی ترتیب متداول نظم سے مختلف ہے۔

۲۷؎ قلمی کلام میں جہاں پوری نظم دی ہے وہاں 'زیرِ بار' ہے لیکن ص ۲ پر یہ بند دنیا کے عنوان سے ہے اس میں 'زیرِ مار' دیا ہے جو زیادہ صحیح ہے۔ باقیات طبعِ اول میں زیرِ بار تھا۔ رزاق، احمد دین رخت، سرود، نوادر، باقیات طبعِ سوم: زیرِ مار

۲۸ے رزاق اور رخت میں یہ شعر حذف ہے

۲۹ے رزاق اور رخت میں اس بیت کے بجائے متداول کلام کے دسویں بند کی ٹیپ ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند لگادی گئی ہے۔ قلمی کلام میں بھی ص ۳ پر جہاں دنیا کے عنوان سے یہ بند ہے وہاں یہی ٹیپ ہے لیکن بعد میں پوری نظم میں نیز دوسری سب کتابوں میں، متداول ٹیپ ہے۔

۳۰ے صرف سرور: سے، سہوِ کتابت۔ بقیہ سب: ہے

۳۱ے احمد دین: بندہَ ۔ بقیہ سب: سبزہَ

۳۲ے قلمی کلام: کر دے جلا کے مجھے، یعنی ایک 'جلا' حذف

۳۳ے باقیات، سرود، نوادر: قوم ہنستی ہے ہم ہنساتے ہیں۔ احمد دین اور قلمی کلام: سنتی سناتے

۳۴ے باقیات، سرود، نوادر: نقش نو ۔ احمد دین اور قلمی کلام: نقش کو

۳۵ے نوادر: ہے جو ۔ بقیہ سب: جو ہو

۳۶ے قلمی کلام: اک ۔ بقیہ سب: اس

پنجۂ فولاد (منسوخ)

یہ نظم سرودِ رفتہ اور باقیات طبعِ سوم میں ملتی ہے

۱ے سرود: نہ کیوں ہو ۔ باقیات: نہ ہو کیوں

۲ے باقیات ۔ ایسا ۔ سرود ۔ ایسا

ھمالہ

اختلافاتِ نسخ ۔ یہ نظم ۱۹۰۱ء کے اوائل میں کسی جلسے میں پڑھی گئی اور مخزن اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی مخزن کے علاوہ اس نظم کا نقشِ اوّل احمد دین، بیاضِ کلام، رزاق، رخت اور نوادر میں ملتا ہے۔ سرود اور باقیات میں صرف منسوخ اشعار دیے ہیں۔ رخت میں چونکہ اسے مخزن سے نقل کیا گیا ہے اس لیے

میں نے متن میں نقشِ اوّل کے لیے بیشتر اس سے استفادہ کیا ہے ۔ اصلاً اس نظم کا عنوان 'کوہستانِ ہمالہ' تھا۔

لہ رزاق، بیاض، کلام، رخت: یہ کچھ ظاہر۔ احمد دین: میں کچھ ظاہر

ٹہ رزاق بیاض، کلام؛ احمد دین اور رخت: دورہ۔ بانگ، گردش

ٹہ منسوخ متن میں پہلے بند کی ٹیپ یہ تھی ۔ متداول بیت ع ایک جلوہ تھا... منسوخ متن کے دسویں بند کی ٹیپ تھی ۔

ٹہ منسوخ متن میں اس شعر کے دونوں مصرعوں کی ترتیب برعکس تھی ۔

ھہ بیاض، رخت: درباں ۔ بقیہ سب: دیواں ۔ رزاق کے متن میں درباں چھپا ہے جسے صحت نامے میں دیواں بنا دیا ہے ۔ رزاق اور رخت نے صحت نامہ نہیں دیکھا ۔

ٹہ ابتدائی متن میں تیسرے بند کے پہلے دو شعر بالکل بدلے ہوئے تھے یعنی یوں تھے ۔

سلسلہ تیرا ہے یا بحرِ بلندی موج زن رقص کرتی ہے مزے سے جس پہ سورج کی کرن
تیری ہر چوٹی کا دامانِ فلک میں ہے وطن چشمۂ دامن میں رہتی ہے مگر یہ تو فگن

ٹہ منسوخ متن: دامن ہے یا۔ متداول۔ دامن ترا

شہ منسوخ متن: ہائے کیا جوشِ مسرت میں اڑا جاتا ہے ابر ۔ نوادر: ہائے کیا جوشِ مسرت میں چلا جاتا ہے ابر۔

ٹہ منسوخ متن۔ چلا جاتا۔ بانگ اور نوردر۔ اڑا جاتا۔

نلہ منسوخ متن؛ جھومتی ہے کیا مزے لے لے کے ہر گل کی کلی

للہ منسوخ: کہتی۔ متداول: گویا

ٹلہ منسوخ متن میں اس بند کے پہلے دو شعر یوں تھے

نہر چلتی ہے سرودِ خامشی گاتی ہوئی آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی ناز کرتی ہے فرازِ راہ سے جاتی ہوئی

ٹلہ منسوخ متن: چھیڑتا۔ متداول: چھیڑتی

ٹلہ رزاق کے متن میں 'دور کی' چھپا ہے جسے صحت نامے میں 'اور ہی' بنا دیا ہے۔ کلام، بیاض

رخت: دور کی احمد دین، باقیات، سرود، نوادر: اور ہی

۱۵ے رزاق، بیاض کلام، رخت، باقیات طبع اوّل: نقش ہستی۔ باقیات طبع سوم، نفس ہستی احمد دین، سرود، نوادر: نفی ہستی۔ معلوم ہوتا ہے اقبال نے اصلاً نقش لکھا تھا جسے بعد میں بدل کر نفی کر دیا۔

۱۶ے سرود، باقیات: رازداران حقیقت۔ بقیہ سب: راز دانان حقیقت۔ متداول کلام میں اس بند کے پہلے دو شعر خارج کر دیے گئے اور اس کی ٹیپ کو متداول کے پہلے بند کی ٹیپ بنا دیا گیا۔

گلِ رنگیں

اس نظم کی ابتدائی شکل مخزن کے بعد رزاق، بیاض، رخت اور نوادر میں ملتی ہے۔ سرود میں صرف ترمیمات و محذوفات کی تفصیل دی گئی۔ باقیات میں صرف دو متراک بند ہیں۔

۱ے بیاض: شناسائی۔ کاتب بیاض یائے رضافت کو اکثر معروف لکھتا ہے۔

۲ے منسوخ متن: واقف افسردگی ہائے تپیدِ دل نہیں

۳ے منسوخ متن: کیوں یہ تسکین خموشی زا مجھے حاصل نہیں

۴ے اس بند کی ٹیپ اصلاً وہ شعر تھا جو بانگ درا کے تیسرے بند کا پہلا شعر ہے یعنی ع، سو زبانوں پر ....

۵ے بیاض: نگہت۔ کاتب بیاض ہمیشہ نکہت کو نگہت لکھتا ہے۔

۶ے رزاق۔ الجھاؤں۔ نوادر: الجھاؤ۔ بیاض و احمد دین۔ الجھیڑوں

۷ے منسوخ متن: کس طرح سے تجھ کو سمجھاؤں۔

۸ے نقش اول کے دوسرے بند کے ٹیپ کے شعر کو نقش ثانی کے دوسرے بند کی ٹیپ بنا لیا ہے۔

۹ے نقش ثانی کا تیسرا بند، سو زبانوں پر ..... نقش اوّل کے چوتھے بند "آہ اے گل.... پر تعمیر کیا گیا ہے لیکن دونوں میں اتنی ترد و بدل ہوتی ہے کہ ایک مصرع کے اشتراک کے

سوا کچھ بھی مماثل نہیں۔

نقشِ اوّل کے پانچویں بند کا ٹیپ کا شعر، باغِ ہستی میں...... با ندک تبدیلی نقشِ ثانی کے تیسرے بند کی ٹیپ بن گیا ہے۔

۱۰ے نقشِ اوّل کا چھٹا اور آخری بند نقشِ ثانی کا چوتھا اور آخری بند بن گیا ہے لیکن بہت سی ترمیم کے بعد۔ صرف چھٹا مصرع دونوں میں مشترک ہے۔

غزل

ع نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی

مختلف نسخوں میں اس غزل کے اشعار کا وقوع اس طرح ہے۔

بہارِ گلشن میں جملہ ۷ اشعر۔ مخزن جون ۱۹۰۱ء میں صحیح تعداد معلوم نہیں۔ رزاق میں شعر ۴ تا ۹۔ قلمی کلام میں ۱ تا ۹ نیز شعر ۱۵ کا صرف پہلا مصرع ع قفس میں ہے بلبل تو ویراں چمن ہے۔ رخت میں ۱ تا ۹۔ نوادر میں ۱ تا ۹ نیز مقطع۔ سرود میں ص ۱۵ پر شعر ۶ تا ۹ اور ضمیمے میں ص ۲۴۰ پر ۱ تا ۶ باقیات سوم میں ص ۴۴۲ - ۴۴۱ پر ۱۱ منسوخ اشعار۔ بانگِ درا میں چھے اشعار ہیں۔ بیاض میں ۶ شعر ہیں یعنی نمبر ۴ تا ۹۔

۱ے قلمی کلام : کھولے۔ بانگ۔ کھولا

۲ے قلمی کلام : گیا ہے ادھر سے کوئی یوں نکل کر۔ بقیہ سب میں مطابقِ متن

۳ے قلمی کلام : ہے سہوِ کتابت۔ بقیہ سب : ہیں

۴ے باقیات : نہ۔ بقیہ سب : یہ

عہدِ طفلی

یہ نظم مخزن جولائی ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت اس میں پانچ بند تھے جو احمد دین، رزاق بیاضِ کلام اور نوادر میں پائے جاتے ہیں۔ بعد میں تین بند حذف کر کے بانگِ درا میں صرف تیسرا

اور چوتھا بند لیا گیا۔ رخت، باقیات اور سرود میں صرف تین محذوف بند ہیں۔

لے نوادر : دم۔ بقیہ سب : رم۔ دراصل رزاق کے متن میں 'دم' چھپا ہے لیکن غلط نامے میں اس کو رم بنا دیا ہے۔ نوادر نے غلط نامہ دیکھے بغیر 'دم' نقل کر لیا۔

۲ے بیاض احمد دین، سرود : رنگ۔ بقیہ سب : زنگ۔ قلمی کلام میں 'جہاں' کے بعد 'سے' سہواً حذف ہے۔

۳ے قلمی کلام : جادیں۔ بقیہ سب : جائیں

۴ے رزاق : یک۔ بیاض : ایک۔ کاتبِ بیاض ہر جگہ 'اک' کو 'ایک' لکھتا ہے۔ بقیہ سب 'اک'

۵ے احمد دین، بیاض، کلام، رزاق اور سرود میں منسوخ متن : خالی از مفہوم، خود میری زباں میرے لیے۔

۶ے رزاق، احمد دین، بیاض، کلام : درد اس عالم میں جب نوادر اور بانگ : دردِ طفلی میں اگر

ے بیاض، کلام اور رزاق میں منسوخ متن : دل مرا جامِ شرابِ ذوقِ استفار تھا

ے باقیات : ہوں۔ بقیہ سب : ہے

۹ے سرود : میرے۔ بقیہ سب : تیرے۔ رزاق کے متن میں 'میرے' چھپا ہے۔ غلط نامے میں تصحیح کر کے تیرے کر دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ سرود نے اس کے متن سے نقل کیا ہو۔

غزل

(منسوخ)

ع محبّت کو دولت بڑی جانتے ہیں

رخت ص ۱۰۱ پر مخزن جولائی ۱۹۰۱ء سے لے کر اس غزل کے پانچ اشعار درج کیے گیے ہیں یہ ہمارے متن کے پہلے پانچ اشعار ہیں۔ یہی رزاق، سرود، نوادر اور باقیات طبعِ اوّل میں ہیں۔ بعد کے دس اشعار روزگار ص ۲۶۲ پر ہیں۔ یہ سولھواں شعر جگن ناتھ آزاد کے مضمون مشمولہ رسالہ اقبالیات لاہور جولائی ستمبر ۱۹۸۶ء ص ۲۷ سے لیا گیا ہے۔ باقیات طبعِ سوم میں کل ۱۰ اشعار ہیں یعنی ہمارے متن کے ۱، ۲، ۶، ۱۰، ۱۱، ۳، ۴، ۱۲، ۱۳، ۵، ۱۵۔

قلمی کلام میں یہ آٹھ شعر ہیں ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۷، ۱۲، ۱۳، ۱۴

لے یہاں 'کیا' کے بجائے 'کہا' ہونا چاہیے لیکن روزگار میں 'کیا' لکھا ہے۔ یہ شعر روزگار کے علاوہ اور کسی مجموعے میں نہیں

غزل
(منسوخ)

دل کو ذوقِ دید سے جس دم شناسائی ہوئی

یہ غزل سب سے پہلے روزگار ص ۲۶۰ پر پیش کی گئی۔ اس کے بعد طاہر اد ہیں سے لے کر باقیات ص ۹۶-۹۵ پر

لے باقیات: وصل۔ روزگار: دید

غزل (منسوخ)

ع بُرا ہوتا ہے عشقِ شعلہ رویانِ ستم گر بھی

اس غزل کا مقطع سے پہلے کا شعر رخت ص ۱۶۱ اور باقیات ص ۵۰۴ پر ہے۔ بقیہ ۱۱ شعر روزگار ص ۲۷۸-۲۷۷ سے لیے گئے ہیں جہاں یہ بیاضِ اعجاز سے لیے گیے ہوں گے۔

باقیات طبعِ سوم میں ص ۳۹۶-۳۹۵ پر اس غزل کے پانچ شعر یعنی ۱، ۲، ۶، ۹، ۱۲، ۱۱ آئے ہیں جب کہ ص ۵۰۴ پر شعر نمبر ۱۱ ہے۔ غزل کا مقطع کئی سوانحی کتابوں مثلاً جاوید اقبال کی "زندہ رود" حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور" میں ص ۷۱ پر ہے۔

لے باقیات۔ نے۔ رخت۔ سے۔ اور یہی ٹھیک ہے کیونکہ اگر واعظ شیشۂ مے کو چھپاتا تو زمینِ زیرِ منبر 'میرے' کام کس طرح آجاتی' یہ تو واعظ کے کام آتی

غزل (منسوخ)

ع کسی کے ذکر کو سُن کر تڑپ جانے کی باتیں ہیں

یہ غزل روزگار ص ۲۹۵ تا ۲۹۷ پر اور باقیات ص ۵۸۰-۵۷۹ پر ہے۔ باقیات میں روزگار

ہی سے لی گئی ہوگی۔ اس کا چوتھا شعر نذیر نیازی نے دانائے راز ص ۸۴ پر نقل کیا ہے۔

لے روز گار : یا۔ باقیات: کہ۔ 'کہ' آتنا سامنے کا لفظ ہے کہ اقبال اس کی جگہ 'یا' کیوں لکھتے جس کا الف گر رہا ہے اور نہایت بد نما معلوم ہوتا ہے۔

ٹے باقیات: کی جس دم۔ روز گار: جس دم کی۔ چونکہ روز گار میں اصل ماخذ سے نقل ہے اس لیے اُسے ترجیح دی گئی۔

غزل (منسوخ)

کب ہنسا تھا جو یہ کہتے ہو کہ رونا ہوگا

رخت: جو یہ۔ باقیات: کہ جو

غزل

ع عداوت ہے اسے سارے جہاں سے

یہ غزل بانگِ درا کے علاوہ قلمی کلام میں بھی ہے

قلمی کلام: نہیں سمجھا۔ بانگ: نہ یہ سمجھا

ہم نہ چھوڑیں گے دامن
(منسوخ)

یہ نظم سرودِ رفتہ اور باقیات ص ۱۳۰ پر ملتی ہے۔ سرود میں اس کا عنوان ع ہم نہ چھوڑیں گے دامن' ہے جب کہ باقیات میں ع۔ ہم نچوڑیں گے دامن' ہے۔

لے سرود: نہ چھوڑیں۔ باقیات: نچوڑیں۔ ساتویں شعر کے پیشِ نظر 'نچوڑیں' ہی صحیح ہے۔

مرزا غالب

یہ نظم اوّل مخزن ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت اس میں پانچ بند تھے۔ مخزن کے

دوسرے بند کو خارج کر کے بانگ میں ایک نیا بند لکھ دیا گیا جو ہمارے متن میں تیسرا بند ہے۔ نقشِ اوّل مخزن کے علاوہ رزاق، بیاض اور کلام میں ملتا ہے۔ منسوخ بند اور دوسری ترمیمات کی تفصیل رختِ سفر ص ۸ و ص ۱۵۷ نیز سرود میں ملتی ہیں۔ جملہ ترمیمات کا احاطہ کسی نے نہیں کیا۔

رزاق میں عنوان صرف 'غالب' ہے جب کہ مخزن اور بانگ میں مرزا غالب ہے۔ ذیل میں منسوخ متن سے مراد مخزن، رزاق، بیاض اور کلام کا متن ہے۔

۱ے منسوخ متن: کو ۔ بانگ : پر
۲ے منسوخ متن : تصوّر ۔ بانگ: تخیّل
۳ے منسوخ متن: روح تھا تو اور تھی بانگ : مطابقِ متن
۴ے منسوخ متن : صورتِ روحِ رواں بانگ : مطابقِ متن
۵ے یہ غالب کا مطلع ہے جس میں 'اُس کی' کو بدل کر 'تیری' لکھ دیا گیا ہے۔
باقیات سوم ص ۲۸۲ پر یہ منسوخ بند دیا ہے لیکن وہاں سہواً 'اُس کی' ہی لکھ دیا ہے۔
۶ے منسوخ متن: تصوّر ۔ بانگ: تخیّل
۷ے منسوخ متن : جویندہ۔ بانگ: تخیل
۸ے منسوخ متن: تیرے ہر ذرّے میں خوابیدہ ہیں سو شمس و قمر۔ بانگ۔ مطابقِ متن
۹ے بیاض: تیرے۔ بقیہ سب: تیری

غزل

ع لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے

اس غزل میں چھ شعر منسوخ اور سات شعر متداول ہیں۔ ان کی صحیح ترتیب معلوم نہیں نوادر میں جملہ ۱۳ اشعار ہیں جو (ک۔۱) سے لیے گیے ہیں۔ اگر ک۔ا سے مراد کلیاتِ اقبال ہے تو یہ کون سا نسخہ ہے؟ رزاق میں تو محض چار شعر ہیں ہمارے متن میں اشعار کی ترتیب نوادر کے مطابق ہے۔ مختلف کتابوں میں اشعار کا وقوع یوں ہے۔

نوادر ـ جملہ ۱۳ شعر

بیاض، رزاق ۔ ۱، ۲، ۴، ۵

محمد دین ص ۴۶۹ ۔ مرتب نے متداول اشعار حذف کر دیے ہیں ۔ منسوخ اشعار یہ ہیں ۔

۲، ۶، ۹، ۱۲، ۱۳

قلمی کلام : ۱، ۴، ۵، ۶، ۹، ۱۱، ۱۲ ۔ رخت، سرود، باقیات سوم میں جملہ منسوخ اشعار ۔

تبرکات اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج حیدر آباد ۱۹۳۹ء میں پانچ منسوخ اشعار

۱ے قلمی کلام : کہاں : بانگ اور بقیہ سب : کہیں

۲ے احمد دین : یہ / بقیہ سب : یہ

۳ے رخت، باقیات، نوادر : کسی سے ۔ احمد دین، قلمی کلام، سرود : کسی کو

ابرِ کوہسار

مخزن نومبر ۱۹۰۱ء میں اس نظم میں ۔ ابند تھے ۔ بانگِ درا میں صرف چار بند لیے گئے ۔ قدیم متن کا تیسرا بند بانگ میں ہے لیکن اس کا ٹیپ کا شعر خارج کر دیا ہے اور اس کی جگہ قدیم متن کے دوسرے بند کی ٹیپ لگا دی گئی ہے ۔ نظم کا پورا قدیم متن مخزن کے علاوہ رزاق، بیاض کلام، محمد دین اور نوادر میں ملتا ہے ۔ کلام میں تین شعر حذف ہو گئے ہیں ۔ صرف محذوف و منسوخ اشعار باقیات، رخت اور سرود میں ہیں ۔

ے منسوخ متن : سبزِ کسار پہ دیکھے کوئی جوبن میرا

۱ے منسوخ متن : غیرتِ تختۂ گلزار ۔ بانگ : مطابقِ متن

۱ے منسوخ متن : کہ گل افشاں ہے سرِ گوشۂ دامن میرا

۵ے رزاق اور نوادر : غم رُبائے ۔ بقیہ سب : غم زدائے

۵ے منسوخ متن : سبزیِ بختِ ۔ بانگ : رونقِ بزم

ے بیاض، رزاق : ہستی سے ۔ نوادر : ہستی کے ۔ احمد دین، قلمی کلام اور بانگ : ہستی پہ

ے منسوخ متن : ع جب افق پر کبھی چُپکے سے چمک جاتا ہوں ۔ بانگ : مطابقِ متن

۸ے ابتدائی متن میں ٹیپ کا شعر دل لگی.... تھا جو منسوخ ہوا۔ اس کی جگہ ابتدائی متن کے چوتھے بند کا ٹیپ کا شعر شامل کر دیا گیا۔

۹ے بیاض: بھڑک۔ باقیات: بھڑک۔ رزاق وغیرہ: ٹیک

۱۰ے بیاض: کے۔ بقیہ سب: کی

۱۱ے بیاض، رزاق، رخت، نوادر: اور تھم تھم۔ احمد دین، کلام، سرود، باقیات: وردہ تھم تھم

۱۲ے سرود، باقیات: باغ میں۔ بقیہ: باغ کی

۱۳ے قلمی کلام: دہر۔ بقیہ سب: مہر

۱۴ے سرود: سناتے۔ بقیہ سب: مٹاتے

۱۵ے قلمی کلام میں سہواً اگلا بند حذف ہو گیا ہے لیکن اس کی ٹیپ زیر نظر بند میں لکھ دی گئی ہے یعنی قلمی کلام میں دسویں بند کی ٹیپ "توسن باد" نہیں بلکہ "نظر آتے ہی... ہے۔ اس طرح یہ تین شعر حذف ہوئے۔

۱۔ توسن بادیہ ...... ۲۔ اُٹھ گیا موج ہوا .... ۳۔ وہ ضیا گستر عالم ......

۱۶ے احمد دین، باقیات اور سرود میں گیارھویں بند کے پہلے اور دوسرے شعر کی ترتیب معکوس ہے۔ بیاض، کلام، رزاق، رخت اور نوادر میں مطابقِ متن ہے۔

۱۷ے رزاق کے متن میں ذرا ہے۔ صحت نامے میں 'مرا' بنا دیا ہے۔ بیاض، رخت، نوادر: ذرا۔ احمد دین، سرود، باقیات: مرا

۱۸ے رزاق، رخت، نوادر: آتے ہیں۔ احمد دین، کلام، سرود، باقیات: آتے ہی۔ بیاض میں یہ بند لکھنے سے رہ گیا تھا۔ کسی طرح بین السطور اس کے دو شعر لکھ دیے، ٹیپ کے شعر کی جگہ نہ تھی، محذوف ہو گیا۔

ایک مکڑا اور مکھی

اس نظم کے ۲۴ اشعار بیاض اور بانگِ درا میں ہیں۔ رزاق میں صرف ۲۳ متداول اشعار ہیں۔ شعر ۲۸ نہیں ہے۔ آٹھ منسوخ اشعار روزگار ص ۳۶۶ تا ۳۶۸ پر دیے ہیں۔ مولف لکھتے ہیں۔

یہ نظم ۳۲ اشعار پر مشتمل تھی روزگار سے ۲۵ اشعار بانگِ درا میں شائع ہو گئے۔ باقی حسب ذیل ہیں۔

باقیات ص ۵۵۶ پر بھی روزگار کا اعتراف کیے بغیر یہی بات دہرادی گئی ہے۔ اگر بانگِ درا میں ۲۵ شعر ہوتے تو منسوخ اشعار کی تعداد محض سات ہوتی لیکن بانگ میں ۲۴ شعر ہیں اور اس طرح منسوخ اشعار کی تعداد آٹھ بنتی ہے۔ روزگار اور باقیات میں یہ آٹھوں شعر دیے ہیں دونوں نے یہ اچھا کیا کہ پوری نظم میں منسوخ اشعار کا نمبر شمار دے دیا۔

ایک پہاڑ اور گلہری

اس نظم کا متداول متن رزاق کی کلیات بیاض اور بانگِ درا میں ہے۔ تینوں میں متن کا کوئی اختلاف نہیں۔ روزگار میں بتایا گیا کہ اصل نظم میں ۲۴ اشعار تھے جن میں سے ۱۲ بانگ میں لیے گئے، ۱۲ منسوخ کر دیے گیے۔ روزگار ص ۳۵۸ تا ۳۶۱ پر یہ ۱۲ شعر دیے ہیں لیکن ان کی ترتیب نہیں دی کہ کون سا منسوخ شعر کس متداول شعر کے بعد ہے۔ راقم الحروف نے ان کے مضمون کو دیکھ کر اندازے سے بٹھا دیا ہے۔ باقیات میں ص ۵۶۱ - ۵۶۰ پر بھی ۱۲ متروک اشعار دیے ہیں۔ حسبِ معمول ماخذ کا اعتراف نہیں کیا گیا لیکن ظاہر ہے کہ روزگار سے نقل کیے ہیں۔

لے روزگار: یہ۔ باقیات: پر۔ روزگار اصل ماخذ ہے اس لیے اس کا متن مرجح ہے۔

ایک گائے اور بکری

روزگار فقیر کے مطابق اس نظم میں ۴۱ شعر تھے۔ ۲۹ شعر بانگ میں شامل کیے گیے ہیں ۱۲ منسوخ اشعار روزگار میں ص ۳۶۱ تا ۳۶۴ پر نیز باقیات ص ۵۵۸ تا ۵۶۱ پر ہیں۔ اشعار کی ترتیب معلوم نہیں۔ معنی کے لحاظ سے منسوخ اشعار مختلف مقامات پر رکھ دیے گیے ہیں۔ بیاض میں اس نظم کا متن بانگ کے بالکل مطابق ہے۔

گھوڑوں کی مجلس (منسوخ)

یہ نظم روزگار ص ۳۸۸ تا ۳۹۴ اور باقیات ص ۵۴۵ تا ۵۵۱ پر ملتی ہے۔

۱۔ باقیات: بھیڑیے۔ روزگار: بھیڑے

۲۔ باقیات: میری۔ سہوِ کاتب۔ وزن کے لحاظ سے روزگار کا 'مری' صحیح ہے۔

شہد کی مکھی

(منسوخ)

یہ نظم بیاضِ اعجاز سے لے کر پہلے روزگار ص ۳۹۵ تا ۳۹۹ میں چھاپی گئی۔ اس کے بعد باقیات ص ۵۵۱ تا ۵۵۵ پر۔

۱۔ باقیات: اس۔ سہوِ کتابت۔ روزگار: رس

بچے کی دعا

اس نظم کے چھ متداول اشعار بیاض، کلام نیز بانگ میں ملتے ہیں۔ تینوں میں کوئی اختلافِ متن نہیں۔ چار منسوخ اشعار روزگار ص ۳۵۸ - ۳۵۷ پر نیز باقیات ص ۵۵۹ پر دیے ہیں منسوخ اشعار کی ترتیب معلوم نہیں۔ مفہوم کے لحاظ سے انھیں متداول اشعار کے بیچ بیچ میں جما دیا گیا ہے۔

ہمدردی

اس کا متداول متن رزاق، بیاض اور بانگِ درا میں ملتا ہے۔ کہیں کوئی اختلافِ متن نہیں۔ اس کے اصل ۱۶ اشعار میں سے آٹھ منسوخ کر دیے گیے۔ انھیں روزگار میں ص ۳۶۸ تا ۳۷۰ پر دیا ہے۔ وہیں سے لے کر باقیات میں ص ۵۶۲ - ۵۶۱ پر درج کیا ہے۔ منسوخ اشعار کی ترتیب معلوم نہیں۔ مفہوم کے لحاظ سے انھیں متداول اشعار کے ساتھ بٹھا دیا گیا ہے۔

ماں کا خواب

اس کا متداول متن رزاق، بیاض اور بانگِ درا میں ملتا ہے۔ تینوں جگہ متن یکساں ہے۔

اس میں ۱۵ اشعار ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۹ اشعار منسوخ کیے گیے۔ یہ روزگار میں ص ۳۶۵ ۔ ۳۶۴ پر اور باقیات میں ص ۵۶۲ تا ۵۶۳ پر ہیں۔ ان کی ترتیب معلوم نہیں۔ مفہوم کے لحاظ سے متداول اشعار کے بیچ میں رکھ دیے گئے ہیں۔

رزاق میں اس کا عنوان 'ماں اور بچہ' ہے۔

چاند اور شاعر

(منسوخ)

یہ نظم روزگار ص ۲۷۰ تا ۲۸۰ پر اور باقیات ص ۲۶۴ تا ۲۶۸ پر ہے۔

۱ے باقیات: سورج کا دن کو اور ۱ روزگار: سورج کا راج دن کو

بچوں کے لیے چند نصیحتیں

(منسوخ)

۲۰ شعروں کی یہ نظم روزگار میں ص ۳۸۴ تا ۳۸۸ پر دی ہے۔ وہیں سے نقل کر کے باقیات میں ص ۵۴۲ تا ۵۴۴ پر درج کی گئی لیکن وہاں محض ۷ شعر ہیں۔ شعر ۷ تا ۱۹ سہواً چھوٹ گیے ہیں۔

۱ے باقیات: جو ہیں۔ روزگار: ہیں جو

شمع پروانہ

یہ نظم سب سے پہلے خدنگِ نظر جنوری ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مخزن اپریل ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ بانگِ درا میں لیتے وقت اس کے چار شعر حذف کیے گیے اور بعض مصرعوں میں ترمیم کی گئی۔ پورا نقشِ اوّل رزاق، بیاض، کلام اور رخت میں ہے۔ محذوفات سرود اور باقیات طبعِ سوم میں دیے ہیں۔

۱ے بیاض، کلام، رزاق، رخت: کو۔ بانگ: سے

۲ے منسوخ متن: کرتا ہے اپنی جان کو تجھ پر نثار کیوں

۳۷ منسوخ متن: کیوں بے قرار کرتی ہے تیری ادا اُسے

خفتگانِ خاک سے استفسار

یہ نظم پہلی بار مخزن فروری ۱۹۰۳ء میں شائع کی گئی۔ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری۔ بیاض میں سب سے مکمل نقشِ اوّل ہے جو ظاہرا مخزن سے لیا گیا ہے۔ اس میں ۳۴ شعر ہیں یعنی ہمارے متن کے نمبر ۱۱، ۱۴، ۱۶، ۲۶ب اور ۳۹ب کو چھوڑ کر۔ اس کے بعد اس نظم میں دو بار تبدیلیاں کی گئیں۔ پہلی ترمیم رزاق میں دکھائی دیتی ہے جہاں نقشِ اوّل کے سات شعر حذف کیے گیے۔ یہ ہمارے متن کے ۵، ۱۵، ۱۷، ۲۵، ۳۳، ۳۷، ۴۰۔

ظاہر ہے رزاق نے اپنا متن کسی رسالے سے لیا ہوگا جس کا ہمیں علم نہیں۔ ترمیم کی دوسری منزل بانگِ درا ہے جس میں یہ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔

(۱) رزاق کے سات محذوف اشعار میں سے نمبر ۲۵ کو دوبارہ شامل کر لیا گیا

(۲) مخزن، بیاض اور رزاق میں شامل مزید ۱۱ شعر حذف کیے گیے جو ہمارے متن میں نمبر ۴، ۶، ۷، ۱۲، ۲۱ تا ۲۴، ۳۴، ۳۶، ۴۱ ہیں (۳) دو اشعار ۲۶ ا اور ۳۹ ا میں ترمیم کر کے انھیں ۲۶ اور ۳۹ب بنا دیا گیا۔ (۴) تین نئے اشعار ۱۱، ۱۴، ۱۶ شامل کیے گیے۔ اس طرح نقشِ اوّل کے کُل شعر محذوف کیے گیے۔ سرود میں یہ سب نیز تین متداول اشعار کی قدیم شکلیں دی ہیں۔ باقیات سرود سے ۱۷ محذوف اشعار اور ایک متداول شعر کی ابتدائی شکل دی ہے۔ رخت میں ۱۴ محذوف اشعار اور تین اشعار کی ابتدائی شکلیں دی ہیں۔ نوادر میں ص ۳۰۰ پر صرف شعر نمبر ۱۲ متفرق کے طور دیا ہے۔ مرتب کو علم نہیں کہ یہ شعر اس نظم کا ہے۔ اختلافاتِ نسخ کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

منسوخ متن : شاہد۔ بانگ : شانہ

منسوخ متن میں بانگ کے دوسرے اور تیسرے شعر کی ترتیب منقلب ہے۔

رزاق کے متن میں، شاہد، چھپا ہے۔ صحت نامے میں اسے ساحر، بنا دیا ہے۔ بیاض: شاہد

رزاق و بانگ : ساحر

سرود اور باقیات : ابتدا اور انتہا۔ رزاق، بیاض، رخت : ابتدا و انتہا

۵ منسوخ متن : رنگِ خاموشی میں ہے ڈوبی ہوئی موجِ ہوا

۶ سرود و باقیات : مدہوش۔ رزاق، بیاض اور رخت : بے ہوش

۷ منسوخ متن : متالو ۔ بانگ : سرمتو

۸ منسوخ متن : باتیں ۔ بانگ : آخر۔ بیاض میں یہ لفظ چھوٹ گیا تھا۔ بعد میں قیاساً پنسل سے 'حالت' لکھ دیا ہے

۹ منسوخ متن : نورِ شمع ۔ بانگ سوزِ شمع

۱۰ رزاق : کے ۔ بانگ : کا ۔ بیاض میں اصلاً مصرع بانگ کی طرح تھا۔ بعد میں کسی نے کاٹ کر بنا دیا، یاں تو جان کے آزار ہیں

۱۱ شعر منسوخ کر دیا گیا۔ اس کی اصلاح شدہ شکل اس سے اگلا شعر ہے جو بانگِ درا میں ہے

۱۲ منسوخ متن : فکر اینٹوں کی وہاں بھی ہے مکاں کے واسطے ۔ نیز منسوخ متن میں اس شعر کے مصرعوں کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔

۱۳ منسوخ متن : ہے جنت ویا اک (۱۴) بیاض : کی ۔ بقیہ سب : کے

۱۵ منسوخ متن : موت کہتا ہے جسے انسان، وہ کیا راز ہے ؟

۱۶ اس شعر کی اصلاح کر کے اس سے اگلا متداول شعر بنا دیا گیا۔

۱۷ یہ شعر رزاق میں نہیں۔ بیاض، سرود، باقیات اور رخت طبعِ دوم میں ہے۔

۱۸ صرف بیاض : ہیں ۔ بقیہ سب : ہے

۱۹ سرود، باقیات : ہے وہ کیا تفسیرِ حسن ۔ رزاق، بیاض، رخت : وہ ہے کیا تصویرِ حسن

۲۰ سرود باقیات : تصویر ۔ رزاق، بیاض، رخت : تفسیر

خیر مقدم

(منسوخ)

یہ قصیدہ سرود، نوادر اور باقیات طبعِ سوم میں ملتا ہے

۱ نوادر : جن ۔ سرود اور باقیات : جس ۔ پہلے مصرع کے واحد ممدوح کے ساتھ جس صحیح ہے

۴؎ نوادر : میں ۔ سرود و باقیات : سے

دین و دنیا

(منسوخ)

یہ نظم انجمنِ حمایت الاسلام کی روداد سے لے کر سرود، نوادر، باقیات طبع سوم میں چھپی ہے نیز بیاض میں لکھی ہے ۔ تبرکاتِ اقبال میں ص ۱۸ پر اس کے سات اشعار یعنی نمبر ا تا ۴، ۱۸، ۷، ۱۶، ذیل کے عنوان سے دیے ہیں ۔

دلچسپ قطعہ ۱۹۰۴

مندرجہ، رسالہ خیام لاہور مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء

ذکرِ اقبال ص ۲۵

اس طرح سات اشعار کے قطعے کا ماخذ خیام لاہور کو ظاہر کیا ہے ۔ اس کے بعد اگلے صفحہ ۱۹ پر ذکرِ اقبال سے لے کہ مزید دو اشعار نمبر ۱۴، ۲۸ دیے ہیں ۔ حیرت ہے کہ اُسے تبرکات میں ۴ ۱۹ء کا قطعہ کہا ہے جب کہ یہ بالیقیں ۱۹۰۲ء میں لکھا گیا ۔

۱؎ تبرکات : بھائی ۔ بقیہ سب : دہلی

۲؎ بیاض : کے ۔ بقیہ سب : کی

۳؎ بیاض : ایک دھاں ۔ بقیہ سب : اک وہاں

۴؎ خیام : ہونا بھی تو اک ۔ بقیہ سب : ہونا بھی اپنی

۵؎، ۶؎ نوادر میں شعر ۸ کا پہلا مصرع اور شعر ۹ کا دوسرا مصرع ملا کر ایک شعر بنایا ہے اس طرح شعر ۸ کا دوسرا مصرع اور شعر ۹ کا پہلا مصرع حذف ہو گیا ہے ۔

۷؎ بیاض : ایسے ۔ بقیہ سب : اپنی

۸؎ بیاض : فکرِ دین و فکرِ دنیاں ۔ بقیہ سب : مطابقِ متن

۹؎ بیاض، سرود، باقیات : خاصا دام ۔ نوادر : خاصہ ڈام

۱۰؎ بیاض اور نوادر میں اس شعر اور اس سے اگلے شعر کی ترتیب معکوس ہے ۔

۱۱ے بیاض: فہم کے ۔ بقیہ سب: فہم پہ

۱۲ے باقیات سوم: واعظ ۔ سہوِ کتابت

۱۳ے بیاض، نوادر: ایسی، بقیہ سب: ایسا

۱۴ے بیاض، انڈمن ۔ نوادر: اندمن ۔ سرود و باقیات: انڈمن

۱۵ے بیاض کی سے ۔ بقیہ سب: کے بس

۱۶ے بیاض: نیلام ۔ بقیہ سب: یلام

۱۷ے بیاض میں سہواً 'ہیں' محذوف

۱۸ے بیاض و نوادر: ان کی ۔ سرود و باقیات: ان سے

۱۹ے بیاض: تلفی ۔ بقیہ سب: تفلی

۲۰ے نوادر: کے سر ۔ بقیہ سب: کا سر

۲۱ے بیاض: عین دو لام ۔ بقیہ سب: مطابقِ متن

۲۲ے بیاض و نوادر: سے ۔ سرود و باقیات: کے

۲۳ے بیاض: چھپوائی ہے "میں نے" نوادر: چھپوائی ہے میں نے ۔ سرود و باقیات: چھپوائی مجھ کو ۔ معلوم ہوتا ہے اصلاً اقبال نے پنجابی روزمرہ میں "چھپوائی ہے میں نے" لکھا ہو گا بعد میں ترمیم کی ہو گی ۔

۲۴ے تبرکات: لوگوں میں ۔ بقیہ سب: لوگوں کو

۲۵ے ذکرِ اقبال و تبرکات: محبوبانِ عالم ۔ بقیہ سب: بے چارے حسینوں

۲۶ے بیاض: جوش و ہمدردی ۔ بقیہ سب: جوشِ ہمدردی

۲۷ے بیاض: علم و دیں ۔ بقیہ سب: علمِ دیں

۲۸ے بیاض: دل سے ۔ بقیہ سب: دل کو

۲۹ے باقیات: اشٹام ۔ بقیہ سب: اسٹام

۳۰ے بیاض: دکھے ۔ سہواً نقطے حذف ۔ بقیہ سب: دکھتے

۳۱ے بیاض: نام ۔ بقیہ سب: شام

۳۲ے بیاضِ و نوادر : دین ودنیا۔ بقیہ سب : دین، دنیا
۳۳ے نوادر : خرخام۔ سہوِ کتابت : بقیہ سب : ضرغام

اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو

(منسوخ)

سرود و باقیات میں اس نظم کا عنوان "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے" ہے جب کہ نوادر میں آخری سے کے بجائے 'کو' ہے۔ نوادر میں انجمن کی روداد سے اس کے بارے میں جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں بھی نظم کے نام میں 'کو' ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یوں عام طور سے سرود کا متن صحیح ہے اور نوادر میں اغلاطِ کتابت ہیں۔

یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نظم کا عنوان "زبانِ حال" بھی تھا۔ وحید کی کتابیات میں ذیل کا اندراج ہے۔

زبانِ حال۔ پنجۂ فولاد۔ ۱۹ر مارچ ۱۹۰۲ء۔ جلد ۲ ع۱۱۔ انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے ساتویں سالانہ جلسے میں ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء کو،

(اے ببلیوگرافی آف اقبال۔ ص ۶۔ کراچی ۱۹۶۵ء)

"اقبال، دانائے راز" میں بھی ص ۲۱۸ پر ۱۹ر مارچ ۱۹۰۲ء کے پنجۂ فولاد میں زبانِ حال کی اشاعت کی خبر دی ہے۔

سرود و باقیات کے مطابق یہ سترھواں سالانہ جلسہ تھا نہ کہ ساتواں۔ چونکہ اس تاریخ کو انجمن کے اجلاس میں اقبال نے صرف یہی نظم پڑھی تھی اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پنجۂ فولاد میں اسی کو 'زبانِ حال' کے نام سے چھاپا گیا ہوگا۔

لے نوادر : تقدیر۔ سرودو باقیات : تصویر
۲ے نوادر : کل۔ سرود و باقیات : گل
۳ے نوادر : رہے، حذف
۴ے نوادر میں ایک 'ہو' حذف یعنی محض فدا ہو گئی جس سے مصرع ناموزوں رہ جاتا ہے۔

۵ے نوادر: عزت ۔ سرود و باقیات: ہمت

۶ے نوادر: ہا ۔ سرود و باقیات: ہاں

۷ے سرود و نوادر: ہوں ۔ باقیات: ہو

۸ے نوادر: جس نے جا چھو یا ہو ۔ سرود و باقیات: ہاں جسے چھونا ہو

۹ے یہ شعر نوادر میں حذف ہے

۱۰ے باقیات: اگر ۔ سرود و نوادر: رگ

۱۱ے نوادر: دولتِ ایمان ہے ۔ سرود و باقیات: دولتِ ایماں ہے بس ۔ ہو سکتا ہے نوادر کا متن اصل ہو ۔ چونکہ اس میں اضافت کی شکل میں بھی ایمان کی ن کا اعلان ہو رہا تھا اس لیے اقبال نے اس میں اصلاح کر کے دولتِ ایماں ہے بس کر دیا ہو

۱۲ے نوادر: یادگارِ فاتحانِ ہند و اندلس کے ہو تم: صریحاً غلط ۔ سرود و باقیات: مطابق متن

۱۳ے یہ شعر باقیات میں نہیں

۱۴ے نوادر: پہلی ۔ سرود: پہلے

۱۵ے نوادر: اُمّیِ ۔ سرود و باقیات: اُمّیے ۔ ظاہر ہے کہ امّی کے آخر میں اضافت نہیں چاہیے بلکہ یائے توحیدی کا اضافہ ہونا چاہیے ۔

غزل

(منسوخ)

ع دل کی بستی عجیب بستی ہے

یہ غزل مخزن مارچ ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی ۔ بعد میں احمد دین، قلمی کلام، تبرکاتِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج حیدر آباد ۱۹۳۹ء، رخت، باقیات، سرود اور نوادر میں شامل کی گئی ۔ جن میں پہلا اور پانچواں شعر نہیں ۔

۱ے قلمی کلام: دیکھنے ۔ بقیہ سب: لوٹنے

۲ے احمد دین اور قلمی کلام: کی ۔ بقیہ سب: کا

۳ے قلمی کلام: سی ۔ بقیہ سب: کی۔ معنی کے لحاظ سے 'سی' بہتر ہے۔

۴ے قلمی کلام: ہوشیاری سے اس کی مستی ہے

۵ے قلمی کلام: طرح یہ ۔ بقیہ سب: طرح مئے

عقل و دل

یہ نظم سب سے پہلے مخزن مئی ۱۹۰۲ء میں اور پھر پنجۂ فولاد لاہور بابت ۴ ارجون ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ ان کے بعد ہفت روزہ الحکم قادیان میں ۱۰، ۱۷، ۲۴ فروری ۱۹۰۳ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئی۔ مخزن میں اس نظم میں ۴۰ شعر تھے۔ بانگِ درا میں لیتے وقت ۲۸ شعر حذف کر دیے گئے۔ لیکن شعر ۲۷ 'تو ہے وابستہ ....' کو ترمیم کے ساتھ بانگِ درا کے شعر ۱۲ (ہمارے متن کے شعر نمبر ۴۳) کے روپ میں رکھ لیا گیا۔ نقشِ اول بیاض، کلام، باقیات اور نوادر میں ہے۔ بیاض میں یہ نظم دو جگہ ہے۔ ص ۱۵۲، ۱۵۱ پر یہ خطِ منظوم کے عنوان سے ہے۔ اس میں ۳۹ شعر ہیں یعنی ہمارا شعر ۳ نہیں۔ اس کے بعد ص ۱۶۲ پر عقل و دل کے عنوان سے بانگ کا متن ہے۔

نوادر میں کل ۴۱ شعر ہیں یعنی ہمارے متن کے منسوخ شعر ۲۷ کے ساتھ شعر ۴۳ (متداول شعر ۱۲) کو بھی لکھ دیا ہے جیسا کہ ہم نے کیا ہے۔ کلام میں اس نظم کے اشعار دو جگہ منتشر ہیں ص ۳۷ اور ص ۱۰۰ پر۔ سرود اور رخت میں صرف منسوخ اشعار دیے ہیں لیکن رخت میں ایک منسوخ شعر 'تو مری ہمسری کرے ...' نہیں ہے۔

۱ے نوادر: ہوں میں ۔ بقیہ سب: ہوں مگر

۲ے بیاض: چھوڑتا ہوں ۔ بقیہ سب: کیا سراھل

۳ے بیاض، کلام: کفر و غفلت ۔ بقیہ سب: کفر غفلت

۴ے کلام، نوادر: بننے پہ ۔ بقیہ سب: بننے کو

۵ے کلام: فلک ہے مری ۔ بیاض: فلک پہ مری ۔ بقیہ سب: فلک پہ مرا

۶ے منسوخ متن: رہبری دہر میں ہے کام مرا

۷ے منسوخ متن: رشکِ خضر ۔ بیاض میں خطِ منظوم میں: اشکِ خضر ۔ بانگ: مثلِ خضر

۸ یہ شعر رخت میں نہیں۔
۹ باقیات : دیدۂ کور۔
۱۰ کلام : سُن کے۔ بقیہ سب : سن کر
۱۱ بیاض، کلام، باقیات : کہ سب۔ نوادر، بانگ : یہ سب۔
۱۲ بیاض، کلام، باقیات : کو دیکھتا۔ بقیہ سب : سے آشنا۔
۱۳ کلام : گر خدا تو، خدا نما ہوں میں۔
۱۴ بیاض، کلام، باقیات : بے چینی۔ نوادر، بانگ : بے تابی
۱۵ یہ متداول شعر بعد میں آنے والے منسوخ شعر ع تو ہے وابستۂ زمان و مکاں... کا اصلاح شدہ روپ ہے۔
۱۶ رخت، سرود : ہے۔ بیاض، کلام، باقیات، نوادر : میں
۱۷ قلمی کلام : کتاب مری۔ سہوِ کتابت۔ بقیہ سب : بہار مری

آفتابِ صبح

یہ نظم سب سے پہلے خدنگِ نظر لکھنؤ بابت مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی (حوالہ: عتیق صدیقی، اقبال، جادوگرِ ہندی نژاد، ص ۱۲۲۔ بانگِ درا میں لیتے وقت اس کے دو بند حذف کر دیے گئے اور ایک نیا بند شامل کیا گیا۔ کون سا نیا بند شامل کیا گیا اس کا علم نہیں۔ دونوں محذوف بند سب سے پہلے روزگار ص ۳۳۰-۳۲۹ پر شائع کیے گئے جہاں سے لے کر باقیات میں دیے گئے۔ یہ معلوم نہیں منسوخ بندوں کی ترتیب کیا تھی۔ ان کے مفہوم پر نظر رکھ کر انھیں ابتدا میں دے دیا ہے۔ پہلے منسوخ بند کے بارے میں تو یقین ہوتا ہے کہ وہ ابتدا میں رہا ہوگا۔

متداول متن بیاض، روزگار اور بانگ میں پایا جاتا ہے۔ تینوں میں کوئی اختلافِ نسخ نہیں۔

غزل (منسوخ)

بلا کشانِ محبت کی یادگار ہوں میں

رزاق، رخت، باقیات طبعِ اول، سرود اور نوادر میں اس غزل کے پانچ اشعار یعنی نمبر ۱، ۲، ۶، ۸، ۱۰ شامل ہیں۔ روزگار ص ۲۵۸ پر پانچ مزید اشعار کا اضافہ کیا گیا۔ باقیات طبع سوم میں کل دس اشعار ہیں۔ بیاضِ عماد میں رزاق کے پانچ اشعار نیز شعر نمبر ۵ ہے۔ روزگار میں کل دس کے دس اشعار ہیں۔ بیاضِ عماد میں رزاق کے پانچ اشعار نیز شعر نمبر ۵ ہے۔ روزگار میں شعر نمبر ۳ پہلے اور نمبر ۵ بعد میں ہے۔ ہم نے باقیات طبعِ سوم کے مطابق ترتیب رکھی ہے۔
سیّد نذیر نیازی کی دانائے راز میں ص ۸۵-۸۴ پر شعر نمبر ۵ دیا ہے۔

۱؎ دانائے راز: کسی حسین کا بیاض، روزگار و باقیات: کسی کے ہاتھ کا۔

۲؎ رخت: عشق۔ بقیہ سب: زہر

صدائے درد

یہ نظم اولاً مخزن جون ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت اس میں ۲۹ شعر تھے۔ بانگِ درا میں صرف نو شعر لیے گئے۔ نقشِ ثانی تیار کرتے وقت نقشِ اول کے بہت سے اشعار میں تقدیم و تاخیر کی گئی۔ نقشِ ثانی کے اشعار نقشِ اول میں اس ترتیب سے تھے، مطبوعہ متن کا شعر ۶ ہمارے متن کے نمبر ۱۹ کے بعد تھا۔ شعر ۷ ہمارے نمبر ۲۰ کے بعد تھا۔ شعر ۸ ہمارے نمبر ۵ کے بعد تھا۔ شعر ۹ ہمارے نمبر ۲۱ کے بعد تھا۔ شعر ۱۰ تا ۱۲ ہمارے نمبر ۸ کے بعد تھے۔

مکمل نظم میں ۲۹ اشعار ہیں جو قلمی کلام میں دو جگہ یعنی ص ۱۴۱ و ۱۲۳ پر دیے ہیں۔ احمد دین کی طبعِ اول میں ۲۷ شعر ہیں یعنی ہمارے متن کا شعر ۱ اور ۱۹ نہیں۔ نوادرِ اقبال میں نقشِ اول دیا ہے لیکن وہاں بھی ۲۷ شعر ہیں۔ ہمارے متن کا شعر ۱۰ اور ۱۱ نہیں جو بانگِ درا میں موجود ہیں۔

رخت اور سرود میں ۲۰ منسوخ اشعار دیے ہیں۔ باقیات طبعِ اول میں صرف ۱۶ منسوخ اشعار ہیں یعنی ہمارے متن کے نمبر ۲ تا نمبر ۵ موجود نہیں۔ باقیات طبعِ سوم میں جملہ ۲۰ منسوخ اشعار ہیں۔ رزاق اور بیاض میں محض ۲۱ شعر ہیں۔ ۱ تا ۵ - ۸ - ۱۰ - ۱۱ نہیں۔ بیاض میں رزاق ہی کا متن ہے۔

۱ھ کلام: بجھادے ۔ نوادر اور بانگ : ڈبودے
۲ھ بیاض، کلام، احمد دین : تیری ۔ بانگ اور نوادر : اپنی
۳ھ احمد دین : میں مرا رزاق، کلام، بانگ : پرپتا
۴ھ رزاق کے متن میں موجۂ ساحل ہے ۔ صحت نامے میں 'موجہ و ساحل' بنا دیا ہے ۔ بیاض،

موجۂ ساحل ۔ بقیہ سب : موجہ و ساحل ۔
۵ھ رزاق : جبیں ۔ بیاض میں پہلے جبیں لکھا ہے ۔ بعد میں کاٹ کر جبن بنایا ہے ۔
۶ھ رزاق کے متن میں ہے ع ہاں سلام اے مولدِ بوذاسفِ گوتم تجھے ۔ صحت نامے میں اسے ہمارے متن کے مطابق بنا دیا ہے ۔ میں نے اس نظم کے حواشی میں درج کر دیا ہے کہ بوزاسف گوتم کو کہتے ہیں ۔ باقیاتِ اقبال طبعِ اوّل میں بوزاسف، والا متن ہے ۔ طبعِ سوم میں ہمارا متن ۔ بیاض : ہاں سلام اے مولدِ گوتم تجھے ۔ اس طرح مصرع چھوٹا رہتا ہے ۔ نوادر : مولدِ بوذاسفِ گوتم ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اصلاً بوذاسف والا متن لکھا ہوگا ۔ بعد میں اس کی غرابت کے پیشِ نظر ترمیم شدہ

متن بنا دیا ۔
۷ھ سرود و باقیات : آتی نہیں محرم بقیہ سب مطابقِ متن ۔
۸ھ ۹ھ رزاق کے متن میں انسان ہیں، نادان ہیں صحت نامے میں انساں ہیں یہ ناداں ناداں ہیں یہ بنا دیا ہے ۔ بیاض میں : انسان ہیں، نادان ہیں ۔
۱۰ھ کلام : رنگ و قومیت ۔ سہو کتابت ۔
۱۱ھ رزاق، بیاض، باقیات، نوادر : اصل محبوب ۔ بقیہ سب : وصلِ محبوب ۔ رزاق میں اصل محبوب سہوِ کتابت ہوگا جہاں سے بیاض، باقیات، نوادر نے نقل کر لیا ۔
۱۲ھ رزاق کے متن میں تصویریں چھپا ہے جسے صحت نامے میں تفسیریں بنا دیا ۔ بیاض نوادر، رخت : تصویریں ۔ احمد دین، کلام، سرود : تفسیریں ۔ باقیات : تدبیریں ۔
۱۳ھ رزاق، نوادر، باقیات : شے ۔ بقیہ سب مع بیاض : مئے
۱۴ھ کلام میں ردیف 'ہو' بقیہ سب میں : ہے ۔

غزل (منسوخ)

ع ہے کلیجہ فگار ہونے کو

یہ غزل مخزن جون ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی جہاں اس میں ۱۱ شعر ہیں۔ بیاض، رزاق اور باقیاتِ طبع اوّل میں صرف نو شعر ہیں یعنی پانچواں اور چھٹا شعر حذف ہے۔ کلام، رخت، سرود، نوادر اور باقیات طبعِ سوم میں تمام اشعار ہیں۔ سرود اور نوادر میں ترتیبِ اشعار مطابقِ متن ہے۔ تبرکاتِ اقبال مرتبہ تاج حیدر آبادی میں دو شعر نمبر ۵، ۶ ہیں۔

سلہ صرف سرود: جاں نثاروں۔ بقیہ سب: جاں نثاری

سلہ۲ قلمی کلام: مجھ پہ۔ بقیہ سب: مجھ پر

سلہ۳ سرود و نوادر: جس کو۔ رزاق، بیاض، کلام، رخت، باقیات: جس میں

سلہ۴ بیاض: راہ بقیہ سب: رہ

سلہ۵ نوادر: یہ۔ بقیہ سب: کہ

ماتمِ پسر (منسوخ)

یہ نظم مخزن جولائی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ بیاض، رخت، باقیات، سرود اور نوادر میں شامل ہے۔ رزاق کی ابتدا میں تقریب کے جزو ص ۲۱ پر اس کے محض چھے شعر ہیں یعنی نمبر ۴، ۷، ۱۰، ۱۲ تا ۱۴۔

سلہ بیاض: بیاباں سرا۔ بقیہ سب: بیاباں مرا

سلہ۲ بیاض، رخت: ہو۔ بقیہ سب: ہوں

سلہ۳ بیاض، رخت: طپاں۔ بقیہ سب: تپاں

آفتاب

(ترجمۂ گایتری)

یہ نظم رزاق، بیاض، کلام، باقیات طبع سوم اور بانگ میں ملتی ہے۔ اس

کے پہلے کا نوٹ رخت طبع دوم اور باقیات طبع سوم میں موجود ہے۔ رزاق، بیاض اور کلام میں ایک آدھ مصرع کا قدیم متن ہے۔ بیاض میں اس کا عنوان 'آفتابِ حقیقت' ہے۔

سلہ قلمی کلام: شے سے۔ رزاق، بیاض، بانگ: شے میں

سٹہ منسوخ متن رزاق بیاض، کلام میں: تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے۔

سٹہ باقیات: روح و رواں۔ بقیہ سب: روحِ رواں

سکہ قلمی کلام: محفلِ خرد۔ سہو کتابت، رزاق بیاض، بانگ اور باقیات: وجود

شہ قلمی کلام میں ردیف 'ہے'۔ رزاق اور بانگ میں ردیف 'میں'

شکریۂ انگشتری

(منسوخ)

یہ نظم اقبال نامہ حصۂ اول ص ۱۰-۱۶، باقیات، سرود اور نوادر میں شامل ہے۔

سلہ اقبال نامہ اور نوادر: کشمیر۔ سہوِ کتابت۔ باقیات اور سرود: کشمر وزن کے لحاظ سے یہاں کشمیر نہیں آسکتا۔

سٹہ باقیات ونوادر: لہانور سرود: لہاور۔

لاہور کے مختلف نام رہے ہیں جن میں لہاور بھی تھا اور لہانور بھی۔ آخر الذکر کا تلفظ لہا + نور (بروزن مفاعیل) ہے۔ اس شعر میں یہ نام نہیں آسکتا۔ لہاور ہی ہو سکتا ہے۔ لاہور کے مختلف ناموں کے لیے ملاحظہ ہو پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر کا مضمون لاہور، تاسیس اور وجہِ تسمیہ، ص ۲۹ مشمولہ نقوش لاہور نمبر شمارہ ۹۲ - فروری ۱۹۶۲ء

سٹہ باقیات ونوادر: واہ۔ سرود: وہ: وہ سے ہی مصرع موزوں ہوگا۔ فارسی لغات میں 'وہ' بھی ملتا ہے۔

سکہ باقیات: کردہ۔ سرود ونوادر: کرد

غزل (منسوخ)

عاشقِ دیدارِ محشر کا تمنائی ہوا

یہ غزل مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ رزاق، بیاض، کلام، رخت، باقیات، سرود اور نوادر میں ملتی ہے۔ رزاق اور باقیات میں مقطع غائب ہے۔ کیا رزاق نے اس کے موضوع سے ناخوش ہو کر اسے حذف کر دیا؟ بیاض میں یہ غزل دو جگہ ہے ص ۴۲ پر اور ص ۱۱۱ الف پر۔ آخر الذکر میں مقطع لکھ کر پنسل سے کاٹ دیا ہے۔

سلہ نوادر: تماشائی۔ بقیہ سب: تمنائی۔

سلہ رخت: یہ بینائی۔ بیاض ص ۴۲: بینائی بھی۔ بقیہ سب مع بیاض ص ۱۱۱ الف: بینائی ہی۔

سلہ بیاض: میں۔ بقیہ سب: پر

سلہ بیاض ص ۴۲: کہہ کے۔ بقیہ سب مع بیاض ص ۱۱۱ الف: کہہ کر

سلہ نوادر: پروانہ کر۔ نہ سہواً محذوف

سلہ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۵، نیز باقیات سوم ص ۱۰۵: کوئی دیکھے انھیں۔

سلہ اقبال نامہ حصۂ دوم: مٹ کے۔ بقیہ سب: پس کے

سلہ بیاض: پس کے جس دم۔ میں، سہواً حذف

شمع

یہ نظم مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء میں نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ بانگ میں لیتے وقت اس کے ۱۱ شعر حذف کیے گئے اور بعض مصرعوں میں ترمیم کی گئی، نیز بندوں کی تقسیم میں بھی تبدیلی کی گئی۔ نقشِ اول رزاق، احمد دین، بیاض اور کلام میں ملتا ہے۔ سرود اور باقیات میں دس منسوخ اشعار ہیں۔ آخری سے پہلا منسوخ شعر ــــ درد اک دبہ غیر۔۔۔ موجود نہیں۔ رخت طبع دوم میں ص ۴۳ پر نوٹ ہے کہ اس کے دس اشعار بانگِ درا کی زینت نہ بن سکے۔ اس کے بعد، کے بجائے ۱۱ شعر دیے ہیں، لیکن ان میں آٹھ ہی منسوخ ہیں تین اشعار یعنی ہمارے متن کے ۱۶، ۱۸، ۱۹ بانگ درا میں موجود ہیں۔ ان کی جگہ جو تین منسوخ اشعار نہیں دیے گئے انھیں ص ۱۰۲۔

۱۷ اپر دیا ہے۔ سرود میں ص ۳۰۱ پر اس کے دو منسوخ اشعار متفرقات کے ضمن میں ہیں۔ مرتب کو یہ معلوم نہیں کہ یہ شمع کے ہیں۔

سلہ منسوخ متن: ع تیری طرح سے میں بھی ہوں اے شمع دردمند

سلہ باقیات ص ۷۹۷: دل و دیں ظاہرا سہو کتابت۔ غالب کے شعر میں دل و دل ہے جو رزاق وغیرہ میں دیا ہے۔

سلہ منسوخ متن: دانائے بے قراریِ محشر اثر نہیں۔

سلہ قلمی کلام: احسان، بقیہ سب: احساس

سلہ رزاق، احمددین، بیاض، کلام: سامانِ طرزِ ظلمت۔ سرود و باقیات: ساماں طراز

سلہ منسوخ متن: خوشبو ہے گل میں، بادہ میں اسی سے ہے۔

سلہ منسوخ متن: نظارہ۔ بانگ: کشاکش

سلہ رزاق بیاض، کلام: میرے۔ بانگ: میری

سلہ احمددین میں یہ مصرع دو جگہ مختلف متنوں کے ساتھ آیا ہے۔ مشفق خواجہ کے مرتبہ ایڈیشن میں ص ۴۹۶ پر ہے ع فرقت کے نیستاں میں سراسر نفیر ہوں۔ پھر ص ۵۰۵ پر ہے ع فرقت میں نیستاں کے سراسر نفیر ہوں۔ بقیہ تمام کتب یعنی رزاق، بیاض، کلام، رخت، سرود اور باقیات میں مطابقِ متن ہے۔

سنلہ منسوخ متن: اے شمع! حالِ قیدیِ دامِ خیال دیکھ

سللہ یہ منسوخ شعر سرود و باقیات میں نہیں۔ پرانے مجموعوں میں رزاق بیاض اور کلام میں ہے۔ روزگار ص ۱۴۸ پر یہ شعر دے کر نوٹ لکھا ہے کہ یہ شعر کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوا لیکن یہ کم از کم رزاق میں ضرور آیا تھا۔ اب رخت طبع دوم میں آگیا ہے۔

سللہ بیاض: میرے۔ بقیہ سب: میری۔ نوادر ص ۳۰۲ میں اس مصرع میں 'فغاں' کے بعد 'کو' حذف ہے۔

ایک آرزو

کلام میں اس نظم کا عنوان 'کنج عزلت' دیا ہے جب کہ مخزن سمیت بقیہ سب میں 'ایک آرزو' ہے۔ یہ نظم سب سے پہلے مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ نقش اول میں ۲۰ شعر تھے۔ بیاض میں ۲۹ شعر ہیں شعر ۱۵ نہیں لیکن بیاض میں ص ۱۱۱ الف پر آخری چار شعر پھر لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس سے پہلے کا ورق غائب ہے۔ رزاق میں ۲۸ شعر ہیں۔ شعر نمبر ۱۵، ۲۶ نہیں ہیں۔ کلام میں پورے ۳۰ شعر ہیں لیکن تین مقامات ص ۸۶، ۱۰۱، ۱۳۰ پر بکھرے ہوئے ہیں۔ بانگ میں ۲۰ شعر ہیں۔ دس منسوخ اشعار سرود اور باقیات سوم میں دیے ہیں۔ رخت میں دو مختلف جگہوں ص ۲۲ اور ۱۷۰ پر نو منسوخ اشعار دیے ہیں۔ دوسرے بند کا پہلا شعر 'سمجھیں مرے سخن کو ...... شامل نہیں ہے۔ اس نظم میں دو بار اصلاح کی گئی کیونکہ قلمی کلام متن بیاض اور رزاق سے زیادہ فرسودہ ہے۔ قلمی کلام میں اس کا عنوان 'کنج عزلت' بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۱؎ قلمی کلام : ہو گریزاں۔ رزاق، بیاض، بانگ : بھاگتا ہوں

۲؎ قلمی کلام : دامانِ کوہ میں۔ رزاق، بیاض، بانگ : دامن میں کوہ کے

۳؎ قلمی کلام : سے۔ رزاق، بیاض، بانگ : میں

۴؎ قلمی کلام، بیاض، رزاق : غم کا کانٹا دل سے۔ بانگ : غم کا دل سے کانٹا۔ منسوخ متن میں 'کا کانٹا' میں تنافر اصوات تھا۔ اسے دور کرنے کے لیے تعقیدِ لفظی روا رکھی گئی۔

۵؎ قلمی کلام : چھپے ہوں۔ رزاق، بیاض، بانگ : چھپوں میں ۶؎ بیاض : میرے۔ بقیہ سب : میری

۷؎ رزاق، بیاض، کلام : کے۔ بانگ : کی

۸؎ قلمی کلام اور رخت : ٹھہرے آکر۔ سرود و باقیات : آکر ٹھہرے۔ بیاض اور رزاق میں یہ شعر نہیں۔

۹؎ رزاق، قلمی کلام، رخت : اس ادا سے۔ سرود و باقیات : اس طرح

۱۰؎ رزاق، بیاض، کلام : چاندنی۔ سرود اور باقیات : چاندنے۔ آخر الذکر صحیح ہونا

چاہیے کیونکہ اقبال کو چاندنا کا لفظ بہت مرغوب تھا۔

۱۱؎ قلمی کلام: بھلاؤں سہوِکتابت۔ بقیہ سب: بہاؤں

۱۲؎ قلمی کلام: گویا میرا وطن۔ رزاق، بیاض، رخت، سرود، باقیات: میرا کوئی وطن۔

۱۳؎ رزاق، بیاض، رخت: نوبت بہ ماچو آمد۔ قلمی کلام: چوں نوبت بماشد۔ سہوِکتابت موزونیت کا تقاضا ہے کہ "چوں نوبتے بماشد" ہونا چاہیے چنانچہ سرود و باقیات میں یہی ہے یعنی "چوں نوبتے بماشد" بیاض ص ۱۱۱ الف پر بھی یہی الفاظ ہیں۔

سرود، باقیات اور قلمی کلام میں اس شعر کے دونوں طرف واوین ہیں جس سے اشارہ ہوتا ہے کہ یہ شعر کسی اور کا ہے۔ رزاق اور رخت میں نہیں۔

گلِ پژمردہ

اس کے نقشِ اوّل میں ۷ اشعار تھے۔ بانگ درا میں صرف چھ شعر منتخب ہوئے۔

نقشِ اوّل رزاق، بیاض، کلام اور نوادر میں ملتا ہے۔ ۱۱ منسوخ اشعار سب سے پہلے روزگار میں ص ۳۳۰ تا ۳۳۲ پر دیے گئے۔ اس کے بعد باقیات اور رخت میں نقل کیے گئے۔ کے اے وحید کی انگریزی ببلیوگرافی آف اقبال کراچی۔ جنوری ۱۹۶۵ء ص ۱۲ کے مطابق یہ نظم ایک مجموعے تصویر مناظر لاہور میں ص ۷۲ پر شامل ہے۔

۱؎ روزگار، باقیات: یہ بیاض، رزاق، رخت، نوادر: پر

۲؎ کلام، باقیات: ہیں بقیہ سب: ہے۔

۳؎ بیاض بادبھا سہوِکتابت بقیہ سب بادِصبا

۴؎ رزاق کا متن، بیاض، نوادر: ہم جو خود۔ رزاق کا صحت نامہ اور بقیہ سب: ہم جو نے

۵؎ صرف کلام میں پہلے مصرع میں بھی شکایت لکھا ہے۔ بقیہ سب میں پہلے مصرع میں حکایت اور دوسرے میں شکایت ہے۔

سید کی لوحِ تربت

یہ نظم مخزن جنوری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ بانگ میں لیتے وقت ایک پورا بند اور

کئی دوسرے شعر حذف کیے گئے نیز دو نئے شعر شامل کیے گئے۔ مخزن میں شامل شدہ نقشِ اول میں ۳۴ شعر تھے جو احمد دین، بیاض اور کلام میں موجود ہیں۔ رزاق میں ۳۲ شعر ہیں یعنی ہمارے متن کے پہلے بند کا چوتھا شعر اور آخری بند کا تیسرا شعر موجود نہیں۔ سرود میں نوادر سے نقل کیا ہے۔ اس لیے وہاں بھی ۳۲ شعر ہیں حالانکہ ص ۲۳۰ کے فٹ میں صراحت ہے کہ اصل نظم ۳۴ شعروں پر مشتمل ہے۔ سرود اور باقیات میں ۲۲ منسوخ اشعار ہیں۔ رخت میں دو مقامات پر یعنی ص ۱۴۴ اور ۱۶۸ پر ۲۳ شعر ہیں جن میں سہواً پہلے بند کی ٹیپ کا نقشِ اول بھی منسوخ کے ذیل میں لے لیا ہے حالانکہ وہ محض اختلافِ نسخ پیش کرتا ہے۔ بانگِ درا میں نقشِ اول کے ۳۴ اشعار میں سے ۲۴ کو رد کیا اور محض دس قبول کیے۔ ان دس میں دو نئے اشعار کا اضافہ کیا۔ یہ ہمارے متن کے چوتھے اور پانچویں بند کی ٹیپ کے اردو اشعار ہیں جو مخزن میں تھے۔ واضح ہو کہ ہمارے متن میں ۳۶ اشعار ہیں۔

سلہ قلمی کلام: تیر۔ بقیہ سب: تار

سلہ ٹیپ کے اس شعر کا منسوخ متن مخزن، احمد دین، رزاق، بیاض، کلام اور رخت میں یہ ہے

ہے خموشی یہاں (کذا) زیبِ لذتِ تقریر دیکھ
دیدۂ باطن سے تو اس لوح کی تحریر دیکھ

سلہ احمد دین، رزاق، بیاض، کلام: سامان۔ بانگ: اسباب

سلہ ۵ھ احمد دین، رزاق، بیاض، کلام، نوادر: پہلے مصرع میں قافیہ 'تقریر'، دوسرے میں تحریر۔ بانگ میں اس کے برعکس۔

سلہ بیاض، کلام، سرود، باقیات: نہ پیدا ہو کہیں۔ رزاق، رخت، نوادر: کہیں پیدا نہ ہو

سلہ رزاق، بیاض، رخت، نوادر: کے کلام، سرود، باقیات: کی

سلہ کلام: اب جو بیاض، رزاق، نوادر: جواب

سلہ رزاق نے متن میں 'اس کا' لکھا ہے جیسے صحت نامے میں 'جس کا' بنا دیا ہے۔
بیاض، نوادر: اس کا۔ بقیہ سب: جس کا

۱۰ احمد دین، بیاض، کلام، رزاق: پہ نوادر: ہر۔ رخت، سرود، باقیات: یہ
۱۱ باقیات: نہ خاک۔ سہوِ کتابت۔ بقیہ سب: بخاک
۱۲ رفت: آزار زاغ۔ اس طرح قافیہ بہم پہنچ جاتا ہے لیکن ترکیب بے معنی ہے۔ بقیہ سب: آزارہا
۱۳ بیاض، احمد دین، رزاق، کلام: دل ترا گیتی نما ہو گر مثالِ جامِ جم بانگ: مطابق متن
۱۴ بیاض: شاعر کے لیے۔ سہوِ کتابت بقیہ سب: شاعری کے

غزل (منسوخ)

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم

اس غزل کے پانچ شعر مخزن جنوری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئے۔ یہی رزاق، بیاض، کلام، رخت، سرود، نوادر میں بھی ملتے ہیں۔ کہیں کوئی اختلافِ متن نہیں۔ بعد کے تین شعر بیاضِ اعجاز سے لے کر سرود ص ۲۵۵ پر چھاپے گئے۔ وہیں سے لے کر باقیات ص ۳۹۸-۳۹۷ پر سرود کے اعتراف کے ساتھ دیے گئے۔

غزل

ع کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا

یہ غزل مخزن فروری ۱۹۰۳ء نیز خدنگِ نظر لکھنؤ فروری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے بانگ میں شامل کرتے وقت اس میں کچھ شعروں کا اضافہ کیا گیا۔ باقیات طبعِ سوم میں اس کے دو منسوخ اشعار قطعہ کے عنوان سے دیے ہیں (ص ۳۹۹) حالانکہ یہ کسی طرح قطعہ بند نہیں۔ احمد دین میں اس غزل کے سات شعر ہیں جن میں دونوں منسوخ اشعار شامل ہیں۔ رزاق میں چھے شعر ہیں یعنی ۱، ۲، ۴، ۶، ۹، ۱۰۔ قلمی کلام میں یہ غزل دو حصوں میں ص ۶۰ اور ص ۱۰۱ پر ہے جن میں بیشتر اشعار کی تکرار ہے لیکن دونوں حصوں میں ملا کر تمام ۱۲ اشعار آگئے ہیں۔ بیاض میں آٹھ شعر ہیں نمبر ۳، ۵، ۸، ۱۱ نہیں۔

سرود میں بعض غزلوں کے حذف شدہ اشعار کے تحت ص ۱۶۰ پر چار اشعار ہیں دو منسوخ اور دو متداول۔ معلوم نہیں ان دو اشعار کو کیوں محذوف سمجھا گیا۔ تبرکاتِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج حیدرآباد میں دو منسوخ اشعار دیے ہیں۔

لے رزاق، بیاض، کلام: وطن۔ بقیہ سب: چمن

ابرِ گہر بار یا فریادِ امّت

(منسوخ)

یہ نظم اول ہفتہ وار وطن لاہور میں شائع ہوئی۔ پہلی قسط ۶ مارچ ۱۹۰۳ء کے پرچے میں، دوسری قسط (غالباً دوسرے بند کے گیارھویں شعر سے) ۲۰ مارچ کے شمارے میں، تیسری قسط آٹھویں بند سے آخر تک ۲۷ مارچ کے پرچے میں۔ بعد میں یہ نظم بیاض رزاق، احمد دین، رخت، سرود، نوادر اور باقیات میں ملتی ہے۔ اس کا تیسرا بند 'دل' کے عنوان سے بانگ میں لیا گیا لیکن اس میں سے بھی دو شعر نہیں لیے گئے۔ بشیر الحق دیسنوی نے تبرکاتِ اقبال ص ۱۰۷-۱۶ پر اس کا گیارھواں بند اس عنوان سے چھاپا۔

علامہ اقبال کی غیر معروف ابتدائی غزل

عرض بحضور سرور کائنات

یورپ جانے سے قبل کہی گئی

مندرجۂ اخبار نمک پاش کراچی جلد نمبر ۱، شمارہ ۳۔ ۷ مئی ۱۹۵۰ء

اس میں ٹیپ کا شعر ہے جس سے مرتب کو جاننا چاہیے تھا کہ یہ غزل نہیں، ترکیب بند کا ایک بند ہے۔ تبرکات میں اس بند کے اشعار نمبر ۴، ۸، ۱۱، ۱۴ نہیں۔

نظم کا مکمل ترین نسخہ سرود ہے جہاں دوسرے نسخوں کے مقابلے میں کئی اشعار زیادہ ہیں۔ اس میں کل ۱۴۸ شعر ہیں جو ہمارے متن میں دیے ہیں۔ رخت میں تیسرے بند میں صرف دو منسوخ شعر دیے ہیں۔ جب کہ بقیہ تمام کتب میں متداول اور منسوخ سبھی اشعار دیے ہیں۔ اگر رخت میں تیسرے بند کے دو منسوخ اشعار ہیں تو متداول اشعار کو بھی ملالیا

جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ جملہ کتب میں ساتویں بند تک اشعار کی تعداد اور ترکیب یکساں ہے۔ صرف وطن میں چھٹے بند کا دوسرا شعر نہیں ۔ بند ۸ تا ۱۲ کی صورتِ حال ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ دوسرا کالم چار کتابوں کا ماخذ ۱۹۱۳ء کا ایڈیشن معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۱۳ء کے ایڈیشن میں خود اقبال نے نو شعر خارج کیے اور بعض میں نہایت معمولی ترمیم کی۔

بند کا نمبر	سرود	بیاض احمد دین، رزاق اور باقیات	نوادر	رخت
۸	۸	۸	۷	۸
۹	۱۹	۱۵	۱۵	۱۴
۱۰	۱۱	۸	۸	۸
۱۱	۱۵	۱۳	۱۳	۱۱
۱۲	۱۱	۱۱	۱۱	۱۰
جملہ اشعار	۱۴۸	۱۳۹	۱۳۸	۱۲۶

(+ نو متداول)

آٹھویں بند میں نوادر میں شعر ۲ نہیں ۔ نویں بند کے اشعار نمبر ۶، ۸، ۱۲، ۱۸ احمد دین، رزاق، باقیات، نوادر اور رخت میں نہیں ۔ رخت میں مزید شعر نمبر ۱۳ بھی نہیں ۔ دسویں بند کے اشعار نمبر ۸، ۹، ۱۰ احمد دین، رزاق، باقیات، نوادر اور رخت میں نہیں ۔ گیارھویں بند کے اشعار نمبر ۴، ۵ احمد دین، رزاق، باقیات، نوادر، رخت میں نہیں رخت میں اس بند کے مزید اشعار ۶، ۹ بھی نہیں ۔ بارھویں بند کا شعر نمبر ۶ رخت میں نہیں ۔ اس طرح ذیل کے اشعار محض سرود میں ہیں ۔

نویں بند کے نمبر ۶، ۸، ۱۲، ۱۸ ۔ دسویں بند کے ۸، ۹، ۱۰، گیارھویں بند کے اشعار نمبر ۴، طٰؤیں بند میں سرود اور تبرکات کے سوا بقیہ سب کتابوں میں شعر نمبر ۶، ۷ کی ۶، ۷ کی ترتیب بدلی ہوئی ہے ۔

سلہ سرود : ہے زباں پر ۔ بقیہ سب مع وطن : ہے نہ لب پر

۳؎ سرود، بیاض ورزاق : راہ ۔ نوادر، بانگ و باقیات : ملک
۴؎ رزاق و سرود : جل گیا ۔ وطن، بیاض، بانگ، نوادر، باقیات : جل گئے ۔
۵؎ تمام کتابوں میں 'جو' لیکن اقبال نامہ ص ۱۰ پر حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام
خط میں اقبال نے 'تو' کو بہتر مانا ہے ۔
۶؎ سرود اور احمد دین : نکتے ۔ بقیہ سب مع وطن : نقطے
۷؎ باقیات : دیدہ ۔ بقیہ سب : حضرت
۸؎ صرف سرود : رہ ساحل ۔ بقیہ سب مع وطن : لبِ ساحل ۔
۹؎ بیاض : فقر ۔ سہوِ کتابت ۔ بقیہ سب : قصر
۱۰؎ رزاق، رخت : چلمن کا ۔ وطن، احمد دین، باقیات، نوادر : چلمن کو
۱۱؎ یہ شعر وطن میں نہیں ہے ۔
۱۲؎ صرف سرود : حسن کس کا ۔ بقیہ سب مع وطن : حسن تیرا
۱۳؎ باقیات اور نوادر : رہ یثرب میں ۔ بقیہ سب : رہِ یثرب سے
۱۴؎ بیاض : تیری ۔ سہو کتابت ۔
۱۵؎ رزاق اور رخت : عالم ظلمت ۔ بقیہ سب مع وطن : ظلمتِ عالم
۱۶؎ باقیات و نوادر : برپا ۔ بقیہ سب : پیدا ۔
۱۷؎ باقیات و نوادر : ہے ۔ بقیہ سب : ہو
۱۸؎ بیاض : تیرے پیاروں کا یہ حال ہو لے شافع محشر ۔ بقیہ سب ۔ مطابق متن ۔
۱۹؎ صرف وطن : درد کی ۔ سرود : درد کے ۔
۲۰؎ صرف وطن : صرف تمنا ۔ سہوِ کتابت
۲۱؎ احمد دین، باقیات، نوادر : ع یاد فرمان نہ تیرا نہ خدا کا کہنا ۔ وطن، رزاق، بیاض
رخت اور سرود : مطابقِ متن ۔
۲۲؎ وطن : کہے ۔ سرود : کہیں ۔

۲۳ تبرکات : اسی - بقیہ سب : ایسی

۲۴ تبرکات : ہوں تیرا - بقیہ سب : ہیں تیرے

۲۵ تبرکات : او نوح - بقیہ سب : اے نوح

۲۶ تبرکات : راہیں اخوت کی نکالیں - بقیہ سب : راہ اخوت کی نکالی

۲۷ صرف وطن : نہیں یہ - بقیہ سب : نہیں ہے -

۲۸ تبرکات : کے سہارے - بقیہ سب : کو سہارے

۲۹ صرف وطن : مچلے بقیہ سب پگھلے -

۳۰ رزاق اور سرود : یاں - وطن، احمد دین، باقیات، نوادر : جو

۳۱ صرف وطن : جو - بقیہ سب : کہ

۳۲ رزاق، رخت : رہ اسی - بقیہ سب مع وطن : راہ اس

پرندے کی فریاد

اس نظم کا نقش اول مخزن فروری ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا - یہ رزاق، احمد دین کی طبع اوّل بیاض، قلمی کلام سرود اور نوادر میں بھی موجود ہے - باقیاتِ اقبال سوم میں دو منسوخ اشعار اور ایک ترمیم شدہ شعر درج ہے -

ابتدائی متن میں چار چار شعروں کے پانچ بند ہیں یعنی کل ۲۰ شعر - بانگ میں ۱۱ ہیں، نو منسوخ کیے گئے تین بند ہیں - ابتدائی متن کے پہلے دو بندوں کو ملا کر بانگ میں ایک کر دیا ہے لیکن اس کے بعد قدیم دوسرے بند کی ٹیپ نہیں لی بلکہ قدیم تیسرے بند کی لی ہے - قدیم تیسرا بند نئے متن میں دوسرا بند ہو جاتا ہے اور وہاں قدیم دوسرے بند کی ٹیپ لگا دی گئی ہے - قدیم چوتھا بند پورے کا پورا منسوخ کر دیا ہے -

رحیم بخش شاہین نے ایک مجموعہ اوراقِ گم گشتہ (علامہ اقبال کے بارے میں غیر مدوّن تحریریں) اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور سے اپریل ۱۹۷۵ء میں شائع کیا - اس میں جلیل احمد قدوائی کا ایک مضمون، اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن، شامل ہے - یہ مضمون

اصلاً ہمایوں لاہور بابت مئی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں اس نظم کے بعض مصرعوں کا ابتدائی متن دیا ہے۔ ذیل میں جلیل، سے اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

سطر ۱ قدیم متن، مخزن، بیاض، کلام، احمد دین، رزاق، سرود: وہ جھاڑیاں چمن کی، وہ میرا آشیانہ۔ کلام میں جھاڑیا ہے۔

سطر ۳ بیاض، کلام، رزاق، جلیل، سرود: پہلا لفظ 'جانا'۔ دوسرا 'آنا'

سطر ۴ بیاض، کلام، احمد دین، رزاق، سرود: شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منھ دھلانا۔

سطر ۵ رزاق کے متن میں 'کا آشیانا' چھپا ہے لیکن صحت نامے میں اسے 'آب ودانا' بنا دیا ہے۔ بیاض، کلام: پنجرے کا آشیانہ۔ احمد دین، باقیات، سرود: پنجرے کا آب ودانا۔

سطر ۶ بیاض، کلام، رزاق: کے۔ احمد دین، جلیل، سرود: کی

سطر ۷ جلیل: خوشی میں۔ بقیہ سب خوشی سے

سطر ۸ باقیات (مخزن سے ماخوذ): آزاد رہ کے جس نے دن اپنے ہوں گزارے۔

کلام: آزاد جس نے رہ کر ہوں اپنے دن گزارے۔ بیاض، رزاق، احمد دین، سرود، مطابقِ متن۔

غزل
(منسوخ)

ع لڑکپن کے ہیں دن، صورت کسی کی بھولی بھولی ہے

یہ غزل سب سے پہلے مخزن اپریل ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ راقم الحروف کی نظر سے گزر چکی ہے۔ اس غزل کے ساتویں شعر کے بارے میں مشفق خواجہ نے اقبال از احمد دین ص ۴۶۶ پر لکھا ہے کہ یہ شعر مخزن میں ہے لیکن راقم الحروف نے مخزن کو دیکھ کر جو نوٹ لکھا ہے اس کے مطابق یہ مخزن میں نہیں۔ فی الحال مخزن میری دسترس میں نہیں۔ خدا معلوم مشفق خواجہ کو سہو ہوا کہ راقم الحروف کو۔ دورِ حاضر میں یہ شعر سب سے پہلے روزگار ص ۴۴ پر دیا گیا۔ اس کے بعد باقیات سوم ص ۴۰۴ پر بقیہ ۸ اشعر احمد دین، بیاض، باقیاتِ طبع اوّل،

سرود اور نوادر میں ملتے ہیں۔ قلمی کلام میں صرف آٹھ شعر ہیں پہلے چار اور نمبر ۹، ۱۳، ۱۴، ۱۶۔ رخت میں ۲ تا ۵، ۸، ۱۱، ۱۵، ۱۶ ہیں۔ باقیات طبع اوّل، رخت، سرود اور نوادر میں مخزن ۱۹۰۳ء کا ذکر ہے لیکن مہینہ کسی نے نہیں دیا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ انھوں نے براہِ راست مخزن سے نہیں لیا۔

سلہ کلام: بھولی بھالی۔ سہوِ کتابت۔ بقیہ سب: بھولی بھولی

سلہ باقیات: ایشور۔ مخزن، بیاض، احمد دین، نوادر: ایشر

سلہ بیاض، احمد دین، رخت: آتا مخزن، باقیات، سرود، نوادر: آتا

سلہ باقیات، سرود، غزل میری نہیں ہے۔ بیاض: غزل میری، غزل کیا ہے۔ مخزن، احمد دین: غزل تیری، غزل کیا ہے۔

غزل

ع ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

یہ غزل سب پہلے مخزن اپریل ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ راقم الحروف کی نظر سے گزر چکی ہے۔ اس میں ہمارے متن کا شعر نمبر ۱۳ نہیں۔ آخر میں اشعار کی ترتیب بدلی ہوئی ہے یعنی ۱۰، ۱۴، ۱۱، ۱۵، ۱۶ ہیں۔ کُل ۱۵ شعر ہیں۔ مخزن کے علاوہ یہ غزل بیاض، احمد دین، رزاق، کلام، رخت، سرود، نوادر، باقیات طبع سوم اور بانگ میں ملتی ہے۔ نوادر کا ماخذ رزاق ہی ہے۔ بانگ میں نو شعر ہیں جب کہ مخزن کے چھے شعر اور ایک مزید شعر منسوخ کیے گئے۔ احمد دین کے یہاں صرف شعر ہیں نمبر ۵، ۸، ۹، ۱۴، ۱۱ اور مقطع۔ بیاض، رزاق اور نوادر میں ۱۴ شعر ہیں یعنی ۱۲، ۱۳ نہیں۔ یہ دونوں اشعار صرف سرود اور باقیات طبع سوم میں ہیں۔ سرود اور باقیات میں ساتوں منسوخ اشعار ہیں۔ باقیات طبع سوم ص ۴۴۵ پر ان منسوخ اشعار کا ماخذ مخزن اپریل ۱۹۰۳ء لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ان میں "صبح ازل ..." والا شعر بھی ہے جو مخزن میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ باقیات کا ماخذ سرود ہے مخزن نہیں۔ معلوم نہیں سرود کو یہ شعر کہاں سے ملا۔ قلمی کلام میں ۱۲ شعر ہیں یعنی

ہمارے متن کے ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۵ نہیں لیکن ان میں سے ۱۱ اور ۱۵ کو بعد میں کسی نے جدید قلم سے اضافہ کیا ہے جو معتبر نہیں۔ رخت میں پانچ منسوخ اشعار ہیں یعنی ۸، ۹، ۱۱، ۱۴ اور مقطع۔ میں نے مقطع کے بعد جو شعر درج کیا ہے وہ جوش ملسیانی نے اپنی کتاب 'اقبال کی خامیاں' میں ص ۵۵ پہ دیا ہے لیکن چونکہ یہ مخزن میں نہ تھا اس لیے اس کی سند نہیں۔

سلہ احمد دین: عذرِ دوست۔ سہو کتابت۔ بقیہ سب میں۔ حسنِ دوست

سلہ منسوخ متن، مخزن، رزاق، احمد دین، بیاض، کلام میں: محشر میں اور عذر نہ۔۔

سلہ سرود و باقیات: محفل میں۔ رزاق، احمد دین، قلمی کلام، رخت، نوادر: محفل ہو

سلہ سرود و باقیات: ترے۔ بقیہ سب: مرے

دو غزلہ (منسوخ)

اہلِ درد

رزاق میں صرف پہلی غزل ملتی ہے۔ بیاض، رخت، باقیات۔ سرود اور نوادر میں دونوں غزلیں ہیں۔ رزاق اور سرود میں پہلی غزل کے دو شعر ۵ و ۱۳ موجود نہیں۔ رخت میں یہ دونوں شعر ہیں لیکن نمبر ۷، ۸ نہیں۔ نوادر اور باقیات سوم میں اس غزل کے جملہ اشعار ہیں۔ بیاض میں دوسری غزل بالکل شروع میں ہے، دوسری ص ۵۲ پہ ہے۔ دوسری غزل میں شعر ۱۳ مکرر درج ہوگیا ہے۔

سلہ بیاض: متاع مشتری۔ بقیہ سب: متاع و مشتری۔

سلہ بیاض، باقیات: کیوں بقیہ سب: کیا

سلہ بیاض میں 'ہے' ہوا محذوف

سلہ بیاض، باقیات سوم: رہتے ہیں۔ بقیہ سب: رہتے ہیں

غزل (منسوخ)

ع تو نہاں مجھ سے مرے داغِ جگر کی صورت

یہ غزل مخزن مئی ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ کتنے اشعار شائع ہوئے یہ معلوم نہیں کیونکہ مخزن سامنے نہیں مختلف مجموعوں میں یہ کیفیت ہے۔

بیاض، رزاق اور احمد دین: نمبر ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۷۔

قلمی کلام میں دس شعر ہیں یعنی نمبر ۱ تا ۸، ۱۰، ۱۶

بیاض، رزاق اور احمد دین کے پانچ اشعار کے بعد آٹھ اشعار پہلی بار روزگار ص ۲۵۷-۲۵۶ پر شائع ہوئے۔ نمبر ۱، ۶ تا ۱۲

رخت میں ۲، ۳، ۴، ۱۷ ہیں

نوادر میں آٹھ شعر ہیں ۱۵، ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۶، ۱۷

سرود میں بھی یہی آٹھ ہیں لیکن ان کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔

باقیات طبع اول میں ۴ اشعر ہیں، باقیات طبع سوم میں جملہ ۱۷ اشعر ہیں لیکن انھیں دو غزلیں بنا کر ۱۴۴ تا ۱۴۶ پر درج کیا گیا ہے۔ پہلی غزل میں مطلع نہیں مقطع ہے، دوسری میں مطلع ہے مقطع نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام اشعار مل کر ایک ہی غزل ہیں۔ غزل کا ساتواں شعر نذیر نیازی کی 'دانائے راز' میں ص ۸۵-۸۴ پر دیا ہے۔

رخت میں چار شعر ۲، ۳، ۴، ۱۷ دے کر ان کا ماخذ مخزن مئی ۱۹۰۳ء لکھا ہے باقیات طبع سوم میں نو شعروں کی پہلی غزل کو مخزن مئی ۱۹۰۳ء سے ماخوذ بتایا گیا ہے، وہ نو اشعار ہیں ۲، ۳، ۴، ۱۳، ۵، ۱۴ تا ۱۷۔ معلوم نہیں ان دونوں میں سے کس نے واقعی مخزن سے لیے ہیں اور کس نے کسی دوسرے ماخذ سے لے کر مخزن سے ماخوذ کرنے کا ڈھونگ رچایا ہے۔

ص ۱ سرود و باقیات: میں۔ قلمی کلام، بیاض، رزاق: کی

ص ۲ سرود: جوش میں۔ بقیہ سب: جوش زن

ص ۳ روزگار ص ۲۵۷: نیز نذیر نیازی: دیکھے تو۔ بقیہ سب: دیکھیے

ص ۴ نوادر: ہیت۔ سرود اور باقیات: صورت

ﮧ۵ نوادر: سے، سہوِ کتابت۔ سرود: سی
ﮧ۶ نوادر: پر۔ سرود: یہ

برگِ گل

(منسوخ)

روزگارِ فقیر ص ۳۱۹ کے مطابق یہ نظم ۱۹۰۳ء میں 'ایک دردمند دل کی عرض' کے عنوان سے دلی بھیجی گئی تھی۔ ہفتہ دار وطن لاہور بابت ۲۹ جولائی ۱۹۰۳ء میں یہ مناجات کے عنوان سے چھپی۔ مخزن ستمبر ۱۹۰۳ء میں اس کا عنوان 'برگِ گل' تھا اور یہی عنوان اب سب سے زیادہ مقبول ہے۔ یہ نظم بیاض کلام، رزاق، رخت، سرود، باقیات اور نوادر میں ملتی ہے۔ وطن اور مخزن کے علاوہ یہ بیاض اور کلام میں مکمل ہے۔ باقیات کے ابتدائی مجموعوں میں سات اشعار کم تھے۔ وہ سات اشعار سب سے پہلے روزگار میں دیے گئے۔ وہ ہمارے متن کے ذیل کے اشعار ہیں۔ پہلے بند کا شعر نمبر ۹۔ دوسرے بند کا ٹیپ سے پہلے کا شعر، تیسرے بند کا نمبر ۳، ۵، ۶، ۷، ۱۲۔ بعد ازیں رخت اور باقیات طبع سوم میں یہ تمام اشعار شامل کر دیے گئے۔ قلمی کلام میں یہ نظم دو حصوں میں دو مقامات پر نقل کی گئی ہے۔

ﮧ۱ وطن: درگاہ، سہوِ کتابت
ﮧ۲ باقیات: مری۔ بیاض، کلام، روزگار، رخت: تری
ﮧ۳ قلمی کلام: لہریں۔ وطن بیاض، رخت: نہریں
ﮧ۴ رخت: اُن۔ بقیہ سب بہ شمول وطن: اس
ﮧ۵ وطن: ایسے۔ بقیہ سب: جیسے۔ شاید اقبال نے خود مخزن میں 'جیسے' بنا دیا ہو۔ مخزن دسترس میں نہیں۔
ﮧ۶ باقیات و نوادر: ہیں درباں۔ بقیہ سب: درباں ہیں
ﮧ۷ قلمی کلام: رکھ لیجو۔ بقیہ سب: رکھ لینا
ﮧ۸ وطن: کہہ رہے ہیں دیکھ کر مجھ کو قفس میں شاد شاد۔ ممکن ہے۔ خود اقبال نے اصلاح

کر کے مخزن میں مصرع بدل دیا ہو۔

۹ھ وطن: نہ یہ جائے ۔ بقیہ سب: نہ جائے یہ

۱۰ھ قلمی کلام: باغ ہی ۔ بقیہ سب: باغ بھی

۱۱ھ باقیات، ہندوستانی ایڈیشن: کہہ دیا ہے تنگ آ کر کے اتنا بھی کہ میں مجبور تھا۔ سہوِ کتابت

۱۲ھ رخت: فزوں تر۔ بقیہ سب: فزوں ہے۔

۱۳ھ وطن: اس مصیبت ۔ بقیہ سب: آہ اس غم

۱۴ھ روزگار: وہ بقیہ سب: یہ

۱۵ھ وطن میں پہلے 'رونے والا' سے شروع ہونے والا شعر ہے بعد میں 'ہوں مرید' سے شروع ہونے والا ۔ بقیہ سب میں ترتیب مختلف ہے ۔ معلوم نہیں ایسا مخزن میں تو نہ تھا؟

۱۶ھ صرف وطن: موجِ ساحل بقیہ سب: موجِ دریا

غزل

جہاں زندگی ہے وہاں آرزو ہے

یہ غزل سب سے پہلے مولوی عبدالرحمن طارق بی اے کی مرتبہ کتاب جہانِ اقبال میں ملی ۔ وہاں سے تبرکاتِ اقبال میں ص ۵۵ پر نقل کیا گیا ۔ اس کے بعد یہ نوادر ص ۶۱ میں نظر آتی ہے جہاں اسے کسی 'بانگِ درا مرتبہ حیدر آباد' سے لیا گیا ہے ۔ ہمیں حیدر آباد سے شائع ہونے والی کسی 'بانگِ درا' کا علم نہیں ۔ یہ کتاب رزاق کی مرتبہ کلیاتِ اقبال بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ غزل اس کلیات میں نہیں ۔ نوادر اور تبرکات کے اختلافات دیکھ کر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ نوادر کا ماخذ تبرکات نہیں ۔ باقیات ص ۱۴۳ پر اس غزل میں جملہ آٹھ شعر ہیں جب کہ بقیہ دونوں میں سات سات شعر ہیں ۔ تبرکات میں ہمارے متن کا ساتواں شعر نہیں جو باقیات اور نوادر میں ہے ۔ نوادر میں ہمارے متن کا تیسرا

شعر نہیں جو تبرکات اور باقیات میں ہے۔

ؔ۱ باقیات: ترا تبرکات اور نوادر: مرا۔ خودشناسی کی مناسبت سے 'مرا' صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ؔ۲ نوادر میں یہاں یہ مصرع ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے۔ سہوِ کتابت مقطع سے پہلے کے شعر کا مصرعِ ثانی لکھ دیا گیا ہے۔ تبرکات اور باقیات: مطابقِ متن۔

غزل
(منسوخ)

عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا

قلمی کلام میں اس غزل کے ۱۱ شعر ہیں۔ یعنی ۴، ۹ نہیں۔ سرود میں بھی ۱۱ ہیں یعنی ۴ اور ۵ کو چھوڑ کر نوادر میں دس ہیں یعنی ۲، ۴، ۵ نہیں۔ روزگار ص ۲۵۰ پر نمبر ۵۔ اور ۳ ہیں یعنی یہ اس سے پہلے قلمی کلام کے علاوہ اور کسی مجموعے میں نہیں ملتے۔ رخت میں تو طبعِ دوم ۱۹۷۷ء میں بھی صرف چھے شعر ہیں یعنی ۱، ۱۱، ۹، ۴، ۱۰، ۷۔ صرف باقیات سوم میں ۱۳ شعر ہیں۔ ہمارے متن میں باقیات ہی کی ترتیب روا رکھی گئی ہے۔

ؔ۱ رخت: کا۔ بقیہ سب: کو

ؔ۲ نوادر: مے پی۔ رخت: یہی پی۔ قلمی کلام، سرود، باقیات: مجھے پی کے

ؔ۳ قلمی: ہوئی۔ سہوِ کتابت۔ روزگار، باقیات: ہوتی

ؔ۴ رخت: سکھائی تمھیں کس نے یہ بے حجابی۔ بقیہ سب: مطابق متن

ؔ۵ روزگار، باقیات: معذور۔ قلمی کلام: مغرور۔ معنی کے لحاظ سے معذور نامناسب اور مغرور بہتر ہے۔ دسویں شعر میں بھی محبوب کی عادت 'مغرور رہنا' قرار دی ہے۔

ؔ۶ رخت: لگاوٹ بقیہ سب: دکھاوے۔

ؔ۷ قلمی کلام: بصدقہ۔ بقیہ سب: کے صدقے

شہ رخت : بڑا - بقیہ سب : بڑے
۹ہ رخت : گیسوئے طور، سہوِ کتابت - بقیہ سب : حور
ناہ رخت : انکساری - بقیہ سب : خاکساری
للہ قلمی کلام : میں آنکھوں میں صورتِ نور رہنا - غیر موزوں

غزل (منسوخ)

ع پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے

یہ غزل خدنگِ نظر لکھنو اگست ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی لیکن اس وقت اس میں کتنے شعر تھے واضح نہیں - باقیاتِ طبع سوم میں ص ۴۱۷ تا ۴۱۹ پر اس غزل کا پہلا حصہ دیا ہے جو ۱۵ شعروں پر مشتمل ہے ہمارے متن کے ابتدائی ۱۴ شعر اور مقطع - اس کے نیچے حوالہ دیا ہے خدنگِ نظر اگست ۱۹۰۳ء - یہی ۱۵ شعر سرود میں ہیں - لیکن روزگار ص ۲۸۴ پر لکھا ہے کہ "۲۱ اشعار کی یہ غزل رسالہ خدنگِ نظر اگست ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی - پندرہ اشعار ایک مجموعے میں شامل ہو چکے ہیں - باقی چھے اشعار درجِ ذیل ہیں ء

یہ چھے اشعار ہمارے متن میں مقطع سے پہلے کے چھے اشعار ہیں جو باقیات سوم میں غزل کے دوسرے حصے کے طور پر روزگار کے حوالے سے دیے گئے ہیں - رزاق ص ۲۲۳، رخت ص ۱۰۹ اور نوادر ص ۲۹۶ میں اس غزل کے صرف تین شعر ہیں نمبر ۲، ۵، ۱۴ ظاہر ہے کہ رخت اور نوادر نے رزاق سے لیے ہیں -

لہ یہ شعر نذیر نیازی کی کتاب 'دانائے راز' اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۹ء میں ص ۸۵ پر نقل ہے - وہاں اس میں 'آغوش' ہے جبکہ بقیہ سب میں 'دامان' ہے

انسان اور بزمِ قدرت

یہ نظم مخزن ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی - بانگ میں لیتے وقت اس کے دو شعر

حذف کیے گئے ۔ یہ بیاض، کلام، احمد دین اور رزاق میں بھی ملتی ہے ۔ رخت میں صرف دو منسوخ شعر دیئے ہیں ۔

۱ رزاق بیاض ، کلام : صبح سورج کو جو چڑھتے ہوئے دیکھا میں نے ۔

۲ بیاض : تصویریں ۔ سہوِ کتابت

۳ قلمی کلام : سبز پوشاک، سہوِ کتابت ۔ بقیہ سب میں ' سرخ پوشاک '

۴ بیاض : ہے تری ۔ بقیہ سب : ہے ترے ۔

۵ احمد دین بیاض ، کلام ' رزاق : عظمت ۔ بانگ : سطوت

۶ احمد دین ۔ رزاق ۔ بیاض ، کلام : نور کے واسطے محتاج ۔

۷ قلمی کلام : ہے ۔ بقیہ سب : ہو

۸ قلمی کلام میں ' وہ ' حذف ہے

۹ قلمی کلام : پی کے ۔ بقیہ سب : پی ہے

شیشۂ ساعت کی ریگ

(منسوخ)

یہ نظم خدنگِ نظر لکھنؤ بابت ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی ۔ اب یہ قلمی کلام ' سرود اور باقیات میں شامل ہے قلمی کلام میں شعر نمبر ۳ ، ۱۰ ، ۱۱ نہیں ۔

۱ قلمی کلام : اب تک ہے یاد تجھ کو ۔ سرود و باقیات : دیکھے ہوئے ہیں تیرے ۔

دردِ عشق

یہ نظم اصلاً پنجۂ فولاد لاہور بابت ۲۸ ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی اور پھر العصر مارچ ۱۹۱۳ء میں ۔ اصلاً اس میں ۲۱ شعر تھے ۔ آٹھ منسوخ ہوئے اور ۱۳ بانگ میں لیے گئے ۔ یہ نظم رزاق ۔ بیاض ۔ کلام اور نوادر میں ہے ۔ بیاض میں العصر سے نقل کی ہے ۔ رزاق میں ہمارے متن کا تیسرا شعر نہیں جو بیاض ، کلام اور بانگ میں موجود ہے ۔ نوادر کا ماخذ

رزاق ہی ہے اس لیے وہاں بھی یہ شعر نہیں چونکہ مرتّب اس شعر کے حذف سے واقف نہیں اس لیے انھوں نے ص ۲۶۲ کے فٹ نوٹ میں لکھ دیا ہے کہ نظم میں جملہ اشعار کی تعداد بیس ہے۔ نوادر میں ہمارے متن کا چھٹا شعر ص ۲۶۲ پر نظم میں شامل ہے لیکن ص ۳۰۲ پر سہواً ۱۱ سے دوبارہ متفرقات کے ذیل میں دے دیا ہے۔ قلمی کلام میں یہ نظم دو حصّوں میں ہے۔ پہلے ۱۳ شعر ص ۱۳۱ پر ہیں، بعد کے آٹھ شعر ص ۱۳۴ پر۔ رخت میں صرف آٹھ منسوخ اشعار دیئے ہیں۔ بیاض میں جملہ ۲۱ شعر ہیں۔

۱ھ منسوخ متن بیاض، کلام اور رزاق میں: ع خالی تری شراب سے گلشن کا جام ہو

۲ھ منسوخ متن: پوشیدہ کنجِ دل میں کہیں راز ہو ترا

۳ھ رزاق اور نوادر: ہر دم۔ بیاض، کلام اور بانگ: ہر دل

غزل

ع کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے۔

یہ غزل مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ رزاق، احمد دین، قلمی کلام اور نوادر میں ملتی ہے۔ رخت، سرود اور باقیات میں صرف منسوخ اشعار ہیں تفصیل یہ ہے۔ رزاق میں صرف چار شعر یعنی نمبر ۲، ۳، ۱۵، ۱۷ ہیں احمد دین میں ۱۳ شعر ہیں یعنی ذیل کے چھپے نہیں ۱، ۵، ۹، ۱۲، ۱۵، ۱۸۔ قلمی کلام اور نوادر میں پورے ۱۹ شعر ہیں۔ رخت میں دس منسوخ اشعار کے علاوہ شعر ۷ بھی لکھ دیا گیا ہے جو منسوخ نہیں۔ سرود میں دس منسوخ اشعار کے ساتھ سہواً شعر ۱۲ کو بھی قلم زد سمجھ کر شامل کرلیا گیا ہے۔ باقیات سوم میں محض دس منسوخ اشعار ہیں۔ بیاض میں ص ۴۴ - ۴۳ پر صرف چار اشعار یعنی ۲، ۳، ۱۵، ۱۶ ہیں

۱ھ رخت: سیکھا۔ بقیہ سب: سیکھی

۲ھ قلمی کلام اور سرود: کہاں۔ بقیہ سب: یہاں

۳ھ احمد دین: صحرا میں۔ بقیہ سب بانگ سمیت: صحرا ہوں

۴ھ باقیات ص ۴۴۸: بت خانہ۔ سہوِ کتابت۔ بقیہ سب: تبخالہ

۵ منسوخ متن احمد دین اور قلمی کلام: جرس ہوں میں، صدا خوابیدہ ہے مرے رگ و پے میں۔
۶ باقیات: رمز کو بھی تو نے سمجھا ہے۔ بقیہ سب: مطابقِ متن
۷ منسوخ متن رزاق، احمد دین، رخت، بیاض: جوانی ہے تو ذوقِ آرزو بھی لطفِ ارماں بھی۔ کلام میں یہ مصرع ہے لیکن وہاں 'ارماں کی جگہ' حرماں ہے۔ نوادر میں اس غزل کو مخزن اکتوبر ۱۹۰۳ء سے منقول دکھایا ہے لیکن اس جگہ مخزن کے متن کی جگہ بانگ کا متداول مصرع دیا ہے۔

عشق اور موت

یہ نظم سب سے پہلے مخزن نومبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ رزاق، احمد دین، بیاض اور کلام میں ملتی ہے۔ رزاق میں دوسرے بند کا دوسرا شعر نہیں۔ رخت، سرود اور باقیات طبع سوم میں اس کے چھ منسوخ شعر دیے ہیں۔ بیاض میں اس کا ابتدائی حصہ ص ۴۸ا پر اور اس کے بعد کا جزو ص ۵۲ پر ہے۔

۱ منسوخ متن: کہ خود نا خوشی مستِ جام خوشی تھی۔
۲ رزاق، بیاض: سیہ، شام کو پیرہن دے رہے تھے۔ بقیہ سب مطابقِ متن
۳ بیاض، رزاق: پھولتی بقیہ سب: پھوٹتی
۴ احمد دین: ذوق، سہوِ کتابت
۵ رزاق، بیاض: تھا نظارہ یہ۔ کلام: تھا یہ نظارہ۔ بانگ: یہ نظارا تھا۔
۶ رزاق، بیاض: نظارہ سراپا۔ کلام، بانگ: سراپا نظارا
۷ یہ شعر رزاق میں نہیں۔
۸ کلام: وہ پتلا۔ بیاض، بانگ: کہ پتلا
۹ رزاق، بیاض: کے آنکھوں بقیہ سب: کی آنکھوں

قصیدۂ تہنیت دربارِ بہاول پور

(منسوخ)

یہ قصیدہ مخزن نومبر ۱۹۰۳ء نیز وطن ہفتہ وار بابت ۴ دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔ یہ مولوی عزیز الرحمٰن کی تاریخ نواب بہاول خاں میں بھی ہے جہاں سے لے کر نقوش اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء میں ۵۳۵ تا ۵۴۳ پر شائع کیا گیا۔ اس کے علاوہ بیاض، کلام، رخت، باقیات سرود اور نوادر میں ملتا ہے۔

کہیں کوئی اہم اختلافِ نسخ نہیں جو اختلافات ہیں وہ اکثر سہو کتابت معلوم ہوتے ہیں۔ خاتمے سے پہلے کا آٹھواں شعر یعنی ــــہ دستگیری ہو شریفوں کی . . . . . صرف وطن میں ہے اور کسی مجموعے میں نہیں جس کے معنی ہیں کہ جملہ مجموعوں میں یہ قصیدہ مخزن سے یا اس کی نقل سے نقل کیا گیا ہے۔ 'وطن' کے بعد یہ شعر پہلی بار راقم الحروف پیش کر رہا ہے۔ ذیل میں نقوش سے مراد تاریخ نواب بہاول خاں کا متن ہے۔

لہ وطن، نقوش: رہے بقیہ سب: رہی

۲ہ وطن، بیاض، نقوش اور باقیات: در زمیں۔ سہو کتابت۔ بقیہ سب: سرزمیں

۳ہ وطن: ٹھیرے۔ بقیہ سب: ٹھہرے

۴ہ قلمی کلام: سونے کو۔ بقیہ سب: سبزے کے

۵ہ باقیات اور نوادر: دھووے۔ بقیہ سب: دھوئے

۶ہ وطن: جس کی۔ بقیہ سب: جس کے

۷ہ قلمی کلام: آستان۔ سہوِ کتابت

۸ہ قلمی کلام، باقیات، نوادر: انجم نجیب۔ سہوِ قرأت و سہوِ کتابت۔ وطن بیاض، نقوش، رخت اور سرود: انجم بہ جیب۔

۹ہ قلمی کلام: اسے کہ آئے ہے۔ سہوِ قرأت۔ بقیہ سب: مطابقِ متن

۱۰ہ قلمی کلام، باقیات طبعِ اول: عنبر۔ بقیہ سب بہ شمولِ وطن: عبہر۔ (عبہر نرگس کی ایک قسم ہے)

۱۱ه نوادر : ہے ۔ بقیہ سب : ہو
۱۲ه وطن : مل جائے ۔ بقیہ سب : مل جائیں
۱۳ه قلمی کلام : سرزمیں ۔ بقیہ سب : ہر زمیں
۱۴ه قلمی کلام : کے صدف ۔ بقیہ سب : کی صدف
۱۵ه یہ شعر صرف وطن میں ہے
۱۶ه وطن : 'گی' حذف ۔ سہوِ کتابت
۱۷ه قلمی کلام : رفاقت ، سہوِ کتابت

پیامِ صبح

یہ نظم فتنہ وعطرِ فتنہ گورکھپور بابت ۲۳ دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ (بحوالہ ظہیر انور دہلوی "رسالہ فتنہ وعطرِ فتنہ، آج کل جولائی ۱۹۸۶ء ص ۶۳) ۔ یہ رزاق، احمد دین، بیاض اور بانگ میں ملتی ہے۔ رخت میں صرف تین منسوخ شعر دیے ہیں ۔ احمد دین میں تیسرا منسوخ شعر نہیں۔

۱ه احمد دین : کے ۔ بقیہ سب : سے
۲ه رزاق، رخت : دروازہ ۔ احمد دین، بیاض : شیرازہ
۳ه رزاق کے متن میں 'نے' چھپا ہے ۔ صحت نامے میں 'سے' بنایا ہے ۔ بیاض، احمد دین : نے ۔ رخت : سے
۴ه رزاق ، بیاض ، احمد دین : صحرا کو ۔ بانگ : صحرا میں
۵ه بیاض ، رزاق : گئی گورِ غریباں کو جو وہ زندوں کی بستی سے
۶ه احمد دین : ہے ، سہوِ کتابت ۔ بقیہ سب : سے
۷ه رزاق کے متن میں 'خواب میں' ہے ۔ صحت نامے میں 'خواب سے' بنایا ہے ۔ بیاض ، احمد دین : خواب میں ۔ بانگ : خواب سے

زهد اور رندی

یہ نظم رزاق، بیاض، کلام، احمد دین اور بانگ میں ملتی ہے۔ بیاض اور کلام میں جملہ ۲۰ شعر ہیں۔ رزاق میں ۲۰ شعر ہیں یعنی نمبر ۱۱ اور ۱۴ محذوف ہیں۔ سرود اور باقیات میں صرف منسوخ شعر ہیں۔

ے۱ رزاق، بیاض: مرے مزرعِ اورادپہ پانی۔ کلام، احمد دین: مری مزرعِ اورادپہ پانی۔ سرود: مطابق متن

ے۲ منسوخ متن بیاض، کلام، احمد دین اور رزاق میں: بے لوث ہے جوں نکہتِ گل اس کی جوانی۔ بیاض میں نگہت ہے۔

ے۳ بیاض، کلام، رزاق: حقیقت سے بانگ: حقیقت کا

شاعر

یہ نظم رزاق، بیاض، کلام اور بانگ میں ملتی ہے۔ قلمی کلام میں ایک سہوِ کتابت کے سوا تینوں میں کوئی فرق نہیں۔

ے۱ قلمی کلام: منزلِ صنعت رہ پیما۔ یعنی صنعت کے بعد 'کے' حذف ہے جو سہوِ کتابت ہے۔

غزل

ع ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

مخزن میں اس غزل میں ۱۵ شعر تھے۔ یہ سب رزاق، بیاض اور کلام میں ہیں۔ احمد دین میں شعر ے۱۲ کو چھوڑ کر بقیہ ۱۴ شعر ہیں۔ نوادر میں ے۵ کو چھوڑ کر بقیہ ۱۴ ہیں۔ رخت میں نقص تو منسوخ اشعار ہیں۔ سرود اور باقیات طبع سوم نے بھی محض منسوخ اشعار دینے چاہیے لیکن وہ سہواً تو منسوخ اشعار کے ساتھ ہمارے متن کے ے۲ کو بھی منسوخ سمجھے حالانکہ یہ بانگِ درا میں ملتا ہے۔ اس طرح سرود نے دس شعر دیے اور باقیات نے وہیں سے نقل کر دیے (اعتراف کے بغیر) بانگ میں محض چھے شعار مخزن کی ترتیب بدل کر ہیں۔

۱۔ قلمی کلام : ہے ۔ بقیہ سب بانگ سمیت : ہو ۔
۲۔ قلمی کلام : میں ۔ بقیہ سب بانگ سمیت : اَے
۳۔ احمد دین : اگر ۔ بقیہ سب : اُگوں
۴۔ احمد دین : گرے ۔ بقیہ سب : گری
۵۔ احمد دین : برا ہو گیا ہوں ، بھلا چاہتا ہوں ۔ بقیہ سب : ہرا ہو گیا ہوں ، پھلا چاہتا ہوں

ترجمہ از ڈائک

یہ اشعار سب سے پہلے مخزن جنوری ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئے ۔ قلمی کلام ، رزاق ، سرود ، رخت ، نوادر اور باقیات میں ملتے ہیں ۔

۱۔ رخت : یوں ۔ بقیہ سب : یہ
۲۔ باقیات سوم : ہر اک فعل کی نیت سے ۔ بقیہ سب : مطابقِ متن

طفلِ شیر خوار

یہ مکمل نظم رزاق ، بیاض اور کلام میں ملتی ہے ۔ تینوں میں ۲۰ شعر ہیں ۔ سرود اور باقیات میں اس کے آٹھ منسوخ اشعار کے ساتھ شعر نمبر ۱۳ کو بھی منسوخ سمجھ کر درج کر دیا ہے حالانکہ وہ بانگ میں موجود ہے گو دوسرے مصرع میں خفیف سی اصلاح ہے ۔ قدیم متن میں ہمارے متن کے شعر نمبر ۱۳ ، ۱۴ کی ترتیب معکوس ہے ۔

۱۔ رزاق : مگر ۔ بیاض میں اصلاً اس لفظ کی جگہ چھوٹ گئی ہے ۔ بعد میں یہاں 'مگر' لکھا اور اس کے اوپر دوسرا لفظ 'جسے' لکھا یعنی ع مہرباں ہوں میں جسے تا مہرباں ..... کلام ، بانگ : مجھے
۲۔ کلام ، بیاض ، سرود : ہوتی ۔ رزاق : ہو تو
۳۔ بیاض : ٹکڑے (حیدرآبادی تلفظ) ۔ بقیہ سب : ٹکڑے
۵۔ باقیات طبع سوم : پتی ۔ بقیہ سب : پتے

۶ منسوخ متن : وصلِ ہستی سے چمک اٹھا۔ بانگ : مطابقِ متن
۷ کلام : جب کسی شے سے بگڑ کر مجھ پہ چلاتا ہے تو۔ رزاق، بیاض، بانگ : مطابقِ متن۔

رخصت اے بزمِ جہاں

نظم کا ابتدائی متن مخزن لاہور اور دکن ریویو حیدرآباد دونوں میں مارچ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس وقت نظم کا عنوان بیراگ، تھا جو رزاق میں موجود ہے۔ ابتدائی متن رزاق، احمد دین، بیاض اور کلام میں بھی ملتا ہے۔ بانگ میں لیتے وقت چھ شعر حذف کیے گئے۔ رخت، سرود اور باقیات طبعِ سوم میں صرف منسوخ اشعار دیے ہیں۔ نوادر اقبال ص ۱۰۳ پر اس کے پہلے دو منسوخ اشعار متفرق اشعار کے تحت دیے ہیں۔ مرتب کو علم نہیں کہ یہ اس نظم کے نقشِ اوّل کے حصے ہیں۔

۱ رزاق، بیاض، رخت اور نوادر : زخم پیکاں ہے۔ احمد دین، قلمی کلام، سرود : تیر لگتی ہے۔
۲ بیاض : تری۔ بقیہ سب : ترے
۳ قلمی کلام : عجز و خوشامد زادہ۔ سہوِ کتابت۔ بقیہ سب : مطابق متن
۴ قلمی کلام : آہ یوسف۔ 'وہ' سہواً حذف
۵ بیاض، رزاق اور رخت : اب مگر بارِ خموشی۔ احمد دین، قلمی کلام، سرود، باقیات سوم : مطابقِ متن
۶ قلمی کلام : میرا۔ سہوِ کتابت۔ بقیہ سب تیرا
۷ بیاض : کوہسار۔ بقیہ سب : کہسار
۸ رزاق : سبزہ۔ بقیہ سب بانگ سمیت : سبز
۹ احمد دین، سرود، باقیات سوم : گلستان کے۔ بقیہ سب : گلستاں میں
۱۰ منسوخ متن : باغِ عالم۔ بانگ : بزمِ ہستی۔
۱۱ احمد دین : کناروں میں۔ بیاض۔ رزاق : کنارے پر۔ قلمی کلام : کناروں پہ

بانگ : کناروں پر

۱۲ے بیاض، رزاق کا۔ بقیہ سب: چمن کی ۱۳ے کلام : ہے۔ بقیہ سب : ہو۔ بیاض میں 'ہے' کو کاٹ کر 'ہو' بنایا ہے۔ احمد دین ص ۲۱۵ پر مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ بانگ میں 'ہے' ہے لیکن بانگ دوم وسوم ایڈیشن دونوں میں 'ہو' ہے۔ ۱۴ے کلام رہ رہ کے بقیہ سب : رہ رہ کر۔

تصویرِ درد

اس نظم کا نقشِ اوّل مخزن مارچ ۱۹۰۲ء کے علاوہ بیاض، احمد دین، رزاق اور نوادر میں ملتا ہے۔ نوادر میں رزاق ہی سے نقل کیا گیا ہے۔ نقشِ اوّل میں جملہ ۱۲۸ شعر ہیں بانگ میں لیتے وقت اس کے ۶۲ شعر حذف کر دیے گئے۔ تیسرا اور ساتواں بند پورے کا پورا منسوخ ٹھہرا۔ رخت، سرود اور باقیات طبع سوم میں اس کے صرف منسوخ اشعار دیے ہیں۔ رخت میں ۶۲ کے بجائے ۶۱ منسوخ اشعار ہی ہیں ساتویں بند کا تیسرا شعر جو منسوخ ہے درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ بانگ میں نقشِ اوّل کے ۶۶ اشعار لیے گئے۔ دوسرے، چوتھے اور پانچویں بند کے ٹیپ کے شعر بھی رد کر دیے گئے تھے۔ ان کی جگہ نئے اشعار شامل کیے گئے۔ ہمارے متن میں نقشِ اوّل کے ۱۲۸ شعر نیز بانگ میں اضافہ شدہ تین نئے شعر یعنی کُل ۱۳۱ شعر ہیں۔

۱ے رزاق : اڑائی۔ بیاض، احمد دین، نوادر اور بانگ : اڑالی

۲ے باقیات طبعِ سوم ص ۳۲۰ پر اس شعر کے مصرعِ ثانی کے بجائے اس سے پہلے شعر کا مصرعِ ثانی لکھ دیا ہے۔

۳ے دوسرے بند کا نقشِ اوّل کا ٹیپ کا شعر خارج کر دیا گیا۔ متداول ٹیپ کا شعر اس طرح تعمیر کیا گیا کہ تیسرے منسوخ بند کے ٹیپ کے شعر کا مصرعِ ثانی لیا گیا اور اس پر نیا مصرعِ اولیٰ کہہ دیا گیا۔

۴ ه بیاض، احمد دین، سرود اور باقیات سوم: نَفَس کا آسنہ باندھا ہوا ہے میں نے آہوں میں۔ رزاق، رخت اور نوادر: مطابقِ متن

۵ ه احمد دین، سرود، باقیات سوم: بیٹھا ہوں۔ بیاض، سرود، رخت: بیٹھا ہو

۶ ه رزاق، نوادر: چھوڑا باغ میں۔ بیاض، بانگ: چھوڑ اِس باغ میں

۷ ه بیاض، احمد دین، رزاق، نوادر: جھگڑے ہو رہے۔ بانگ: رزم آرائیاں ہیں

۸ ه احمد دین: زندگانی میں۔ رزاق، بیاض، نوادر، سرود اور رخت: زندگانی سے

۹ ه بیاض، رزاق: تیری۔ احمد دین، نوادر، سرود، رخت: تیرے

۱۰ ه احمد دین: رونا لکھا تھا۔ بیاض، رزاق، رخت، سرود، نوادر: لکھا تھا رونا

۱۱ ه منسوخ متن نیز بانگ درا طبعِ اوّل و سوم: تری ظلمت میں میں روشن۔ بانگِ درا طبعِ دوم: تری تاریک راتوں میں۔ اقبال نے بانگِ درا طبعِ دوم میں کچھ اصلاحیں کی تھیں۔ طبعِ سوم کے لیے سہواً طبعِ اوّل کاتب کو دے دی گئی جس کی وجہ سے طبعِ دوم کی اصلاحیں اس میں نہ آسکیں۔ یہ رائے ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی نے اپنی کتاب تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ (اقبال اکادمی پاکستان لاہور طبعِ اول نومبر ۱۹۸۲ء) ص ۲۷ میں ظاہر کی ہے۔

۱۲ ه سرود: خبر۔ بقیہ سب: سبق

۱۳ ه و ۱۴ ه بیاض: صفائی دل۔ بقیہ سب: صفائے دل

۱۵ ه سرود اور باقیات سوم: کا مینا۔ بقیہ سب: کی مینا

۱۶ ه احمد دین: دکھا دے۔ بیاض، رزاق، نوادر اور بانگ: دکھا وہ

۱۷ ه رزاق، نوادر: اپنے۔ احمد دین اور بانگ: اپنی

۱۸ ه احمد دین میں اس بند کے اشعار کی ترتیب مختلف ہے۔

۱۹ ه رزاق کے متن میں 'ہے استغنا کہ' چھپا ہے۔ صحت نامے میں 'یہ استغنا ہے' بنا دیا ہے۔ نوادر: ہے استغنا کہ۔ بیاض، احمد دین، بانگ: یہ استغنا ہے۔

۲۰ ه احمد دین: تھی۔ بیاض، رزاق، نوادر، بانگ: ہے

ﮦ۱۲ احمد دین، بیاض: کوتاہ۔ بقیہ سب: کوتہ

ماہِ نو

خدنگِ نظر مئی ۱۹۰۴ء میں اشاعت کے وقت اس نظم میں ۱۷ اشعار تھے یعنی ہمارے متن کے شعر ۸ کو چھوڑ کر۔ قلمی کلام میں یہ ۱۷ کے ۱۷ اشعر موجود ہیں۔ بانگ میں محض سات شعر ہیں یعنی ۱۱ حذف کیے گئے، چھے برقرار رکھے گئے۔ لیکن محذوف اشعار میں سے ہمارے متن کے چوتھے شعر کا پہلا مصرع قبول کیا اور اس کے ساتھ ہمارے متن کے ساتویں شعر کا مصرعِ ثانی بادنیٰ ترمیم لگا دیا گیا اور اس طرح ہمارے متن کا شعر ۸ یا بانگ کا تیسرا متداول شعر تشکیل دیا گیا۔ روزگار میں ۳۲۳ تا ۳۲۵ پر ۱۱ منسوخ اشعار دیے ہیں۔ احمد دین کے مشفق خواجہ کے مرتبہ ایڈیشن میں ص ۴۹۸ پر ہمارے متن کے آخری پانچ شعر دیے ہیں۔ رزاق نے اپنے مقدمے کے ص ۹۸ پر بانگ درا کے پہلے بند کے تین شعر یعنی ہمارے متن کے شعر نمبر ۱، ۲، ۸ ہی دیے ہیں۔ باقیات سوم ص ۳۱۲ - ۳۱۱ پر نو منسوخ شعار دیے ہیں، یعنی 'شام کی' کے ردیف و قافیہ والے دونوں منسوخ اشعار نظر انداز کر دیے ہیں۔

ﮦ۱ گر رہا ہے طشتِ گردوں میں۔ بانگ: مطابقِ متن۔

ﮦ۲ قلمی کلام: بمضمونِ شب' سہوِ کتابت۔ دوسرے مصرع میں بھی 'مضمون' رکھنے سے قافیہ غائب ہو جاتا ہے۔ روزگار اور باقیات: موزونِ شب

ﮦ۳ قلمی کلام: کر رہا۔ روزگار و باقیات: کر رہی۔ مصرع کی نثر ہو گی 'شام کی زلفِ مشکیں دام بافی کر رہی ہے'؛ چونکہ زلف مونث ہے اس لیے 'کر رہی' صحیح ہے۔

ﮦ۴ بانگ کا یہ متداول شعر دو منسوخ اشعار کے مصرعوں سے بنایا گیا ہے۔ ہمارے متن کے شعر ۴ کا پہلا مصرع اور شعر ۷ کا دوسرا مصرع ملا دیا گیا۔ دوسرے مصرع میں اُن کو بدل کر 'یا' کر دیا گیا۔

ﮦ۵ روزگار: راہرو۔ قلمی کلام اور باقیات: رہرو

۶۶ قلمی کلام: جویاں۔ احمد دیں: جویا۔ بانگ: طالب۔ قلمی کلام میں یہ ٹیپ کا شعر نہیں بلکہ دوسرے بند کا درمیانی شعر ہے۔ ٹیپ کا شعر ہمارے متن کا آخری شعر ہے۔

نالۂ فراق

اس نظم کا ابتدائی متن مخزن بابت مئی ۱۹۰۴ء میں ملتا ہے۔ یہی رزاق میں دیباچہ ص ۵، بیاض اور کلام میں ہے۔ آخر الذکر میں یہ ص ۵۰ پر ہے۔ اس کا چھٹا بند سہواً حذف ہوگیا تھا۔ اسے بعد میں ص ۱۰۲ پر لکھ دیا گیا۔ رخت اور سرود میں اس کے صرف منسوخ شعر دیے ہیں۔ بانگ میں اشاعت کے وقت اس کے تین بند' ۳، ۶ اور ۸ حذف کردیے گئے۔

۱ و ۲ قلمی کلام میں سہواً ردیف کو 'است' کے بجائے 'ام' لکھ دیا ہے یعنی چیدہ ام خوابیدہ ام

۳ رزاق: آبادی سے۔ بیاض، کلام، بانگ: آبادی میں

۴ سب میں 'دور' دیا ہے لیکن رخت کے اغلاط نامے میں ہدایت ہے کہ اسے 'درد' بنا دیا جائے۔ یہ شاید تصحیح نہیں، اصلاح ہے۔ میں نے دور ہی رہنے دیا جائے۔ یہ شاید تصحیح نہیں، اصلاح ہے۔ میں نے 'دور' ہی رہنے دیا۔

۵ کلام میں اس کی ردیف: ہے بقیہ سب: تھا۔

۶ بیاض، کلام، رخت: یہ شکستہ آئنہ رزاق، بانگ، آئنہ ٹوٹا ہوا

۷ کلام: یہ۔ بیاض میں پہلے 'میں' لکھا تھا۔ کاٹ کر 'اب' لکھ دیا۔ رزاق، بانگ: پر

۸ کلام: کلیم ذرۂ سینائے علم۔ بیاض: کلیم اے شعلۂ سینائے علم۔ رزاق و بانگ: مطابق متن

۹ کلام: مری بیاض، رزاق اور بانگ: تری

۱۰ رزاق: عالم کے ہر ذرے میں۔ کلام: عالم میں ہر ذرے سے۔ رخت، سرود، بیاض، باقیات: عالم کے ہر ذرے سے

۱۱ رزاق: بادر سوزن بقیہ: در پا سوزن

غزل

ع کش وہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے

یہ غزل اصلاً مخزن جون ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت اس میں ۱۴ شعر تھے۔ یہ بیاض، کلام، رزاق اور نوادر میں ملتے ہیں۔ بیاض میں چھے شعر ص ۲۴ پر ہیں اور بقیہ آٹھ اشعار ص ۴۸ پر۔ رزاق کے یہاں ترتیب اشعار بدلی ہوئی ہے۔ بانگ میں نو شعر لیے گئے، پانچ کو حذف کر دیا گیا۔ رخت، سرود اور باقیات سوم میں محض منسوخ اشعار دیے ہیں۔

۱؎ باقیات سوم: میں ڈھونڈ۔ بقیہ سب: میں نہ ڈھونڈ ۲؎ بیاض میں سہواً 'کو' حذف ہو گیا ہے

چاند

یہ نظم سب سے پہلے مخزن جولائی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ جہاں اس میں ۷ اشعر تھے یہ سب رزاق، بیاض اور کلام میں موجود ہیں۔ بانگ میں لیتے وقت چار شعر منسوخ کیے گئے۔ رخت، سرود اور باقیات سوم میں محض یہ چار منسوخ شعر دیے ہیں۔ اس نظم کے اختلافاتِ نسخ اور متروکات جلیل احمد قدوائی نے اپنے مضمون 'اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن'، ہمایوں لاہور بابت مئی ۱۹۵۱ء میں دیے۔ بعد میں یہ مضمون رحیم بخش شاہین کی مرتبہ کتاب اوراقِ گم گشتہ (علامہ اقبال کے بارے میں غیر مدوّن تحریریں) اسلامک پبلیکیشنز لاہور، بارِ اوّل اپریل ۱۹۷۵ء میں شامل کیا گیا جہاں راقم الحروف کی نظر سے گزرا۔

۱؎ سرود و باقیات: گویا ہے۔ بقیہ سب: ہے گویا

۲؎ قلمی کلام: ہے مگر دریاے دل میں تیری کشتی موج زن۔ بقیہ سب مع بانگ۔ مطابقِ متن

۳؎ قلمی کلام: میرے گھر میں۔ سرود و باقیات: دل میں میرے۔ رزاق، بیاض، رخت: میرے دل میں

۴؎ قلمی کلام: آفرینش سے۔ بقیہ آفرینش میں۔

۵؎ بیاض، رزاق: ہے جو سنسان۔ قلمی کلام: ہے جو پنہاں وہ۔ بانگ: مطابقِ متن

۶؎ رزاق، بیاض، کلام، رخت، انوارِ اقبال ص ۲۰۹ از بشیر احمد ڈار لاہور طبع دوم ۱۹۷۷ء۔ یعنی میں صیاد ہوں جس کا وہ آہو اور ہے

۵ جلیل احمد قدوائی، اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن میں: پہلو میں بانگ: پہلو سے

ابر

یہ پوری نظم بیاضِ جلیل میں ملتی ہے جس کی تفصیل متن نظم کے ساتھ حاشیے میں دی ہے اس نظم کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ سات متداول اشعار پر مشتمل ہے جو رزاق کے دیباچے ص ۲۰ اور بانگ درا میں ملتا ہے۔ دوسرا حصہ نو منسوخ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں سے شعر نمبر۲ جن میں۔۔۔ کو چھوڑ کر بقیہ آٹھ اشعار سرود رفتہ اور باقیاتِ اقبال طبع سوم (ص ۱۹۷) میں زمانہ کانپور بابت جون ۱۹۰۵ء سے لے کر شائع کیے ہیں، سرودِ رفتہ میں فٹ نوٹ ہے۔

"بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار اسی نظم کا ایک حصہ ہیں جو بانگِ درا میں "ابر" کے زیرِ عنوان ص ۹۲ پر شائع ہوئی ہے"

زمانہ میری دسترس میں نہیں لیکن ڈاکٹر اکبر حیدری نے مجھے لکھا ہے کہ زمانہ میں "سربن" کے متعلق اقبال کا حاشیہ دیا ہے۔ "ایبٹ آباد میں ایک پہاڑی کا نام ہے" اگر پہلا شعر زمانہ میں موجود ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ زمانہ میں پوری نظم شائع ہوئی تھی۔ مرتبِ سرود نے زمانہ کا پرچہ نہیں دیکھا ہوگا۔ انھوں نے محض آٹھ منسوخ اشعار دیے ہیں جب کہ جلیل قدوائی نے نو۔ اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ محذوف اشعار کی تعداد دس ہے۔

۱ بیاضِ جلیل: تربن۔ سہوِ کتابت۔ رزاق اور بانگ: سربن

۲ بیاضِ جلیل۔ سوار توسِ بر۔ رزاق اور بانگ: سوارِ توسنِ ابر

۳ بیاضِ جلیل: ہوا میں۔ سرود و باقیات: ہوا سے

ترانۂ ہندی

یہ نظم سب سے پہلے شرر کے رسالہ اتحاد بابت ۱۶ر اگست ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی لیکن زمانہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں جو اس کا متن ہے وہ اتحاد کے متن سے فرسودہ تر ہے۔ زمانہ میں تیرا شعر یہ ہے۔

پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

حاشیے میں اس کے پہلے مصرع کو یوں لکھا ہے

ن ــہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

معلوم ہوتا ہے حاشیے کا مصرع اصلاح شدہ ہے۔ یہ متن بعد کو ایڈیٹر کو بھیجا ہوگا۔ اس نے

اسے حاشیے میں لکھ دیا ہے۔ بعد میں اس شعر کو نمبر ۶ پر رکھ دیا گیا۔ شاید ایک وجہ یہ ہو کہ پہلے شعر میں "آب رودِ گنگا" کا ذکر آیا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق ہندو مذہب سے ہے اس لیے اس کے فوراً بعد "مذہب نہیں سکھاتا" والا شعر رکھ دیا گیا۔ زمانہ اور اتحاد کے بعد وہ متن آتا ہے جو آج کل اقبال نمبر ۱۹۷۷ء میں بخطِ اقبال چھپا ہے اور جس پہ تاریخ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء درج ہے۔ چوتھا متن مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء کا ہے۔ پانچواں بانگِ درا کا۔ مخزن اور بانگ کے متن میں صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں مخزن میں "وہ دن ہے یاد" ہے جب کہ بانگ میں "وہ دن ہیں یاد" ہے۔ یہ نظم رسالہ اصلاحِ سخن لاہور ستمبر ۱۹۰۷ء میں بھی شائع ہوئی لیکن اس کا متن نہ مل سکا۔ بیاض عماد میں اسے مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء سے نقل کیا ہے۔ ذیل میں اقبال کے خطی متن کو "آج کل" کہہ کر ظاہر کیا ہے۔

۱ے زمانہ، اتحاد، رزاق: وہ آج کل، مخزن، بیاض، بانگ: یہ

۲ے اتحاد: سمجھیں۔ زمانہ، آج کل، مخزن، بیاض، بانگ: سمجھو

۳ے صرف رزاق: وہیں ہیں ہم بھی۔ بقیہ سب: وہیں ہیں بھی

۴ے زمانہ، آج کل، بیاض: اس کے۔ بقیہ سب: اس کی

۵ے بیاض: ندیا سہوِ کتابت۔ بقیہ سب: ندیاں

۶ے صرف بانگ: ہیں۔ بقیہ سب: ہے

۷ے زمانہ میں یہ شعر تیسرے نمبر پر ہے۔ مصرعِ اولیٰ ہے۔ ع پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا
بقیہ سب میں مطابقِ متن

۸ے زمانہ، اتحاد، آج کل: ع صدیوں سے آسماں ہے نامہرباں ہمارا۔ بقیہ سب: مطابقِ متن

۹ے صرف اتحاد: اپنا کوئی محرم۔ بقیہ سب مع زمانہ: کوئی محرم اپنا

۱۰ے زمانہ، اتحاد، آج کل: ہے ہیں۔ بقیہ سب: کیا کسی

محمد عمر (نور الٰہی) نے لکھا ہے کہ اقبال اتحاد کے متن پر ناراض ہوئے تھے کہ اس کی غلطیوں کے سبب حسرت موہانی نے ان پر اعتراض کیے لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ بعینہٖ اغلاط زمانہ اور خطی متن میں بھی ہیں تو اقبال کی ناراضی بے محل معلوم ہوتی ہے۔

غزل

ع انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں

یہ غزل سب سے پہلے افسانہ/دکن ریویو جلد ۲ نمبر ۸، ۱۹۰۴ء ص ۲۴ پر شائع ہوئی۔ واضح ہو کہ اس زمانے میں رسالہ افسانہ اور دکن ریویو ایک دوسرے میں ضم تھے۔ یہ غزل رزاق، بیاض کلام اور نوادر میں بھی ملتی ہے۔ اصلاً اس میں ۲۷ شعر تھے۔ ان میں سے نو منسوخ ہوئے اور آٹھ بانگ میں لیے گئے۔ رزاق، بیاض اور نوادر میں جملہ ۱۷ شعر ہیں۔ قلمی کلام میں محض دس ہیں یعنی ۱، ۳ تا ۹، ۱۵، ۱۷۔ رخت، سرود اور باقیات سوم میں محض نو منسوخ اشعار ہیں۔

۱ے کلام: رہے پھولا پھلا بقیہ سب: پھلا پھولا رہے

۲ے رزاق کے متن میں 'میرے' چھپا ہے۔ صحت نامے میں 'اپنے' بنایا ہے۔
بیاض، رخت اور نوادر: میرے۔ سرود، باقیات: اپنے۔ کلام: بندے
لفظ 'بندے' پنجابی کا عام روزمرّہ ہے جو اس جگہ بالکل برجستہ ہے۔

۳ے نوادر: پوچھو 'نہ' محذوف ہے جو سہوِ کتابت ہے

۴ے رزاق، بیاض: کہ اک کلام، بانگ، نوادر: مرے

بلال

یہ نظم مخزن ستمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ رزاق، بیاض اور کلام میں نقشِ اول ملتا ہے، بانگ میں لیتے وقت تین شعر حذف کیے گئے۔ رخت، سرود اور باقیات سوم میں اس کے محض تین منسوخ شعر دیے ہیں۔ نوادر میں ص ۳۰ پر آخری منسوخ شعر، نمازِ عشق... متفرقات کے ذیل میں دیا ہے

۱ے قلمی کلام: وہ آستاں نہ چھوٹا تجھے ایک دم کے لیے۔ مصرع غیر موزوں۔ سہوِ کتابت

۲ے منسوخ متن: مثلِ سلیماں۔ بانگ: صورت سلماں

۳ے مخزن، بیاض اور رزاق میں یہ شعر مثنوی کے ایک بند کے آخر میں ٹیپ کا شعر تھا۔ بانگ میں اُسے ٹیپ کا نہ رکھ کر بیچ کا شعر بنا دیا گیا۔ مثنوی اصلاً چار بندوں میں تقسیم کی گئی تھی

بعد میں دوسرے اور تیسرے بند کو یک جا ضم کرکے ایک بند کم کر دیا گیا۔

سرگزشتِ آدم

یہ نظم جو اصلاً غزل تھی مخزن ستمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کا مکمل ترین یعنی ۲۸ اشعار کا نسخہ بیاض ص ۴۷، ۳۰ و کلام ص ۵۶، ۵۵ پر ملتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں کلام میں اشعار ۵ تا ۱۸ مکرر ص ۱۱۹، ۱۱۸ پر نقل کر دیے گئے ہیں لیکن ان ۱۴ شعروں کا متن دونوں جگہ یکساں ہے۔ یہ کسی عنوان کے بغیر نیچرل شاعری مرتبہ صفدر مرزا پوری میں بھی شامل ہے۔ رزاق اور نوادر میں ۲۷ اشعار میں ۲۷ اشعار ہیں شعر نمبر ۸ نہیں دیا۔ باقیات اور رخت میں دس منسوخ اشعار دیے ہیں۔ سرود میں بھی صرف منسوخ اشعار دیے ہیں اور ان کی تعداد بھی دس ہے لیکن ان میں سہواً ایک متداول شعر یعنی ہمارے متن کا ساتواں شعر شامل کر لیا گیا ہے اور آٹھواں شعر جو منسوخ ہے شامل نہیں کیا گیا۔ اس طرح آٹھواں شعر صرف بیاض، کلام اور رخت میں ملتا ہے۔

۱ے سرود، باقیات: کے رزاق، کلام، رخت: میں

۲ے رزاق کے متن میں "نہیں کہیں" چھپا ہے لیکن صحت نامے میں "کہیں نہیں" بنا دیا ہے۔ رخت و نوادر: نہیں کہیں۔ بیاض، کلام، سرود، باقیات: کہیں نہیں۔

۳ے سرود و باقیات: کہیں نہیں۔ رزاق، بیاض، کلام، رخت: کہیں کہیں

غزل

ع جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں

یہ غزل احمد دین، رزاق، بیاض اور کلام میں مکمل صورت میں ملتی ہے۔ پہلے کس رسالے میں شائع ہوئی اس کا علم نہیں۔ تین اشعار قلم زد کر کے بقیہ کو بانگ میں لیا گیا۔ تینوں منسوخ شعر رخت، سرود، نوادر اور باقیات سوم میں ملتے ہیں۔ بیاض میں اس غزل کے تین اشعار ۱۰، ۱۱، ۱۲ ص ۴۳ پر لکھ کر کاٹ ڈالے ہیں۔ ۲۱ شعر کی پوری غزل ص ۸۶-۸۵ پر ہے۔

۱ے متروک متن، رزاق، بیاض، قلمی کلام میں: جنھیں ڈھونڈا تھا میں نے

کا آخری بند مع منسوخ شعر کے دوبارہ نقل کر دیا ہے۔ بانگ میں لیتے وقت اس کے دو شعر منسوخ کیے گیے۔ سرود، باقیات اور تبرکاتِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج حیدر آباد، ۱۹۳۹ء میں محض دو منسوخ شعر ہیں۔

لے باقیات: دشمن میں، سہوِ کتابت

ٹے کلام: کشش سے جو کبھی گھبراتا۔ بانگ: مطابقِ متن

سے احمدین، رزاق، بیاض، کلام: اس شعر کی ردیف 'ہو کر' ہے۔ بانگ میں ردیف 'بن کر' بنا دی گئی۔

ٹے بیاض میں پہلے 'کے' لکھا تھا۔ اُسے کاٹ کر اس کے روپر 'کی' لکھا ہے۔ کلام، بانگ: کے

ھے کلام ص ۴۹: کیونکر اس بیوی۔ کلام ص ۱۰۰، بیاض، بانگ: کیوں نہ اس بیوی

لے کلام ص ۴۹: دل سے مانندِ مئے تند ٹھپک (کذا) ہی جاؤں۔ کلام ص ۱۰۱، بیاض: دل سے مانندِ مئے تند چھلک ہی جاؤں۔ بانگ: مطابقِ متن

غزل

ع سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں

یہ غزل سب سے پہلے مخزن بابت دسمبر ۱۹۰۴ء میں چھپی۔ وہیں سے بیاض میں نقل کی گئی۔ باقیات ص ۴۵۳ پر اس کے محذوف اشعار رسالہ زمانہ، نومبر ۱۹۱۵ء سے لیے ہیں۔ رسالہ صوفی، پنڈی بہاء الدین، بابت ستمبر ۱۹۱۹ء میں بھی یہ نظم شائع ہوئی اور میری نظر سے گزر چکی ہے۔ مخزن میں لیتے وقت اس کے آٹھ شعر منسوخ کیے گئے اور محض چھے شعر منتخب ہوئے، بیاض صوفی، رزاق اور نوادر میں پوری غزل ہے۔ رخت، سرود اور باقیات میں محض آٹھ منسوخ شعر دیے ہیں۔ نوادر میں یہ رزاق سے نقل کی گئی ہے۔

لے رزاق میں متن میں 'اچھا کیا' چھپا ہے۔ صحت نامے میں اسے 'اچھی کہی' کر دیا ہے۔ بیاض، صوفی: اچھا کیا۔ نوادر: اچھا کہا۔ بانگ: مطابقِ متن

ٹے بیاض: صدف، بانگ: خزف

۳ باقیات: ہوگیا بیاض، رزاق، رخت، نوادر: کھوگیا
۴ باقیات: صبح بیاض، رزاق، رخت، نوادر: روز
۵ رخت، باقیات، سرود: یہ بیاض، رزاق، نوادر، صوفی: یہ
۶ رزاق کے متن میں 'جاتا ہے' چھپا ہے۔ صحت نامے میں اسے 'جانتا ہوں' بنایا ہے۔ نوادر: جانتا ہے۔ بیاض، صوفی، رخت، سرود، باقیات: جانتا ہوں۔
۷ سرود، باقیات: پرانے بقیہ سب: پرانی۔

ہندوستانی بچوں کا گیت

یہ نظم اوّل مخزن فروری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت اس کا عنوان 'میرا وطن' تھا۔ یہ نظم مخزن کے علاوہ احمد دین اور رزاق میں ہے۔ بانگ میں لیتے وقت اس کا آخری بند منسوخ کر دیا گیا۔ باقیات طبع سوم میں صرف یہ بند ہے۔ سرود ص ۱۲۴ کے مطابق مخزن کے متن کے تیسرے بند کے پہلے دو مصرعے نقش ثانی میں آگے پیچھے کر دیئے گئے۔

۱ مخزن (بحوالہ سرود ص ۱۲۴) اور رزاق: نے۔ بقیہ: تے
۲ باقیات: زمیں۔ بقیہ سب: چمن

نیا شوالہ

یہ نظم سب سے پہلے مخزن بابت مارچ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ جہاں اس میں ۱۸ شعر تھے، ہمارے متن کا آخری شعر نہ تھا۔ شاہد سخن جلد ۱، نمبر ۲ بابت دسمبر ۱۹۱۳ء حیدرآباد میں کسی محمد عبداللہ عطا ساکن چرکھاری سنٹرل انڈیا نے یہ نظم اپنے نام سے شائع کر دی۔ قدیم متن رزاق، احمد دین، بیاض اور کلام میں ملتا ہے۔ بانگ میں لیتے وقت اس کے دس شعر حذف کر دیے گئے اور ایک شعر (ہمارے متن کا آخری) کا اضافہ کیا گیا۔ نوادر میں اس نظم کو مخزن سے لینے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس میں ہمارے متن کا

چوتھا شعر چھوڑ دیا ہے اور بانگ میں شامل شدہ آخری شعر کو لے لیا ہے۔ نوادر میں ترکیب بند کے آخر میں ٹیپ کے دو شعر دیے ہیں ظاہر ہے مخزن میں ٹیپ کے دو شعر نہیں ہو سکتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ مخزن کا ٹیپ کا شعر خارج کر کے بانگ میں ایک نئی ٹیپ شامل کی گئی۔ رخت، سرود اور باقیات سوم میں صرف منسوخ اشعار دیے ہیں۔

۱ھ رزاق: بیاض: صنم کدے۔ بقیہ سب مع شاہد سخن اور بانگ: صنم کدوں

۲ھ منسوخ متن مخزن، شاہد سخن، احمد دین، بیاض، کلام، رزاق: آل کے غیریت کے پردوں کو پھر ہٹا دیں۔ بانگ: مطابق متن

۳ھ منسوخ متن: جی۔ بانگ اور نوادر: دل

۴ھ نوادر: اسے۔ بقیہ سب: جسے

۵ھ نوادر: جیب موہنی ہو اس کی۔ بقیہ سب: مطابقِ متن

۶ھ رزاق، بیاض، رخت: آوازۂ اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں۔
سرود اور باقیات سوم: آوازۂ اذاں کو ناقوس میں ملا دیں۔
احمد دین، کلام، شاہدِ سخن، نوادر: مطابقِ متن۔

۷ھ رزاق میں اوّل 'سے' لکھا تھا۔ صحت نامے میں 'میں' بنا دیا: بیاض: سے کلام، احمد دین، نوادر، سرود، باقیات: میں

داغ

یہ نظم سب سے پہلے مخزن اپریل ۱۹۰۵ء یادگارِ داغ نمبر میں شائع ہوئی۔

نقشِ اوّل رزاق، بیاض اور قلمی کلام میں ملتا ہے لیکن بندوں کی تقسیم میں فرق ہے۔ رزاق میں چھے بند ہیں۔ کلام اور بیاض میں رزاق کے دوسرے تیسرے بند کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے اور اسی طرح رزاق کے پانچویں چھٹے بند کو ملا دیا ہے۔ اس طرح رزاق میں کل چار بند ہیں۔ بانگ میں اس نظم کو لیتے وقت کئی تبدیلیاں کی گئیں۔ بیاض، رزاق کے تیسرے بند کے چوتھے شعر، بلبلِ دہلی .... کو بانگ کے پہلے بند کا چوتھا شعر کر دیا۔ نقشِ اوّل کے چار

اشعار منسوخ کر دیے گئے ۔ ہمارے متن کے آخری دو بند بیاض اور کلام میں ایک ہی بند ہیں۔ رزاق میں یہ دو بند ہیں لیکن وہاں ہمارے متن کے پانچویں بند کا شعر 'تھی نہ شاید....'، ٹیپ کا شعر ہے اور ہمارے متن کا ٹیپ کا شعر 'اٹھ گئے ساقی ... ' رزاق کے آخری بند کا پہلا شعر ہے۔

سرود میں اس نظم کے محض منسوخ اشعار دیے ہیں ۔ رخت طبع دوم میں ص ۹، ۱۰ پر پانچ منسوخ اشعار دیے ہیں حالانکہ ان کا شعر 'بلبلِ دہلی نے باندھا... ' منسوخ نہیں ہوا ۔ اپنی جگہ بدل کر بانگ کے پہلے بند میں آگیا ۔ رخت میں ص ۱۶۰ پر بعض مصرعوں کے نقشِ اوّل دیے ہیں ۔

اقبال نے بانگِ درا طبعِ اوّل کے بعد طبعِ ثانی میں بعض اشعار اور مصرعوں میں خفیف سی ترمیم و اصلاح کی ۔ تیسرے ایڈیشن میں سہواً کاتب کو پہلا ایڈیشن دے دیا گیا جس کی وجہ سے وہ طبعِ دوم کی اصلاحوں سے محروم رہ گیا ۔ میرے سامنے بانگ کا دوسرا اور تیسرا ایڈیشن ہے ۔ میں دوسرے ایڈیشن کو اقبال کا آخری متن مان کر اپنے متن میں دے رہا ہوں ۔ تیسرے ایڈیشن کے متن کو پہلے ایڈیشن کی نقل مان کر منسوخ قرار دیا جائے گا ۔

۱ ؎ یہ شعر ابتدائی متن میں بارھویں نمبر پر تھا ۔ نقشِ ثانی میں چوتھے نمبر پر آگیا ۔

۲ ؎ رزاق کے متن میں 'یہاں' نہ ہے ۔ صحت نامے میں اسے 'نہاں' کر دیا ہے ۔
بیاض : یہاں ۔ کلام اور بانگ : نہاں

۳ ؎ منسوخ متن، بیاض، کلام، رزاق، بانگ طبعِ اوّل وسوم : یعنی یہ لیلیٰ
بانگ طبعِ دوم : لیلیِ معنی

۴ ؎ قلمی کلام : اپنی لبقیہ سب : اپنے

۵ ؎ منسوخ متن رزاق، بیاض کلام، بانگ اوّل وسوم : آہ اے بیت الحرام مذہبِ اہلِ سخن، بانگ دوم و سرود : اے جہاں آباد اے سرمایۂ بزمِ سخن

۶ ؎ منسوخ متن، رزاق، بیاض، کلام، بانگ اوّل وسوم : یعنی خالی ۔ بانگ دوم،

آہ خالی۔ عربی لفظ 'یعنی' کی آخری ی دبانے کے سقم کو اس مصرع میں نیز 'یعنی یہ لیلی یہاں ۔۔۔' میں دور کرنے کے لیے 'یعنی' کا لفظ بدل دیا۔ ؁ بیاض: خالی سہوِ کتابت

؁ قلمی کلام: کا خون۔ بقیہ سب: کو خون

غزل

ع مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے

اس غزل کا نقشِ اول مخزن مئی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ بیاض اور کلام میں پورے چودہ شعر ملتے ہیں۔ رزاق کے یہاں ابتدائی ۱۳ ہیں مقطع نہیں۔ بانگ میں دو شعر خارج کرکے ۱۲ شامل کیے گئے۔ رخت، سرود اور باقیات سوم میں یہی دونوں منسوخ شعر دیے ہیں۔

؁ قلمی کلام: نجات۔ رزاق، بیاض، بانگ: مراد

؁ رزاق، بیاض، قلمی کلام: زخم بانگ: درد

؁ رزاق، بیاض، کلام: او بے خبر۔ بانگ: اے بے خبر

؁ بیاض: پاسبانِ عشق۔ بقیہ سب: پاسبانِ عقل

ایک پرندہ اور جگنو

یہ نظم مخزن جولائی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ رزاق، بیاض، کلام اور بانگ میں ملتی ہے۔

؁ رزاق، بیاض، کلام: مشہور بانگ: مستور

؁ قلمی کلام: ہر، سہوِ کتابت۔ بیاض، رزاق اور بانگ: سے

بچہ اور شمع

یہ نظم مخزن ستمبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ بیاض کلام، رزاق اور بانگ میں ملتی ہے

بانگ میں لیتے وقت اس کے محض ایک مصرع میں ترمیم کی گئی۔ قلمی کلام میں بندوں کی تقسیم نہیں۔ بیاض میں یہ مخزن سے نقل کی گئی ہے۔

ح۱ قلمی کلام: 'ہے' سہواً حذف

ح۲ بیاض، رزاق: شعلے۔ قلمی کلام: شعلہ۔ بانگ: شعلوں

ح۳ قلمی کلام: مرے۔ بیاض، رزاق اور بانگ: مری

ح۴ قلمی کلام: اور اسے، سہوِ کتابت۔ رزاق، بیاض، بانگ: آہ اس

ح۵ قلمی کلام: دیکھتی ہے آنکھ یاں ہر قطرہ میں طوفانِ حسن۔ بیاض، رزاق، دیکھتی ہے آنکھ ہر قطرے میں یاں طوفانِ حسن۔ بانگ مطابق متن

ح۶ قلمی کلام: یہ نالاں ہے کیوں۔ رزاق، بیاض، بانگ، کیوں نالاں ہے یہ

ح۷ قلمی کلام: ماہیِ نایاب۔ سہوِ کتابت۔ رزاق، بیاض، بانگ: ماہیِ بے آب

کنارِ راوی

یہ نظم مخزن نومبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ نقشِ اول رزاق، احمد دین، کلام اور بیاض میں ملتا ہے۔ بانگ میں شائع کرتے وقت دو شعر خارج کیے گئے۔ نقشِ اول میں چار بند تھے۔ نقشِ ثانی میں تین بند رہ گئے۔ ہمارے متن کا ساتواں شعر 'فسانہ ستم...'، نقشِ اول کے دوسرے بند کی ٹیپ تھا اور شعر نمبر ۸ تا ۱۰ مل کر تیسرا بند تھے جس میں شعر ۹ بند کے اندر کا شعر تھا اور شعر ۱۰ ٹیپ کا تھا۔ شعر ۱۰ کو خارج کر کے شعر ۹ کو ٹیپ کی جگہ لکھ دیا گیا۔ سرود اور باقیات سوم میں محض دو منسوخ شعر دیے ہیں۔ رخت میں محض ایک منسوخ شعر 'نمازِ شام کی...'، ص ۱۷۱ پر دیا ہے۔

ح۱ بیاض: نود آموز۔ سہوِ کتابت۔ بقیہ سب: نوآموز

التجائے مسافر

یہ نظم سب سے پہلے مخزن اکتوبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ وہاں سے لے کر بیاض

میں نیز عبداللطیف اعظمی نے اپنی کتاب دانائے راز میں ص ۳۴ تا ۳۷ پر درج کی ہے۔ دونوں میں ۳۶ شعر ہیں یہ سب قلمی کلام میں بھی ہیں۔ رزاق نے اس نظم کو مقدمے میں شامل کیا ہے لیکن انھوں نے صرف ۲۰ شعر دیے ہیں۔ احمد دین نے اس نظم کے صرف نو شعر دیے ہیں جن میں دو محذوف شعر شامل ہیں۔ جب یہ نظم بانگ میں شامل کی گئی تو اس کے ۱۵ شعر منسوخ کیے اور محض ۲۱ شعر لیے۔ باقیات میں بھی منسوخ شعر دیے بسرد ہیں صرف ۵ منسوخ شعر دیے ہیں باقیات میں ۱۴ شعر ہیں، شعر نمبر ۱۲ رہ گیا ہے۔ رخت میں نہ معلوم کیوں ص ۱۶۱ پر محض دو اشعار کو محذوف مان کر درج کیا ہے۔ وہ ہیں شعر ۱۲، ۲۰۔

۱؎ مخزن میں یہ شعر چھٹے نمبر پر یعنی 'خروشِ مے کدہ۔ ۔ ۔' والے شعر کے بعد تھا۔

۲؎ باقیات: عشق۔ بقیہ سب: شوق

۳؎ رزاق: فقر۔ بقیہ سب: خضر

۴؎ بیاض: نگہت۔ بقیہ سب: نکہت۔ کاتبِ بیاض ہر جگہ نگہت، لکھتا ہے۔

۵؎ بیاض، کلام، رزاق: کہ۔ باقیات اور نوادر: کے

۶؎ بیاض: دینا سہوِ کتابت۔ بقیہ سب: دیتا

۷؎ قلمی کلام: ہوں، سہوِ کتابت

قطعہ

قطرے کے منھ سے نام جو تیرا نکل گیا

۱؎ ہمارے متن میں یہ شعر روزگار سے لے کر دیا ہے۔ اقبال کے ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کے خط بہ نام انشا اللہ خاں ایڈیٹر وطن میں یہ شعر یوں ہے:

اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرو　　خورشید بھی گیا تو اُدھر سر کے بل گیا

سرگزشتِ اقبال از عبدالسلام خورشید میں بھی یہی متن درج ہے۔ ہو سکتا ہے اصلاً اقبال نے محض یہ ایک شعر کہا ہو، بعد میں قطعہ بناتے وقت اس میں ترمیم کر دی ہو۔ مولفِ روزگار نے قطعے کو بیاضِ اعجاز سے لیا ہوگا۔

غزل

ع مثالِ پرتو مے طوفِ جام کرتے ہیں

یہ غزل ابتداً دو جگہ شائع ہوئی اوّل دکن ریویو حیدرآباد ستمبر ۱۹۰۵ء میں۔ اس میں غالباً پندرہ شعر ہیں، چوتھا شعر شامل نہیں۔ اس میں تماشا کی الف گرتی ہے۔ عربی لفظ کی آخری الف گرانا معیوب ہے۔ دوسرے مصرع میں بھونڈی قسم کی رعایتِ لفظی ہے۔ شاید اسی لیے حذف کر دیا ہوگا۔ اقبال نے لندن سے ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو اپنے دوست مولوی انشاء اللہ خاں مدیرِ وطن کو ایک طویل خط میں سفر کے حالات لکھے جس میں یہ غزل بھی شامل ہے۔ یہ خط وطن میں ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء کو شائع ہوا۔ وہاں بھی ۱۵ شعر ہیں یعنی ہمارے متن کا پندرھواں شعر 'وزیرِ نظام' والا حذف ہے۔ دکن ریویو کی غزل میں یہ شعر شامل کیا۔ وطن کے ایڈیٹر کو خط لکھا تو یہ شعر حذف کر دیا۔ شاید وزیر کی مدح سرائی پر حجاب آیا ہو۔

بانگِ درا میں اس غزل کے چھے شعر محذوف ہوئے۔ رزاق کے مقدمے میں صرف چھے شعر یعنی نمبر ۱، ۲، ۱۱، ۹، ۱۲، ۱۴ ہیں قلمی کلام میں ۱۰ شعر ہیں یعنی نمبر ۳، ۴، ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۵ غیر حاضر ہیں۔ رختِ طبعِ دوم میں ص ۱۱۲ پر محض ایک شعر نمبر ۲ ہے۔ سرود میں پانچ منسوخ شعر ہیں شعر نمبر ۴ شامل نہیں۔ باقیات سوم میں ۶ منسوخ شعر ہیں۔

۱ھ خطوطِ اقبال ص ۱۰۰: ہجر سہوِ کتابت

۲ھ سرود و باقیات: جہاں میں۔ خطوطِ اقبال نیز قلمی کلام: جہاں کی

۳ھ قلمی کلام اور خطوطِ اقبال: جی سرود: دل

۴ھ قلمی کلام، رخت اور خطوطِ اقبال: شرار۔ سرود و باقیات: شرر

۵ھ باقیاتِ طبعِ سوم: ہستی۔ قلمی کلام: بستی۔ خطوطِ اقبال و سرود: بستی

محبت

یہ نظم مخزن جنوری ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ اسے صفدر مرزاپوری نے اپنے مجموعے نیچرل شاعری میں ص ۲۶-۲۹ پر دیا ہے۔ ان کے علاوہ رزاق، بیاض، کلام اور بانگ میں

ملتی ہے۔

۱؎ بیاض : لباسِ محو۔ سہوِ کتابت۔ بقیہ سب : لباسِ نو

۲؎ رزاق، بیاض، کلام : ابھی واقف نہ تھا۔ بانگ : نہ تھا واقف ابھی

۳؎ منسوخ متن : یہ۔ بانگ : میں

۴؎ رزاق، بیاض، کلام : لوح۔ بانگ : روح

۵؎ بیاض، کلام : اک۔ رزاق، بانگ : اس

۶؎ کلام، مانگی رزاق، بیاض، بانگ : پائی

۷؎ بیاض، کلام : گرہ کھولی ہنر نے گویا اس کے، کارِ عالم سے۔ رزاق : گرہ کھولی ہنر نے اس کی گویا کارِ عالم سے۔ بانگ : گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے

پیام

(منسوخ متن، پیغامِ راز)

یہ نظم مخزن فروری ۱۹۰۶ء میں پیغامِ راز کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس وقت اس میں ۱۲ شعر تھے۔ بانگ میں لیتے وقت اس کے پانچ شعر خارج کر دیے گئے۔ بقیہ سات میں اصلاح کی گئی اور نظم کو 'پیام' کے عنوان سے شامل کیا۔ قدیم متن مخزن، رزاق، احمد دین، بیاض، کلام، رخت، نوادر اور تبرکات میں ملتا ہے۔ کلام میں ص ۷۴ پر منسوخ متن پیامِ راز ہے اور دوسرے حصے کے ص ۵۵ پر بانگِ درا کا متن 'پیام'۔ بیاض میں اسے مخزن سے نقل کیا ہے۔ شروع میں پیغامِ راز عنوان دیا ہے۔ ادارتی نوٹ کے بعد 'غزل' عنوان دیا ہے۔ نوادر اور تبرکات دونوں میں اسے رزاق سے نقل کیا ہے اور غزل قرار دیا ہے۔

روزگار میں صرف چار منسوخ اشعار ہیں، شعر نمبر، نہیں۔ باقیات میں بھی روزگار کی تقلید میں یہی چار منسوخ اشعار دیے ہیں۔ ذیل میں منسوخ متن پیغامِ راز کے اختلافاتِ نسخ درج کیے جاتے ہیں

۱؎ بیاض، کلام، رخت : خانہ سوز۔ رزاق، احمد دین، تبرکات، نوادر : خانہ ساز

ـــــہ۲ کلام، بیاض، رزاق، احمدین، تبرکات : فراغ۔ نوادر : فراق ۔ رخت : نیاز
ـــــہ۳ کلام : مانندِ شمع ملتا نہ نور کا لباس اسے ۔ سہوِ کتابت
ـــــہ۴ روزگار، باقیات : بکتی جہاں میں نہیں ۔ بقیہ سب : مطابقِ متن
ـــــہ۵ باقیات : اس کا ۔ بقیہ سب : اس کی
ـــــہ۶ تبرکات : پوجا کر ۔ بقیہ سب : پوجا کو
ـــــہ۷ تبرکات : پرگل ۔ سہوِ کتابت ۔ بقیہ سب سیرِ گُل
ـــــہ۸ رخت : تجھے خبر نہیں ۔ بقیہ سب : تجھے خبر بھی ہے

غزل ع زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں

اس غزل کے چار شعر بانگِ درا میں ملتے ہیں۔ قلمی کلام کے دوسرے حصے میں یہ دو جگہ ہے۔ ص ۲۹ پر رازِ ہستی کے عنوان سے پانچ شعر ہیں جن میں شعر ۲ بھی ہے۔ یہ کلام کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ کلام میں حصۂ دوم ص ۳۰ پر اس غزل کے چار اشعار مکرر درج ہے جہاں یہ بانگ کے مطابق ہیں۔ باقیاتِ طبع سوم ص ۳۰۲ پر شعر ۲ کو اقبال نامہ حصہ دوم ص ۸۱ کے حوالے سے سہواً منسوخ سمجھ کر درج کر دیا ہے حالانکہ یہ بانگِ درا ص ۱۴۳ پر موجود ہے۔

ـــــہ۱ کلام ص ۲۹ : انسان کی دم ۔ کلام ص ۳۰ نیز بانگِ درا : انساں کی اک دم
ـــــہ۲ کلام ص ۳۰ : یہ کلام ص ۲۹ نیز بانگِ درا : تو

غزل

ع زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا

یہ غزل اصلاً مخزن اپریل ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ پرانا متن رزاق، بیاض اور کلام میں موجود ہے جہاں ترتیبِ اشعار یکساں ہے۔ بانگ میں لیتے وقت دو شعر خارج کیے گئے اور ترتیبِ اشعار بدل گئی۔ ہمارے متن کی ترتیب بانگ کے مطابق ہے۔ قدیم متن کی ترتیب

یوں تھی :

۱ تا ۴، ۶، ۷، ۵۰، ۸۰، ۱۰۰ تا ۱۴، ۹، ۱۵۰

سرود، نوادر، رخت، باقیات میں محض دو منسوخ اشعار دیے ہیں۔

سے ۱ رزاق، بیاض، کلام : اپنی۔ بانگ : میری

سے ۲ رزاق، بیاض : کوئی بقیہ سب : کوئے

سے ۳ رزاق، بیاض، کلام : دیکھے بانگ : سمجھے

سے ۴ بیاض : 'تو' محذوف۔ سہو کتابت

سے ۵ کلام : کا۔ بقیہ سب : کے

سے ۶ کلام : میرے۔ بقیہ سب : میری

غزل

یہ چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں

یہ غزل سب سے پہلے مخزن دسمبر ۱۹۰۶ء میں چھپی بیاض اور رزاق میں اس کے پورے ۱۲ شعر ہیں لیکن ترتیب بانگ سے مختلف ہے۔ قلمی کلام میں یہ دو حصوں میں ہے۔ ص ۱۳۷ پر رموزِ توحید کے عنوان سے ہمارے متن کے چھ شعر ۱، ۲، ۹، ۸، ۱۱، ۳ ہیں۔ ان کے بعد ایک فارسی اور ایک اُردو غزل ہے۔ پھر زیر بحث غزل کے بقیہ چھ شعر ص ۱۲۸ پر ہیں۔ قلمی کلام کی ترتیبِ اشعار رزاق سے مختلف ہے۔ میں نے متداول اشعار کی ترتیب بانگ کے مطابق رکھی ہے۔ نوادر میں رزاق سے لے کر اس غزل کے ۱۱ شعر دیے ہیں۔ پتا نہیں کیوں وہ مقطع لکھنا بھول گئے۔ رخت، سرود اور باقیات سوم میں صرف چار منسوخ شعر ہیں۔

سے ۱ قلمی کلام : قدرت۔ بقیہ سب : صورت

سے ۲ قلمی کلام اور سرود : نکلا۔ بقیہ سب : نکلی

قطرۂ اشک

(منسوخ)

یہ نظم صرف قلمی کلام میں ملتی ہے۔ مرتب نے کس رسالے یا مجموعے سے نقل کی، معلوم نہیں۔ اس کے متن میں کاتب نے تین غلطیاں کی تھیں جنھیں ہمارے متن میں درست کر دیا گیا ہے۔

سلہ کتابت میں 'مہرِ جاں فروز' لکھا ہے۔ وزن کا تقاضا 'مہرِ جہاں فروز' کا ہے جو معنوی اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

سلہ اڑھ کر' لکھا ہے۔ صحیح 'اوڑھ کر'

سلہ 'ہنگامہ راز' لکھا ہے۔ 'ہنگامہ ساز' ہونا چاہیے۔

غزل

(منسوخ)

لاکھوں طرح کے لطف ہیں اس اضطراب میں

یہ غزل اوّل نشتر بابت دسمبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔ حیرت ہے کہ سرود ص ۲۱۲ پر اس میں سے لے کر صرف تین شعر ۲، ۵، ۶ شائع کیے گئے۔ جب کہ باقیات سوم ص ۴۵۴ پر نشتر ہی سے لے کر پانچ شعر دیے ہیں۔ روزگار ص ۲۸۶ - ۲۸۵ پر اس غزل کے دو بقیہ چار شعر دیے ہیں۔ انھوں نے بیاضِ اعجاز سے لیے ہوں گے۔

سلہ باقیات: جواب۔ روزگار: سوال۔ ظاہر ہے کہ 'جواب' غلط ہے۔

سوامی رام تیرتھ

یہ نظم مخزن جنوری ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ اصلاً اس میں سات اشعار تھے۔ بانگ میں اس کا آخری شعر نہیں لیا گیا۔ پوری نظم رزاق، احمد دین، بیاض اور کلام میں موجود ہے۔ سرود اور رخت میں محض ساتواں منسوخ شعر دیا ہے۔

۱؎ بیاض: نایاب۔ دراصل رزاق کے متن میں نایاب چھپا ہے جسے صحت نامے میں
بے تاب، بنایا ہے۔
۲؎ بانگ: کا بیاض، رزاق: کی۔ قلمی کلام میں پہلے 'کا' لکھا تھا بعد میں اسے 'کی' بنا دیا گیا۔ 'دارو' مونث ہے۔ حیرت ہے کہ بانگ میں اس سے قبل 'کا' لکھا ہے۔
۳؎ قلمی کلام: سے۔ بقیہ سب: ہے ۴؎ رزاق، متن: زنداں۔ صحت نامہ: زندوں

غزل

ع زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا

یہ غزل مخزن مارچ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ بیاض اور سرود ص ۱۵۱ کے مطابق اسے اقبال نے کیمبرج سے بھیجا تھا۔ اصلاً اس میں ۱۸ شعر تھے جو رزاق، بیاض اور احمد دین کے یہاں موجود ہیں۔ بانگ درا میں شامل کرتے وقت ایک شعر کو منسوخ کر دیا گیا جو سرود، نوادر رخت اور باقیات میں موجود ہے۔ نوادر ص ۲۹۷ میں غزل کے ایک اور شعر نمبر ۲ گزر گیا اب ... کو بھی سہواً قلم زد دکھایا گیا ہے لیکن یہ بانگ میں موجود ہے۔ ہمارے متن میں منسوخ شعر کے علاوہ ترتیبِ اشعار بانگ کے مطابق ہے۔ قدیم ترتیب مختلف تھی یعنی رزاق میں ہمارے متن کے نمبروں کے لحاظ سے یہ ترتیب ہے:

۱، ۲، ۴، ۵، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۷، ۳، ۶، ۷، ۸، ۱۲، ۱۴، ۱۶، ۱۸

تقریباً یہی ترتیب بیاض میں ہے۔ بیاض میں اس کے ۱۱ شعر ص ۹۱ پر درج ہیں۔ کونے میں دو نوٹ ہیں۔ ایک کے مطابق معارفِ ملت جلد اوّل میں اس کا عنوان 'مژدہ' ہے۔ دوسرے نوٹ کے مطابق بقیہ اشعار ص ۴۲ پر ہیں۔ ۴۲ پر ان اشعار پر ایک کونے میں عنوان 'نویدِ اقبال' دیا ہے۔

۱؎ رزاق: اک نگہ میں۔ بیاض: ایک نگاہ۔ بانگ: اسے نگاہ
۲؎ رزاق: رہ گزار بانگ: راہگزار۔ وزن کے لحاظ سے رہ گزار صحیح اور راہگزار غلط ہے۔

طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام

(منسوخ متن)

یہ متن احمد دین اور قلمی کلام میں ملتا ہے۔ نوادر میں اس کا ماخذ مخزن ۱۹۰۰ء دیا ہے جو درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس میں کئی اشعار اور مصرعوں کا قدیم متن نہیں بلکہ بانگ کا اصلاح شدہ متن ہے۔ گویا منسوخ اور متداول متن کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ مجھے صمد خاں نے لکھا کہ یہ نظم مخزن جون ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ مرتب نوادر نے محض ۱۹۰۰ء لکھا ہے۔ شمارہ اور مہینہ نہیں دیا۔ قدیم متن میں ۱۲ شعر تھے بانگ میں سات ہیں یعنی پانچ شعروں کو بالکل حذف کر دیا ہے اور جنھیں لیا ہے ان میں بھی بہت کچھ ترمیم کی ہے۔ پانچ منسوخ اشعار باقیات سوم ص ۵۶۵ پر درج ہیں۔ بیاض میں نیز رزاق کے مقدمے میں ص ۱۲۹ پر یہ نظم بانگ کے متن کے مطابق درج ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ متداول متن بانگ سے پہلے کہیں اور شائع ہو چکا تھا ذیل میں صرف منسوخ متن کے اختلافات درج کیے جا رہے ہیں:

ش ۱ باقیات: ہستی مے - احمد دین، قلمی کلام، نوادر: مستورے

ش ۲ قلمی کلام میں 'کا' سہواً حذف

ش ۳ قلمی کلام: یوں تو باقی آتی ہیں محفل ساقیانِ ہند - بقیہ سب: مطابق متن

ش ۴ قلمی کلام میں سہواً 'ہے' حذف

ش ۵ قلمی کلام اور باقیات: ساقی ہے اس کا اور ہی - احمد دین اور نوادر: ساقی ہی اس کا اور ہے -

ش ۶ قلمی کلام اور نوادر: آتی تھی - احمد دین: آتی ہے -

ش ۷ احمد دین: سازِ زندگی کا سوز - قلمی کلام: ہے سازِ زندگی کا سوز

ش ۸ قلمی کلام: اُس محفل - احمد دین: اس محفل

ش ۹ احمد دین طبعِ اوّل، ص ۲۰۳، ۱: منعم - احمد دین طبع دوم، ص ۱۶۱، قلمی کلام، نوادر: مسر

پیش کش به ...!

(منسوخ)

یہ نظم روزگار ص ۳۴۴ تا ۳۴۶ پر اور باقیات ص ۵۲۹ تا ۵۳۰ پر دی ہے۔

سلہ باقیات: سرور۔ روزگار: سرود

وصال

یہ نظم عطیہ بیگم کی انگریزی کتاب اقبال (فروری ۱۹۴۷ء بمبئی) میں اقبال کے خط میں موجود ہے۔ یہ رزاق کے مقدمے میں ص ۱۱۳-۱۱۲ پر بیاض میں نیز بانگ میں ہے۔

سلہ عطیہ کی کتاب: عشق کے کانٹے سے لالے بن گئے چھالے مرے۔ بیاض، رزاق اور بانگ: مطابقِ متن

سلیمیٰ

یہ نظم رسالہ نظام المشائخ بابت رجب ۱۳۲۸ھ (جون جولائی ۱۹۱۰ء) میں 'لامکاں کامکاں' کے عنوان سے شائع ہوئی جہاں سے بیاض میں نقل کی گئی۔ رسالہ صوفی بابت فروری ۱۹۱۵ء میں 'یہ آنکھوں میں ہے حسینہ! تیری کماں اس کا' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ بعد میں یہ نظم رزاق، بیاض، کلام اور بانگ میں ملتی ہے۔ اوّل الذکر تینوں مجموعوں میں اس کا عنوان 'لامکاں کا مکاں' ہے۔ جلیل احمد قدوائی کے مضمون 'اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن' (مشمولہ 'اوراقِ گم گشتہ' مرتبہ رحیم بخش شاہین لاہور ۱۹۷۵ء) میں اس نظم کے اختلافاتِ نسخ دیے ہیں۔ قدوائی کا یہ مضمون اصلاً ہمایوں لاہور بابت مئی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا۔

سلہ رزاق، بیاض، کلام، جلیل: خلوت کدہ بانگ: ظلمت کدہ

سلہ رزاق، بیاض، کلام، جلیل: حسینہ بانگ: سلیمیٰ

کوششِ ناتمام

اس کا متداول متن بیاض، رزاق کے مقدمے اور بانگ میں ہے چھے منسوخ اشعار روزگارِ فقیر اور باقیات میں ہیں۔ روزگارِ فقیر ص ۳۳۴ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اصلاً اس نظم کا عنوان '۔۔۔۔ کے نام تھا'۔ اس میں مزید چھے شعر تھے جو بانگ میں لیتے وقت منسوخ کر دیے گئے۔ پہلے بند کے دونوں متروک اشعار کا مقام معلوم نہیں۔ معنی کے اعتبار سے انھیں بٹھا دیا گیا ہے۔ باقیات طبعِ سوم میں پہلے بند کے دونوں متروک اشعار ص ۳۴۹ پر دیے ہیں۔ دوسرا متروک بند عبداللہ قریشی نے اضافوں میں ص ۵۴۶ پر دیا ہے۔ ظاہر ہے باقیات کا ماخذ روزگار (۲) ہوگا۔ بیاض میں نیز رزاق کے مقدمے میں ص ۱۰۷ پر نظم کے متداول اشعار بانگ کے مطابق دیے ہیں۔

دوسرے منسوخ بند کے آخر میں ٹیپ کا شعر نہیں۔

جلوۂ حسن

یہ نظم بیاض اور بانگ میں باشتراکِ متن ملتی ہے۔ دو منسوخ اشعار روزگار ص ۳۵۵-۳۵۶ پر نیز باقیات سوم ص ۳۵۰ پر ہیں۔ ان کا صحیح مقام معلوم نہیں۔ اندازے سے رکھ دیے ہیں۔ پہلا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے متن کے شعر نمبر ۴ کو خارج کرنے کے بعد اس کی جگہ شعر نمبر ۵ کہا گیا اور متداول کلام میں جگہ دی گئی۔ دوسرا منسوخ شعر فی الحال غیر متعلق سا معلوم ہوتا ہے۔ اسے پہلے بند میں کہیں بھی نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اسے نظم کی ابتدا میں رکھ دیں لیکن روزگار میں یہ شعر دوسرے نمبر پر ہے۔ اسے بیاضِ اعجاز سے لیا گیا ہوگا۔ ممکن ہے اس شعر کے ساتھ کوئی دوسرا بند شروع کرنا چاہا ہو لیکن بعد میں یہ خیال رد کر دیا ہو۔

ایک شام

دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے

یہ نظم بیاض، رزاق اور بانگ میں پائی جاتی ہے۔ بیاض اور رزاق میں بانگ کی نسبت ایک شعر یعنی بانگ کا تیسرا شعر کم ہے۔ بیاض اور رزاق کی ترتیبِ اشعار بھی بانگ سے مختلف ہے جو یوں ہے:

۶، ۲، ۱، ۵، ۳، ۴، ۷

لہ و ۳ لہ رزاق کے متن میں ٹینکر لکھا ہے لیکن صحت نامے میں اسے درست کرکے نیکر بنا دیا ہے۔ مرتبِ بیاض نے رزاق کا غلط نامہ نہیں دیکھا اور دونوں جگہ 'ٹینکر' لکھا ہے۔

۲ہ بیاض، رزاق: صدا فراموش   بانگ: نوا فراموش

۴ہ بیاض، رزاق: فطرت   بانگ: قدرت

۵ہ بیاض، رزاق: خاموش تو بھی   بانگ: تو بھی خموش

تنہائی

اصلاً اس نظم میں سات شعر تھے بانگ میں پانچ لیے گئے۔ یہی بیاض اور کلام میں ہیں۔ بیاض میں یہ نظم ص ۱۵۳ پر اور پھر مکرر ص ۱۷۲ پر لکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے بیاض اور کلام میں یہ اشعار بانگِ درا سے نقل کیے ہیں۔ دو منسوخ شعر سب سے پہلے روزگار ص ۲۵۲ پر اور اس کے بعد باقیات ص ۵۳۰ پر ملتے ہیں۔ ان کی ترتیب کا علم نہیں۔ میں نے معنی پر نظر رکھ کر انھیں نظم میں شامل کر دیا ہے۔

فراق

یہ نظم رزاق، بیاض، کلام اور بانگ میں پائی جاتی ہے۔ رزاق، بیاض اور کلام میں اس کا عنوان کنجِ تنہائی ہے لیکن اس کا قدیم متن بیاض اور رزاق میں ہے۔ قلمی کلام اور بانگ کے متن یکساں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اقبال نے رزاق کے متن میں اصلاح کرکے اسے کسی رسالے میں اسی پرانے نام 'کنجِ تنہائی' کے ساتھ چھپوایا جہاں سے کلام کے

مرتب نے نقل کیا۔ اسی متن کو بانگ میں شامل کرتے وقت اس کا عنوان بھی بدل دیا۔ بیاض، رزاق اور کلام میں اس نظم کو ایک بند کے طور پر لکھا ہے جب کہ بانگ میں دو بند ہیں۔

۱ے بیاض، رزاق : شگفتہ گیت کے چشموں کی۔ کلام اور بانگ : شکستہ گیت میں چشموں کے

۲ے رزاق اور بیاض : فلک ۔ کلام ، بانگ : شفق

۳ے رزاق : ظہور ۔ بیاض ، کلام ، بانگ : جلوس

۴ے بیاض : مرے ۔ بقیہ سب : مری

۵ے رزاق ، بیاض : وہی ۔ کلام ، بانگ : مری

۶ے کلام : اپنے ۔ رزاق ، بیاض ، بانگ : اپنی

غزل

(منسوخ)

یہ چاندنی ہے کہ گردوں سے مے برستی ہے

یہ غزل سب سے پہلے روزگار ص ۲۶۶ پر ملتی ہے، اس کے بعد باقیات ص ۶۰۶ پر۔ ظاہرا روزگار ہی سے نقل کی گئی ہے۔

۱ے باقیات : مٹانے ۔ ظاہرا سہو ذہنی وسہو کتابت روزگار : بنانے

پیامِ عشق

یہ غزل ہے جسے مخزن اکتوبر ۱۹۰۸ء میں پیامِ عشق کے عنوان سے شائع کیا گیا گویا اسے نظم کی ہیت عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انور، عماد، نیچرل شاعری اور بانگِ درا میں بھی اس پر عنوان دیا ہے لیکن رزاق میں اسے غزلیات کے تحت دیا ہے۔ رزاق، انور اور عماد میں اس کا قدیم متن ہے، بانگ میں جدید۔ بانگ میں قدیم متن کے ایک شعر کو منسوخ کر دیا ہے۔ یہ منسوخ شعر رختِ سفر میں ص ۱۱۱ پر دیا ہے۔

عبد القادر کے نام

یہ نظم مخزن دسمبر ۱۹۰۸ء میں اسی عنوان سے چھپی لیکن رزاق اور عاد میں اس کا عنوان پیامِ عمل دیا ہے۔ مخزن میں اس میں ۱۶ شعر تھے جن کی ترتیب ہمارے متن سے مختلف تھی۔

بانگ میں لیتے وقت پانچ شعر خارج کر دیے گئے۔ میں نے اپنے متن میں متداول اشعار بانگ کی ترتیب سے لکھے ہیں۔ تمام اشعار کی ترتیب انور کے مطابق ہے۔ مشفق خواجہ نے احمد دین ص ۴۲۵ پر تین منسوخ اشعار کا نمبر ۶، ۱۱، ۱۲ درج کیا ہے۔ ہم نے بھی اپنے متن میں انھیں انھیں نمبروں پر لکھا ہے۔ بقیہ دو منسوخ اشعار کو رزاق اور قلمی کلام کی مدد سے جگہ دی ہے۔ اب مختلف مجموعوں میں اشعار کی کیفیت یہ ہے۔

قلمی کلام میں ۱۶ شعر ہیں لیکن معلوم نہیں کیوں ان کے بیچ بیچ میں چار مرتبہ خطِ فاصل کھینچ کر پوری غزل کو ذیل کے پانچ ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔

۱ تا ۵ - ۶ تا ۸ - ۹، ۱۰ - ۱۱ تا ۱۳ - ۱۴ تا ۱۶

بیاض میں ۱۱ شعر ہیں۔ پھر ایک نظم ہے۔ اس کے بعد حسب ذیل پانچ اشعار ہیں۔ ۶، ۷، ۱۱، ۱۳، ۱۶، رزاق میں ۱۵ شعر ہیں یعنی ہمارے متن کا شعر ۱۳ نہیں۔ بقیہ اشعار کی ترتیب یوں ہے ۱ تا ۵، ۸، ۱۰، ۹، ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۶، ۷، ۱۱، ۱۶

احمد دین کی طبعِ اوّل میں ۱۳ شعر تھے یعنی ہمارے متن کے ۶، ۱۱، ۱۲ کو چھوڑ کر۔ طبعِ دوم میں بانگِ درا کی نظم درج تھی۔

رخت میں ص ۱۰ پر لکھا ہے کہ نظم کے چار اشعار بانگِ درا میں نہیں ملتے لیکن اگلے صفحے پر انھوں نے چار کے بجائے پانچوں قلم زد اشعار درج کیے ہیں۔ سرودِ رفتہ بار اوّل ص ۱۲۹ اور باقیات ص ۱۵۳ پر پانچوں منسوخ اشعار دیے ہیں۔ نوادر میں ص ۲۹۹ پر چار منسوخ اشعار دیے ہیں شعر ۱۳ نہیں دیا جو رزاق میں بھی غیر حاضر ہے۔

۱ے احمد دین ص ۴۲۵: دخترِ باطل نے جسے۔ بقیہ سب: دفترِ باطل جس نے

۲ے احمد دین ص ۱۶۶، بیاض، کلام: سعدیٰ۔ رزاق اور بانگ: سعدی سہوِ کتابت

۳ے قلمی کلام : کی ، سہوِ کتابت ۔ بقیہ سب : کو

۴ے نوادر : خم ۔ رزاق ، بیاض ، احمد دین ، رخت ، سرود ، باقیات ۔ نم ۔ مشفق خواجہ نے احمد دین کے ص ۴۲۵ پر نوٹ دیا ہے

"ممکن ہے نم سہوِ کتابت ہو اور اصل میں خم ہو"

چونکہ تمام کتابوں میں 'نم' ہے اور معنی کے لحاظ سے غلط نہیں اس لیے فی الحال اسی کو درست ماننا ہوگا۔ ہاں مخزن دسمبر ۱۹۰۸ ہی میں سہوِ کتابت سے 'خم' کا 'نم' چھپ گیا ہو تو بقیہ سب کتابوں میں 'نم' لکھا جانا اسی کی تقلید ہے۔

۵ے رخت : بیدادوں ۔ احمد دین' بیاض ، کلام ، سرود ' باقیات : بے دردوں

۶ے قلمی کلام : سے ۔ بقیہ سب مع بانگ : میں

۷ے،۸ے بیاض' کلام میں دونوں مصرعوں میں سہواً 'داز' لکھا ہے جب کہ بقیہ سب میں مع بانگ کے' دار' ہے ۔ دار سے مصرع غیر موزوں ہو جاتا ہے ۔

صقلیہ

یہ نظم مخزن اگست ۱۹۰۸ء میں جزیرۂ سسلی کے عنوان سے شائع ہوئی ۔ اس کا قدیم متن بیاض اور رزاق میں ہے ۔ معلوم نہیں کیونکر یہ بیاض میں دو بار لکھی گئی ہے ص ۱۰۲ پر اور پھر ص ۱۱۱ کے سلسلے میں ۔ کے ۔ اے ۔ وحید کی انگریزی کتابیات اقبال ص ۶ کے مطابق یہ سدرشن کے مرتبہ گلدستۂ سخن ' لاہور ۱۹۲۲ء میں 'مرثیہ سسلی' کے عنوان سے شامل ہے ۔ وحید ہی کے مطابق یہ 'روحانیات' لاہور میں جزیرۂ سسلی کے نام سے ہے ۔ اس نظم کے بعض اشعار کا قدیم متن سرود' باقیات 'رخت اور جلیل قدوائی کے مضمون' اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن' مشمولہ' ہمایوں لاہور مئی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ۔

۱ے قدیم متن : یہ محل خیمہ تھا ان   بانگ : تھا یہاں ہنگامہ ان

۲ے قدیم متن : شعلۂ جاں سوزِ پنہاں ۔ بانگ : بجلیوں کے آشیانے

۳ے بیاض ص ۱ : دنیا سے کہن ۔ سہوِ کتابت ۔ بقیہ سب مع بیاض ص ۱۱۱ : دنیائے کہن

۴؎ قدیم متن کے شعر نمبر ۴ کو خارج کر کے اس کی جگہ بانگ میں یہ شعر (ہمارے متن کا نمبر ۵) لکھ دیا گیا۔

۵؎ اس شعر کا قدیم متن یہ تھا

زندگی دنیا کو جن کی شورشِ قُم سے ملی　　　مخلصی انساں کو زنجیرِ توہم سے ملی

۶؎ قدیم متن: جس کے آوازے سے ۔ بانگ: غلغلوں سے جس کے

۷؎ قدیم متن: وہ جرس کیا ۔ بانگ: کیا وہ تکبیر ؟ بیاض: رہنمائی ۔ سہوِ کتابت

۹؎ اس شعر کا قدیم متن یہ ہے

مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا　　　یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

کتابیات

اس کتاب کے حواشی کے لیے بہت سی کتابیں دیکھیں۔ بعض میں کچھ نہ ملا۔ ذیل میں صرف ان کتابوں اور مضامین کی فہرست دی جارہی ہے جن سے فائدہ اٹھایا ہے

۱-۱۔ کلام اقبال کے مجموعے

ا۔ قلمی

کلام اقبال مرتبۂ محمد انور خاں طالب علم جامعہ ملّیہ اسلامیہ علی گڑھ۔ بیشتر حصہ ۳۰ راکتوبر ۱۹۲۴ء تک لکھا گیا۔ مملوکہ جناب عبدالصمد خاں

بیاض اقبال۔ عماد الملک سید حسن بلگرامی کے ذخیرے سے خریدی گئی۔ مملوکہ جناب عبدالصمد خاں۔ اس کا بھی بیشتر حصہ بانگِ درا کی اشاعت سے پہلے لکھا گیا۔

ب۔ مطبوعہ مجموعے تاریخی ترتیب سے

مولوی محمد عبدالرزاق (مرتّب) : کلیاتِ اقبال۔ عماد پریس حیدر آباد ۱۳۴۳ھ۔ روزگار فقیر جلد دوم۔ طبع دوم ص ۲۱۹ کے مطابق جون ۱۹۲۴ء۔

احمد دین (مصنّف)، مشفق خواجہ (مرتّب) : اقبال۔ انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۹ء

اقبال : بانگِ درا۔ طبع دوم لاہور ستمبر ۱۹۲۶ء

طبعِ سوم لاہور مارچ ۱۹۳۰ء

اقبال : کلیاتِ اقبال اردو۔ تاج پبلشنگ ہاؤس پوسٹ بکس نمبر ۱۶۵۱۔ دہلی

تصدّق حسین : نظمِ اقبال۔ سفرِ حیدر آباد دکن اور سر اقبال کے تاثرات ۱۹۱۰ء میں۔ حیدر آباد ۱۹۳۸ء

تصدّق حسین تاج : نظم سپاسِ جنابِ امیر اور دوسری نظمیں از مرحوم علامہ اقبال۔ حیدر آباد۔ ۱۹۳۸ء

تصدق حسین تاج : تبرّکاتِ اقبال - حیدرآباد - سنہ ندارد - مقدمہ جولائی ۱۹۳۹ء
(نوٹ - یہ اس سے پہلی کتاب 'نظم سپاسِ جنابِ امیرؑ' ہی بہ تبدیلِ نام ہے)
سیّد عبدالواحد معینی : باقیاتِ اقبال - لاہور، بارِ اوّل ۱۹۵۲ء
سیّد عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی : باقیاتِ اقبال - لاہور - بارِ سوم ۱۹۷۸ء
محمد انور حارث : رختِ سفر - نقشِ ثانی کراچی نومبر ۱۹۷۷ء
محمد بشیر الحق دیسنوی عظیم آبادی : تبرّکاتِ اقبال - کوہ نور پریس دہلی - اپریل ۱۹۵۹ء
غلام رسول مہرؔ، صادق علی دلاوری : سرودِ رفتہ لاہور - بارِ اوّل ۱۹۵۹ء
عبدالغفار شکیل : نوادرِ اقبال - سر سیّد بک ڈپو، علی گڑھ ۱۹۶۲ء
فقیر وحید الدین : روزگارِ فقیر جلد دوم - کراچی - بارِ دوم اگست ۱۹۶۵ء

ج - متفرق نظمیں

ابرِ گہربار یا فریادِ اُمت - ہفتہ وار وطن لاہور بابت ۶ مارچ، ۲۰ مارچ، ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء
غزل : لڑکپن کے ہیں دن صورت کسی کی بھولی بھولی ہے - مخزن اپریل ۱۹۰۳ء
غزل : ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی - " " "
قصیدۂ تہنیت دربارِ بہاول پور ہفتہ وار وطن لاہور بابت ۴ دسمبر ۱۹۰۳ء
نظم ترانۂ ہندی بغیر عنوان کے - رسالہ اتحاد، مدیر شرر - ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء
ہمارا دیس - مخزن جلد ۸ نمبر ا یعنی اکتوبر ۱۹۰۴ء
موجِ دریا دکن ریویو حیدرآباد - نومبر دسمبر ۱۹۰۴ء
نظم 'نیا شوالہ' جعلی انتساب از محمد عبداللہ عطا، ساکنِ چرکھاری - رسالہ شاہدِ سخن، حیدرآباد - جلد ا، نمبر ۱۲ - بابت دسمبر ۱۹۱۲ء

۲ - حوالے کی کتابیں

احمد دین (مصنف)، مشفق خواجہ (مرتب) : اقبال - انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، کراچی - ۱۹۷۹ء
آزاد، جگن ناتھ : محمد اقبال، ایک ادبی سوانحِ حیات - دہلی مارچ ۱۹۸۳ء
" : مرقعِ اقبال - دلّی ۱۹۷۷ء

اعجاز احمد: مظلوم اقبال ۔ ناشر مصنف ۔ کراچی ۔ ۱۹۸۵ء

اعظمی عبداللطیف: اقبال، دانائے راز ۔ مکتبۂ جامعہ دہلی، طبعِ اوّل ۔ جولائی ۱۹۷۸ء

امیر مینائی: صنم خانۂ عشق ۔ لاہور ۔ ۱۳۴۰ھ

جاوید اقبال: زندہ رود، حصۂ اول، حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور ۔ طبعِ اوّل ۔ لاہور ۔ ۱۹۷۹ء

جوش ملسیانی: اقبال کی خامیاں ۔ طبعِ دوم ۔ دلّی ۔ ۱۹۷۷ء

چشتی، پروفیسر یوسف سلیم: شرحِ بانگِ درا ۔ سلطانیہ بک ڈپو دہلی، بارِ اوّل ۔ سنہ ندارد

حسن الدین احمد: سازِ مغرب حصّہ سوم ۔ ولا اکیڈمی حیدرآباد ۔ جنوری ۱۹۷۸ء

حسن الدین احمد: سازِ مغرب حصّہ ہفتم " " جون ۱۹۷۹ء

خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام: سرگذشتِ اقبال ۔ لاہور ۱۹۷۷ء

درّانی، ڈاکٹر سعید اختر: اقبال یورپ میں ۔ اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور ۔ ۱۹۸۵ء

دسنوی، عبدالقوی: اقبال انیسویں صدی میں ۔ نسیم بک ڈپو لکھنو ۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء

دسنوی، عبدالقوی: اقبال اور دلّی ۔ دہلی جون ۱۹۷۸ء

دسنوی، عبدالقوی: اقبالیات کی تلاش ۔ مکتبۂ جامعہ دہلی ۔ دسمبر ۱۹۸۴ء

ڈار، بشیر احمد: انوارِ اقبال ۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۔ طبعِ دوم ۱۹۷۷ء

زیدی، ڈاکٹر سید محمد علی: مطالعۂ داغ ۔ لکھنؤ ۱۹۷۴ء

سالک، عبدالمجید: ذکرِ اقبال

سرور، درگا سہائے (مصنف) ڈاکٹر حکم چند نیّر (مرتّب): نوائے سرور ۔ بنارس ۱۹۶۷ء

سری رام، لالہ: خمخانۂ جاوید جلد اوّل، دوم، سوم ۔ لاہور طبعِ اوّل

سلیم اختر، ڈاکٹر (مرتّب): اقبالیات کے نقوش ۔ اقبال اکیڈمی لاہور ۔ طبعِ اوّل ۱۹۷۷ء

شاہین رحیم بخش (مرتّب) اوراقِ گم گشتہ (علامہ اقبال کے بارے میں غیر مدوّن تحریریں)
اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۔ بارِ اوّل ۔ اپریل ۱۹۷۵ء

شکیل احمد، سید: اقبال، نئی تحقیق اقبال اکیڈمی حیدرآباد ۔ مارچ ۱۹۸۵ء

شکیل، ڈاکٹر عبدالغفار (مرتب): اقبال کے نثری افکار ۔ انجمن ترقی اُردو ہند مارچ ۱۹۷۷ء

صدیقی، عتیق: اقبال، جادوگر ہندی نژاد ۔ مکتبۂ جامعہ دلّی ۔ اگست ۱۹۸۰ء ۔ بارِ اوّل

عطاء اللہ، شیخ (مرتب) : اقبال نامہ حصہ اوّل و حصہ دوم ۔ لاہور

عطیہ بیگم (مصنف)، ضیا الدین برنی (مترجم) : اقبال ۔ اقبال اکیڈمی کراچی ۔ طبعِ اوّل ستمبر ۱۹۵۶ء

فقیر سید وحید الدین : روزگار فقیر (شاعرِ مشرق سے چند ملاقاتوں کی یادداشت) سید برادرز ۵۰۰ دی مال لاہور ۔ پہلا ایڈیشن ۔ سنہ ندارد ۔ مقدمہ ۷ فروری ۱۹۵۰ء

فقیر سید وحید الدین : روزگارِ فقیر جلد دوم ۔ بارِ دوم ۔ اگست ۱۹۶۵ء ۔ کراچی

قریشی، ڈاکٹر اکبر حسین : تلمیحات و اشاراتِ اقبال ۔ انجمن ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ ۔ ۱۹۷۰ء

قریشی، محمد عبداللہ : حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں ۔ لاہور ۔ طبعِ اوّل ۔ مئی ۱۹۸۲ء

قریشی، محمد عبداللہ : معاصرینِ اقبال کی نظر میں ۔ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور ۔ نومبر ۷۷ء

نسیم فاطمہ : آئینۂ ایامِ اقبال ۔ کراچی ۱۹۷۷ء

نقوی، ڈاکٹر منظر عباس (مترجم) : خطوطِ اقبال بنام عطیہ فیضی ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۳ء

نیازی، سید نذیر : دانائے راز، سوانحِ حیاتِ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال ۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۷۹ء

ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین : تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، طبعِ اوّل نومبر ۱۹۸۲ء

ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین : خطوطِ اقبال ۔ اقبال صدی پبلیکیشنز ۔ نئی دہلی ۱۹۷۷ء

۳ ۔ مضامین

ا ۔ اردو

محمد عمر (نور الٰہی)	ہندوستان ہمارا کی شانِ نزول	آج کل دہلی یکم جنوری ۱۹۴۶ء
ظہیر انور دہلوی	رسالہ فتنہ و عطرِ فتنہ	آج کل جولائی ۱۹۸۶ء
ڈاکٹر اکبر حسین قریشی	اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ	اردو کراچی جنوری ۱۹۶۶ء
قاضی افضل حق قریشی	باقیاتِ اقبال	اردو کراچی شمارہ ۳ ۔ ۱۹۶۹ء

جگن ناتھ آزاد	داغ کے اثرات اقبال پر	اقبالیات لاہور جولائی ستمبر ۸۶ء
لطف اللہ بدوی	علامہ اقبال کی ایک فراموش شدہ نظم (شمعِ ہستی)	اقبال ریویو کراچی جنوری ۱۹۶۵ء
عابدہ سلطان سوز	اقبال اور مخزن	برگِ گل - وفاقی گورنمنٹ اردو کالج - کراچی اقبال نمبر ۱۹۷۷ء
شرر	اُردوے معلیٰ پر تبصرہ	دلگداز نمبر ۸ جلد ۸ - اگست ۱۹۰۴ء
توقیر احمد خاں	اقبال اور سنسکرت	فکر وفن - شملہ مئی جولائی ۱۹۸۶ء
ڈاکٹر وحید قریشی	اقبال اور نظریۂ وطنیت	مجلۂ تحقیقِ فنون - جلد پنجم شمارہ اوّل ودوم لاہور - جنوری - جولائی ۱۹۷۰ء
داکٹر سید حامد حسین	علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں	مجلۂ سیفیہ بھوپال - یادگارِ اقبال نمبر جلد ہفتم ۸۰ - ۷۹ء
پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر	لاہور تاریخ، تاسیس اور وجہِ تسمیہ	نقوش لاہور - لاہور نمبر - شمارہ ۹۲ - فروری ۱۹۶۲ء
منشی محمد دین فوق	مآثرِ لاہور - حضرت علی ہجویری	״ ״ ״
حافظ عباداللہ فاروقی	دردازے	״ ״ ״
عبدالسلام خورشید	اردو صحافت - ۱۸۵۱ء سے ۱۹۶۲ء تک	״ ״ ״
شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	ادیب اور مصنف	״ ״ ״
کسریٰ منہاس	مؤرخینِ لاہور - منشی محمد دین فوق	״ ״ ״
سید عابد علی عابد	چند بڑے ادیب	״ ״ ״
حکیم احمد شجاع	اقبال کا قیامِ لاہور	نقوش شمارہ ۱۰۸، ستمبر ۱۹۶۷ء نقوش اقبال نمبر ۲ - شمارہ ۱۲۳ - دسمبر ۱۹۷۷ء
پروفیسر رفیع الدین ہاشمی	حیات نامۂ اقبال	نقوش اقبال نمبر ۱ شمارہ ۱۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء

جگن ناتھ آزاد	اقبال کی اپنے کلام پر نظرِ ثانی	نقوش اقبال نمبر ا شمارہ ۱۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء
کسری منہاس	اقبال اور تاریخ گوئی	" " "
پروفیسر سلیم اختر	اقبال کا نفسیاتی مطالعہ	" " "
مسعود حسن شہاب	علامہ اقبال اور بہاولپور	" " "
کسری منہاس	اقبال اور قیام یورپ	" ۲ ۱۲۳ دسمبر "
محمد عبداللہ قریشی	اقبال کے ادبی معرکے	" - ادبی معرکے نمبر ۲ - " ۱۲۷ ستمبر ۱۹۷۸ء
ڈاکٹر اکبر حیدری	اقبال کی ایک نظم سلیمیٰ	ہماری زبان۔ دہلی یکم مئی ۱۹۸۰ء
ڈاکٹر اکبر حیدری	اقبال کا سفرِ لکھنؤ حقیقت یا افسانہ	" ۱۵ و ۲۲ مئی ۱۹۸۰ء

۴-انگریزی

A BOOKS ·

1. ATIYA BEGUM, Iqbal, (Bombay, Feb 1947)
2. PANDE, B.N. *Islam and Indian Culture* (Khuda Bakhsh Memorial Lectures Dec 1985)
3. Sinha, Dr. Sachindanand, Iqbal (Ram Narayan Lal Book Seller Allahabad, 1947)
4. Waheed, K.A. A Bibliography of Iqbal, (Iqbal Academy, Karachi, Ist edition 1965)

Article :

Pt. Ram Lal Tara, "Swami Rama Nand Tirath" is ***Punjabi's Eminent Hindus*** (New Book Society Publishers, Lahore, Ist ed. Dec. 1943)

اشاریہ

یہ اشاریہ محض اشخاص کے ناموں تک محدود ہے۔ اس کے دائرے سے اقبال کا کلام اور آخری کتابیات خارج ہے۔ صرف میری لکھی ہوئی نثر یعنی تمہیدی تحریریں، حواشی اور اختلافاتِ نسخ پر حاوی ہے۔ جہاں اشخاص کے نام کلامِ اقبال کے مجموعوں کے مرتب کی حیثیت سے آئے ہیں انھیں بالعموم شامل نہیں کیا گیا۔ اقبال کے نام کو بھی اشاریے سے خارج رکھا گیا ہے۔

THE NIGHTINGALE AND THE GLOWWORM

A NIGHTINGALE, that all day long
Had cheered the village with his song,
Nor yet at eve his note suspended,
Nor yet when eventide was ended,
Began to feel, as well he might,
The keen demands of appetite,
When, looking eagerly around,
He spied, far off upon the ground,
A something shining in the dark,
And knew the glowworm by his spark,
So, stepping down from hawthorn top
He thought to put him in his crop.
The worm, aware of his intent,
Harangued him thus, right eloquent:
"Did you admire my lamp," "quoth he,
"'As much as I your ministrelsy,
You would abhor to do me wrong,
As much as I to spoil your song;
For, twas the selfsame Power Divine
Taught you to sing and me to shine;
That you to sing and me shine,
Might beautify and cheer the night."
The songster heard his short oration,
And, warbling out his approbation
Released him, as my story tells,
And found a supper somewhere else.
Quarrelsome neighbours hence may learn
Their real interest to discern;
That brother should not war with brother,
And worry and devour each other;
But sing and shine by sweet consent,
Till life's fleeting night is spent.

— William Cowper

اس نظم سے اقبال کی نظم 'ایک پرندہ اور جگنو' ماخوذ ہے۔ انگریزی
نظم سازِ مغرب حصہ سوم ص ۱۱۔۱۰ سے لی گئی ہے۔

GOOD-BYE

Good-bye, proud world! I'm going home;
Thou art not my friend, and I'm not thine.
Long through the weary crowds I roam;
A river-ark on the ocean brine,
Long I've been tossed like the driven foam;
But now, proud world! I'm going home.

Good-bye to Flattery's fawning face;
To Grandeur with his wise grimace;
To upstart Wealth's averted eye;
To supple office, low and high;
To crowded halls, to court and street;
To frozen hearts and hasting feet;
To those who go, and those who come;
Good-bye, proud world! I'm going home.

I am going to my own hearth-stone,
Bosomed in yon green hills alone,
A secret nook in a pleasant land,
Whose graves the frolic fairies planned;
Where arches green, the livelong day,
Echo the blackbirds' roundclay,
And vulgar feet have never trod,
A spot that is sacred to thought and God.
O, when I am safe in my sylvan home,
I tread on the pride of Greece and Rome;
And when I am stretched beneath the pines,
Where the evening star so holy shines,
I laugh at the lore and the pride of man,
At sophist schools, and the learned clan;
For what are they all, in their high conceit,
When man in the bush with God may meet?

-- Emers

اس نظم سے اقبال کی نظم "رخصت اے بزمِ جہاں" ماخوذ ہے۔
انگریزی متن رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۶ - ۱۷ سے
لیا گیا ہے۔

LOVE AND DEATH

What time the mighty moon was gathering light
Love paced the thymy plots of paradise.
And all about him roll'd his lustrous eyes,
When turning round a cassia, full in view,
Death walking all alone beneath a yew,
And talking to himself, first met his sight,
You must begone', said Death, 'these walks are mine'

Love wept and spread his sheeny vans for flight,
Yet ere he parted said, 'This hour is thine,
Thou art the shadow of life, and as the tree,
Stands in the sun and shadows all breath,
So in the light of great eternity
Life eminent creates the shade of death
The shadow passeth when the tree shall fall,
But I shall reign for ever over all'.

-- Tennyson

اس نظم پر اقبال کی نظم 'عشق اور موت' مبنی ہے۔ انگریزی متن
سازِ مغرب حصّہ ہشتم ص ۱۲ سے لیا گیا ہے۔

DAY BREAK

A wind came up out of the sea,
And said, "O mists, make room for me",

It hailed the ships, and cried, "Sail on,
Ye mariners, the night is gone"

And hurried landward far away,
Crying, "Awake; it is the day."

It said unto the forest, "Shout;
Hang all your leafy banners out."

It touched the wood-bird's folded wing,
And said, "O bird, awake and sing."

And O'er the farms, "O chanticleer,
Your clarion blow: the day is near,"

It whispered to the fields of corn,
"Bow down, and hail the coming morn."

It shouted through the belfry-tower,
Awake, o bell: proclaim the hour."

It crossed the churchyard with a sigh,
And said, "Not yet: in quiet lie."

-- H.W. Longfello

اس نظم سے اقبال کی نظم 'پیامِ صبح' ماخوذ ہے۔ انگریزی نظم سلاسلِ مغرب
حصہ ہشتم اپریل ۱۹۸۰ء ص ۱۲ سے لی گئی ہے۔

ON A GOLD-FINCH STARVED TO DEATH IN HIS CAGE

Time was when I was free as air,
The thistle's downy seed my fare,
My drink the morning dew;

I perched at will on every spray,
My form genteel, my plumage gay,
My strains for ever new.

But guarding plumage, sprightly strain,
And form genteel, were all in vain,
And of a transient date;

For, caught and cag'd and starved to death
In dying sighs my little breath
Soon pass'd the wiry gate.

Thanks, gentle swain, for all my woes,
And thanks for this effectual close,
And cure every ill !

More cruelty could none express,
And, if you had shown me less,
Had been your pris'ner still.

-- William Cowper

اقبال کی نظم 'پرندے کی فریاد' اس انگریزی نظم سے ماخوذ ہے۔
انگریزی متن مجھے ڈاکٹر سیّد حامد حسین، بھوپال نے عنایت کیا۔

A WISH

Mine be cot beside the hill;
A bee-hive's hum shall soothe my ear;
A willowy brook that turns a mill,
With many a fall shall linger near.

The swallow, oft, beneath my thatch
Shall twitter from her clay-built nest;
Off shall the pilgrim lift the latch,
And share my meal, a welcome guest.

Around my livied porch shall spring
Each fragrant flower that drinks the dew;
And Lucy, at her wheel, shall sing
In russet-gown and apron blue

The village-church among the trees,
Where first our marriage-vows were given,
With merry peals shall swell the breeze,
And point with taper spire to heaven.

-- Samuel Rogers

اقبال کی نظم 'ایک آرزو' اسی نظم پر مبنی ہے۔ انگریزی نظم 'سازِ مغرب'
انگریزی حصّہ ص ۹۵ سے لی گئی ہے۔

THE MOTHER'S DREAM

I'd a dream to-night
As I fell asleep,
Oh ! the touching sight
Makes me still to weep;
Of my little lad,
Gone to leave me sad,
Aye, the child I had,
But was not to keep.
As in heaven high,
I my child did seek,
There, in train, came by
Children fair and meek.
Each in lily white,
With a lamp alight,
Each was clear to sight,
But they did not speak.
Then, a little sad,
Came my child in turn,
But the lamp he had,
Oh! it did not burn,
He, to clear my doubt,
Said, half-burned about,
"Your tears put it out;
Mother, never mourn."

-- William Barnes

اس نظم سے اقبال کی نظم 'ماں کا خواب' ماخوذ ہے۔ انگریزی نظم
سازِ مغرب حصّہ سوم، انگریزی جزو ص ۹۰ سے لی گئی ہے۔

A CHILD'S HYMN

God make my life a little light,
within the world to glow,
A little flame that burneth bright,
wherever I may go.

God make my life a little flower
that giveth joy to all,
Content to bloom in native bower,
although the place be small.

God make my life a little song,
that comforteth the sad,
That helpeth others to be strong,
And maketh the singer glad.

God make my life a little staff,
whereon the weak may rest,
That so what health and strength I have,
may serve my neighbours best.

God make my life a little hymn
of tenderness and praise,
Of faith that never waneth dim,
in all his wondrous ways.

-- MATILDA BETHAM

اس نظم سے اردو نظم 'بچے کی دعا' ماخوذ ہے۔ انگریزی نظم حسن الدین
احمد کے سازِ مغرب حصہ ہشتم (حیدرآباد - اپریل ۱۹۸۰ء) ص ۱۱
سے لی گئی ہے۔

I've no will of my own, but must do as they please,
And give them my milk to make butter and cheese:
Sometimes I endeavour to knock down the pail,
Or give Suke a box on the ear with my tail!"

"But, Ma'am, said the ass, not presuming to teach-
"Oh dear! I beg pardon - pray finish your speech;"
"Excuse my mistake," said the complaisant swain;
"Go on, and I'll not interrupt you again."

"Why, Sir, I was just then about to observe,
These hard-hearted tyrants no longer I'll serve;
But leave them forever to do as they please,
And look somewhere else for their butter and cheese."

Ass waited a moment, as gentlemen can,
And then, "Not presuming to teach," he began,
"Permit me to say, since my thoughts you invite,
I always saw things in a different light,

"That you afford man an important supply,
No ass in his senses would ever deny;
But then in return, 'tis but fair to allow
They are of some service to you, Mistress Cow.

"Tis their pleasant meadow in which you repose,
And they find you a shelter from winterly snows;
For comforts like these we're indebted to man,
And for him, in return, should do all that we can."

The cow, upon this, cast her eyes on the grass,
Not pleased to be schooled in this way by an ass;
"Yet," said she to herself, "though he's not very bright,
I really believe that the fellow is right."

-- Jane Taylor

اس نظم سے اردو نظم 'ایک گائے اور بکری' ماخوذ ہے۔ انگریزی نظم
رسالہ اردو کراچی، جنوری ۱۹۹۶ء ص ۲۶۔۲۳ سے لی گئی ہے۔

5

THE COW AND THE ASS

Beside a green meadow a stream used to flow,
So clear, you might see the white pebbles below.
To this cooling brook the warm cattle would stray,
To stand in the shade, on a hot summer's day.

A cow, quite oppressed by the heat of the sun,
Came here to refresh, as she often had done;
And standing quite still, stooping over the stream,
Was musing perhaps; or perhaps she might dream.

But soon a brown ass of respectable look
Came trotting up also, to taste of the brook,
And to nibble a few of the daisies and grass:
How d'ye do?'' said the cow. - ''How d'ye do?'' said the ass.

''Take a seat,'' said the cow, gently waving her hand.
''By no means, dear madam,'' said he,''while you stand!''
Then stooping to drink with a complaisant bow,
Ma'am your health!'' said the ass. ''Thank you, Sir!'' said the cow

When a few of these compliments more had been passed,
They laid themselves down on the herbage at last;
And waited politely - as gentlemen must.
The ass held his tongue, that the cow might speak first.

Then with a deep sigh, she directly began;
Don't you think, Mr Ass, we are injured by man?
'Tis a subject which lies with a weight on my mind;
We really are greatly oppressed by mankind.

''Pray what is the reason - I see not at all -
That I always must go when Suke chooses to call?
Whatever I'm doing - 'tis certainly hard.
I'm forced to leave off to be milked in the yard.

THE MOUNTAIN AND THE SQUIRREL

The mountain and the squirrel
Had a quarrel,
And the former called the latter 'little prig';
Lan replied,
You are doubtless very big;
But all sorts of things and weather
Must be taken in together
To make up a year,
And a sphere,
And I think it no disgrace
To occupy my place
If I'm not so large as you,
You are not so small as I,
And not half so spry;
I'll not deny you make
A very pretty squirrel track
Talents differ; all is well and wisely put;
If I cannot carry forests on my back,
Neither can you crack a nut."

-- Emerson

اس نظم سے اردو نظم 'ایک پہاڑ اور گلہری' ماخوذ ہے۔ انگریزی نظم
حسن الدین احمد کی سازِ مغرب حصّہ سوم، انگریزی جز و ص ۲۱، نیز رسالہ
اردو جنوری ۱۹۰۶ء ص ۱۴ سے لی گئی ہے۔

Thinking only of her brilliant eyes, her green and purple hue.
And dreaming of her crested head--poor foolish thing at last
Up jumped the cunning Spider and fiercely held her fast,
He dragged her up his winding stair, into his dismal den,
Within his little parlour -- and she ne'er came down again.
And now, do you take warning, all who this story hear,
To idle, silly, flattering words I pray you ne'er give ear;
To all deceitful counsellors close ear, and heart, and eye,
And take a lesson from this tale of the Spider and the Fly.

-- Mary Howitt.

اس انگریزی نظم سے اقبال کی نظم "ایک مکڑا اور مکھی" ماخوذ ہے۔ انگریزی متن ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کے مضمون "اقبال کی بعض نظموں کے ماخذ" مشمولہ رسالہ اردو کراچی بابت جنوری ۱۹۶۶ء ص ۲۱-۱۹ سے لیا گیا ہے۔

THE SPIDER AND THE FLY

"Will you walk into my parlour?" said a Spider to a Fly;
"Tis the prettiest little parlour that ever you did spy.
The way into my parlour is up a winding stair,
And I have many pretty things to show you when you're there".
"Oh no, no!" said the little Fly: "to ask me is in vain,
For who goes up your winding stair can ne'er come down again."
"I'm sure you must be weary with soaring up so high;
Will you rest upon my little bed?" said the Spider to the Fly.
"There are pretty curtains drawn around, the sheets are fine and thin,
And if you like to rest a while, I'll snugly tuck you in."
"Oh no, no! said the little Fly, for I've often heard it said,
They never, never make again, who sleep upon your bed."
Said the cunning Spider to the Fly: "Dear friend, what shall I do
To prove the warm affection I've always felt for you!
I have, within my pantry, good store of all that's nice;
I'm sure you're very welcome--will you please take a slice?"
"Oh no, no!" said the little Fly. "Kind Sir, that cannot be,
I've heard what's in your pantry, and I do not wish to see."
"Sweet creature." said the Spider, "You're wily and you're wise!
How handsome are your gauzy wings, how brilliant are your eyes!
I have a little looking-glass upon my parlour shelf;
If you'd step in one moment, dear, you shall behold yourself;."
"I thank you, gentle Sir," she cried, "for what you're pleased to say,
And bidding you good morning now, I'll call another day."
The Spider turned him round about and went into his den.
He knew the vain and silly Fly would soon come back again;
So he wove a tiny web in a corner, on the sly,
And he set his table ready to dine upon the Fly.
Then he went out to his door again, and merrily did sing;
"Come hither, hither, pretty Fly, with the pearl and silver wing.
Your robes are green and purple - there's a crest upon your head,
Your eyes are like the diamond bright but mine are dull as lead."
Alas, alas! how very soon this silly little Fly,
Hearing his wily flattering words, came slowly flittering by;
With buzzing wings she hung aloft, then near and nearer drew,

APPENDIX

Text of English poems from which Iqbal has derived some of his Urdu poems.

1. The Spider and the Fly
2. The Mountain and the Squirrel
3. The Cow and the Ass'
4. A Child's Hymn
5. The Mother's Dream
6. A Wish
7. On a Gold-Finch Starved to Death
8. Day Break
9. Love and Death
10. Good Bye
11. The Nightingale and the Glow-worm

● ● ● ● ●